سبط حسن

پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل

پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل

سبط حسن

دانیال

انتساب

عزیز دوست اور ساتھی سید جعفر احمد کے نام!
جنھوں نے سبطِ حسن کی کئی نایاب اور نادر تحریریں کتابی صورت میں محفوظ کر کے مجھے بھی ان کے اداریے تلاش اور مرتب کرنے کی راہ سجھائی۔

احمد سلیم

جملہ حقوق محفوظ

ناشر	:	حوری نورانی مکتبۂ دانیال، سنو وائٹ موبائل سینٹر، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی
طابع	:	ذکی سنز پرنٹرز۔ کراچی
اشاعت دوم	:	۲۰۰۹ء
سرورق	:	خدا بخش ابڑو
قیمت	:	۳۵۰ روپے

ISBN: 969-419-003-7

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE

مکتبۂ دانیال

Snowhite Mobile Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi -74400
Phone: 5681457-5682036-5681239
E-mail: danyalbooks@hotmail.com

فہرست

دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ — احمد سلیم
یہ کتاب — سعیدہ گزدر
لیل ونہار کا پہلا اداریہ (اپنے بارے میں) — فیض احمد فیض

پہلا حصہ.................جمہوری دور
(۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء.....اکتوبر ۱۹۵۸ء)

یہ شب گزیدہ سحر ———— ۲۱
آزادی کی حفاظت
قائدِاعظم کے بعد قوم پر کیا گزری
جشنِ جمہوریہ
یومِ انبساط واحتساب
قائدِاعظم کے جانشیں

سیاسی ثقافت ———— ۳۶
نئی سیاسی تنظیم
نازک پودا
مرکزی وزارت کا قضیہ
صدرِ مملکت کی ذات
قومی اتحاد کے دشمن
وزارتی بحران؟

ایک وزارتی بحران
بڑھتے سائے
اقرار واعتراف......انعام واکرام
سحر ہونے تک
عہد شکنی
ڈاکٹر خان صاحب کی شہادت
پھر وہی وزارتی بحران
صدر راج...... چوتھی بار
اسمبلیوں کا اجلاس
صبر وضبط کا امتحان

سیاسی اور آئینی مباحث ______ ۸۲
بحران در بحران
مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی بحث
وزارت سازی
سخن ہائے گفتنی
مخلوط اور جداگانہ انتخاب
آئین کا احترام

ون یونٹ ______ ۹۹
ایک یونٹ اور جذباتیت
ایک یونٹ اور عام انتخابات
ایک یونٹ کا قضیہ

امنِ عامہ کے مسائل ۱۰۸
خونِ ناحق
لہو پکارے گا آستیں کا

انتخابات کی تیاریاں ۱۱۴
راستے کے روڑے
بنیادی فریضہ
ریشہ دوانیاں
حیلے اور بہانے
حد بندی کے بعد
گورنر راج کا مشورہ
انتخابی مہم کا آغاز

معیشت ۱۳۵
مرکزی بجٹ
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی
گرانی اور اس کا انسداد
محتاجی اور دست نگری
فضول خرچیاں
آٹھ کروڑ پاکستانیوں کا بجٹ
گرانی
مسیحائی
الٹی منطق
خوش حالی کی راہ

پاک...... بھارت تعلقات ـــــــــ ۱۶۴
نہری پانی کا تنازعہ
دار و رسن کی آزمائش
پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات
تدبّر کا امتحان
وہ الٹی میٹم یاد کیجیے

خارجہ امور...... امریکہ، پاکستان اور عالمِ اسلام ـــــــــ ۱۷۸
معاہدۂ بغداد
یہ چشم پوشی کیوں......؟
دوستی کی قیمت
تلخ تجربہ
دُنیائے اسلام کی بیداری
اندھیر
فیڈریشن کا شوشہ

معاشرتی بہبود ـــــــــ ۱۹۸
فلاح و بہبود
تذبذب اور بے یقینی کی فضا

تعلیم ـــــــــ ۲۰۳
برہمنی ذہنیت
یہ تعلیم

بورڈ اساتذہ سے ناانصافی

تہذیب و ثقافت ______ ۲۱۱
ہماری تہذیبی سرگرمیاں
تحقیقات کی جائے

متفرقات ______ ۲۱۷
۱۸۵۷ء کی اہمیت
گمنام شہیدوں کی یادگار
قومی تقریبات
جرأتِ رندانہ کی ضرورت
اسلامی مجلسِ مذاکرہ
عیدِ قرباں کا مفہوم
ذبحِ عظیم
محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
پہلی سالگرہ

دوسرا حصہ......ایوبی مارشل لا
۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء......۱۸/ اپریل ۱۹۵۹ء

آئین سازی ______ ۲۴۲
آئین سازی کا مسئلہ
بلدیاتی اداروں کا انتخاب
آئین سازی کا صحیح راستہ

معاشی اور سماجی اصلاحات ——— ۲۵۱

زرعی اصلاحات

خاندانی منصوبہ بندی

عبوری دور کا بجٹ

عالمی امور ——— ۲۵۹

صوبائی خودمختاری یا حقِ علیحدگی

یہ وہ سحر تو نہیں ——— ۲۶۲

یومِ پاکستان

ادب و فن ——— ۲۶۵

ادیبوں کے فرائض

ہم اور ہماری قومی تہذیب

اردو کانفرنس

لیل و نہار ——— ۲۷۳

لخت لخت

عرضِ مدعا

تیسرا حصہ...... یحییٰ خان کا مارشل لا

(۱۹۷۰......۷۱ء)

مشرقی پاکستان ________ ۲۷۸

امداد اور آبادکاری کا منصوبہ

جاں گداز المیے کے بعد

انتخاباتِ اور اس کے بعد ________ ۲۸۴

یومِ شوکتِ عوام

دشمن کو حقیر نہ سمجھو

صراطِ مستقیم

مذہب اور تشدد پسندی ________ ۲۹۵

عبرت ناک سانحہ

مہنگائی کی معیشت ________ ۲۹۹

دولت آسمان سے نہیں برستی

خارجہ امور ________ ۳۰۲

دولتِ مشترکہ اور ہم

ایشیا میں جنگ کی آگ

اسلامی کانفرنس

چوتھا حصہ...... نیا پاکستان

(ماہنامہ "پاکستانی ادب" کے اداریے)

نومبر ۱۹۷۴ء......اکتوبر ۱۹۷۷ء

حرفِ آغاز ______ ۳۱۴

جرأتِ انکار

ادھورا فیصلہ

بیمار ذہنیت

پروفیسر شاکر علی

شکریہ

نوائے وقت کی نظرِ عنایت

غلطی ہائے مضامین

بخیلی یا رزّاقی

سال کا لمحہ

نئی نسل نمبر (اقتباس)

ابتدائیہ (اقتباس)

"پاکستانی ادب" کانفرنس "اقتباس"

جمہوریت کا نذرانہ (اقتباس)

کرشن چندر کی وفات

اپریل سے اکتوبر تک

پیش لفظ

(۱)

چند برس پیشتر، میں نے جب فیض صاحب کے اداریوں اور دوسری نادر تحریروں کا انتخاب ــــ موج زر ــــ کے نام سے مرتب کیا تو ہفت روزہ ''لیل ونہار'' سے فیض صاحب کے اداریئے الگ کرتے وقت سبط حسن صاحب کے بعض اداریئے بھی سامنے آئے۔ یہ اداریئے ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے دور ثانی (۱۹۷۰ـ۷۱ء) میں شائع ہوئے تھے اور ان اداریوں کو الگ کرنے میں جناب حسن عابدی نے رہنمائی کی تھی۔ ''موج زر'' کی پذیرائی کے بعد خیال آیا کہ سبط حسن صاحب کے اداریئے خصوصاً ''لیل ونہار'' کے دور اوّل کے شماروں سے جب وہ ۱۹۵۷ـ۵۹ء کے دوران اس کے ایڈیٹر رہے تھے، الگ کر کے مرتب کئے جائیں، لیکن دقت وہی تھی کہ اس دور میں بھی سبط حسن کے علاوہ فیض صاحب اور کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اداریئے قلم بند کئے تھے۔ اب ان کی نشاندہی کیسے ہو۔ جناب حسن عابدی کراچی میں تھے اور ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ لاہور میں جناب احمد ندیم قاسمی رہنمائی کر سکتے تھے لیکن وہ بھی چونکہ ''لیل ونہار'' سے براہ راست وابستہ اور منسلک نہیں رہے تھے اور ان کا زیادہ تعلق روزنامہ ''امروز'' سے رہتا تھا اس لئے ان کی بجائے جناب ظہیر بابر سے رجوع کیا۔ ظہیر بابر صاحب کا

خیال تھا کہ چونکہ اداریے، ادارے کی پالیسی کے تحت لکھے جاتے تھے اور انہیں مستقل طور پر کوئی ایک شخص نہیں لکھتا تھا اس لئے اس شکل میں ان کو مرتب کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، ان کی بات درست تھی لیکن میری بھی ایک دلیل تھی کہ اس سے ہم ایک خاص شخصیت کے عہد بہ عہد صحافتی کام کا ارتقاء پیش کرسکیں گے۔ ہم یہ دیکھ سکیں گے کہ سبط حسن صاحب ایوبی مارشل لاء سے ایک ڈیڑھ برس قبل تک اپنے عہد کے سیاسی حالات کو کس نظر سے دیکھتے تھے، مارشل لاء کے بالکل ابتدائی دنوں میں ان کے مباحث کیا تھے، اس کے دس گیارہ سال بعد ۷۱-۱۹۷۰ء میں، جب یحییٰ خان نے ون یونٹ توڑ کر براہ راست انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور انتخابات کے بعد ہم ایک عظیم قومی المیے سے دوچار ہوئے تو ان مشکل دنوں کو انہوں نے کس طرح دیکھا اور دکھایا، کس طرح سمجھا اور سمجھایا۔

شاید ظہیر بابر کو میری دلیل سے اتفاق نہ تھا پھر بھی انہوں نے میری رہنمائی اور مدد کا وعدہ کرلیا۔ انہوں نے اوائل ۱۹۵۷ء سے، جب ''لیل ونہار'' کا اجراء ہوا، اپریل ۱۹۵۹ء تک، جب سبط حسن ''لیل ونہار'' سے الگ ہوگئے، ایک ایک اداریہ بغور دیکھا۔ انہوں نے اپنی یاداشت اور علم کی حد تک نہ صرف سبط حسن صاحب کے اداریوں کی نشاندہی کی بلکہ ازراہ کرم یہ بھی بتایا کہ ان میں فیض صاحب کے اداریے کون سے ہیں اور خود ظہیر بابر صاحب کے لکھے ہوئے اداریے کون سے۔ اگرچہ وہ یقین کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار نہ تھے کہ انہوں نے سو فیصد درست نشاندہی کردی ہے لیکن جس توجہ، عرق ریزی اور اخلاص کے ساتھ انہوں نے یہ کام کیا، اس کی روشنی میں یہی امید کی جاسکتی ہے کہ ہم ''ہمارے سیاسی وتہذیبی مسائل'' میں سبط حسن صاحب کے اداریے ہی پڑھ رہے ہیں۔ پھر بھی کسی قسم کی غلطی کی ذمہ داری میں خود قبول کرتا ہوں۔

ظہیر بابر صاحب نے میری اور قارئین کی دلچسپی کے لیے ان اداریوں کے لکھے جانے کا پس منظر بھی بتایا، ان کا کہنا تھا کہ ادارتی عملے کی میٹنگ میں جو بھی موضوع زیر بحث آتا اس پر سامنے آنے والی آراء کی روشنی میں اداریہ لکھا جاتا تھا۔ زیادہ تر اداریے سبط حسن صاحب لکھتے تھے لیکن کبھی کبھار یہ کام دوسرے احباب بھی کرلیتے۔ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کی طرح ''لیل ونہار'' کا پہلا اداریہ بھی فیض صاحب نے ہی لکھا تھا۔ جسے اس کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اداریہ جو بھی لکھتا اسے بحث کی روشنی میں سامنے آنے والی آراء اور ادارے کی پالیسی کو

مدنظر رکھنا پڑتا۔ اس لحاظ سے ان اداریوں میں پیش کردہ خیالات، سبط حسن صاحب یا دوسرے احباب کے ذاتی خیالات قرار نہیں دیئے جاسکتے۔

یہ اداریئے چار مختلف اور ہماری قومی زندگی کے انتہائی اہم ادوار کا احاطہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کے پہلے دور کے آخری دنوں کی تصویر سامنے آتی ہے۔ مارشل لاء سے پہلے کی سیاسی صورتحال کے بارے میں بہت الزام تراشی کی گئی ہے۔ اس الزام تراشی میں صداقت بھی ہے لیکن ان اداریوں کو پڑھ کر اصلاح احوال کی صورت بھی نظر آتی ہے اور یہ احساس ہرگز نہیں ابھرتا کہ اس افراتفری کا حل مارشل لاء کے نفاذ میں تھا۔ مارشل لاء سے قبل کے ڈیڑھ دو برسوں کی یہ کہانی دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ سیاسی کجرویوں پر سرزنش کرتے ہوئے اداریہ نویس نے کہیں کہیں مارشل لاء کے خطرے کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن اس کا سارا زور اس بات پر رہا کہ پارلیمانی جمہوریت کو جمہور کے دکھ درد کا مداوا بنایا جائے۔ یہ اداریئے ہمیں وہ ساری تصویریں دکھاتے ہیں جو اس دور کی سیاسی تاریخ میں ہم دوسرے ذرائع سے نہ دیکھ پاتے۔

مارشل لاء کا نفاذ، ہماری قومی زندگی کا ایک ایسا المیہ تھا، جو ہمیں اس سے بڑے اور تباہ کن المیے (سانحہ مشرقی پاکستان) کی طرف لے جانے والا تھا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی اظہار پر مکمل پہرے بٹھادیئے گئے چنانچہ اکتوبر ۵۸ء سے اپریل ۵۹ء کے عرصہ میں اداریوں کے موضوعات بدل گئے۔ اظہار پر پابندیوں کی اس اندھی گلی میں بھی سبط حسن صاحب نے اور ان کے ادارے کے دوسرے احباب نے سماجی زندگی کے بعض ان پہلوؤں کی نشاندہی کی جو ہنگامہ پرور سیاسی مسائل کے باعث ان صفحات میں اب تک جگہ نہ پاسکے تھے۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں سبط حسن "لیل و نہار" سے الگ ہوگئے اور ۱۹۶۴ء میں اس جریدے کی اشاعت معطل ہوگئی۔

یحییٰ خان کا مارشل لاء اپنے ساتھ نئے سیاسی طوفان لایا۔ ون یونٹ کے خاتمے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کی نوید نے دس برسوں بعد ایک زبردست سیاسی ہلچل پیدا کردی۔ ون یونٹ ٹوٹا، انتخابات ہوئے اور ملک دو ٹکڑے ہوگیا۔ اس سانحہ پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے ٹکڑے ادھر ادھر سے لے کر چھاپے گئے ہیں۔ کوئی عوامی لیگ پر ذمہ داری کا بار ڈالتا ہے تو کوئی بھٹو پر اور بعض لوگوں کو صرف یحییٰ خان مجرم نظر آتا

ہے۔ اس انتہائی اہم اور نازک دور کے اداریوں سے جو کہانی ابھر کر سامنے آتی ہے وہ شخصیات کی بجائے اس ملک کے سیاسی نظام کی خامیوں کی جانب اشارے کرتی ہے۔ ”لیل و نہار“ کے اس دور ثانی میں اگرچہ زیادہ اداریے فیض صاحب نے لکھے اور سبط حسن صاحب اس جانب بہت کم توجہ کر سکے پھر بھی ۷۱۔۱۹۷۰ء کا سیاسی/ سماجی منظر نامہ ان اداریوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

بھٹو کا نیا پاکستان، پاکستان کے شکستہ ملبے سے ابھرا تھا، اس نئے دور میں نئی سماجی اور تہذیبی تحریکیں ابھریں ان میں ایک واقعہ ”پاکستانی ادب“ کا اجراء بھی تھا۔ جس کی محرک سعیدہ گزدر اور روح رواں سبط حسن تھے۔ یہ ادبی جریدہ جلد ہی ایک ایسی ادبی تحریک کی شکل اختیار کر گیا جس میں مستقبل کے بھرپور امکانات نظر آتے تھے۔ ”پاکستانی ادب“ کے زیادہ تر اداریے سبط حسن صاحب نے ہی لکھے جنہیں سعیدہ کی نشاندہی پر اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

(۲)

یہ ریکارڈ، ہماری ماضی کی تاریخ کے مختلف ادوار کا ریکارڈ ہے۔ جو تاریخ کی غلطیاں درست کرنے کے کام بھی آ سکتا ہے اور صحافتی کردار کی بلندیوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ جہاں تک صحافتی اسلوب کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ کہنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ تحریریں، اپنا اظہار آپ ہیں۔ تاہم سبط حسن صاحب کی صحافتی خدمات کا مختصراً ذکر مناسب ہوگا۔

سبط حسن نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اپنی طالب علمی کے دنوں سے ہی کر دیا تھا۔ اپنے مقالے ”سبط حسن کا پیمانِ وفا“ میں سید جعفر احمد لکھتے ہیں:

> ”ابتدا میں انہوں نے ”بمبئی کرانیکل“ میں جو سید عبداللہ بریلوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، چند ماہ کام کیا۔ پھر مولوی عبدالحق کی خواہش پر وہ حیدر آباد چلے گئے جہاں انہوں نے ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالغفار کے زیرادارت شائع ہونے والے اخبار ”پیام“ میں ملازمت اختیار کر لی۔ سبطے صاحب تمام عمر قاضی عبدالغفار کے ممنون احسان رہے۔ وہ چار سال نہ صرف ”پیام“ میں رہے بلکہ ان کا قیام

بھی قاضی صاحب کے مکان ہی پر رہا جنہوں نے انہیں اپنی اولادوں کی طرح رکھا۔ ایک مرتبہ میں نے سبطے صاحب سے ان کے پسندیدہ نثر نگاروں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی کے علاوہ قاضی عبدالغفار کا بھی تذکرہ کیا۔ سبطے صاحب کی اپنی تحریر میں شگفتگی و شادابی، ادبی رچاؤ اور انشاء پردازی کا جو امتزاج نظر آتا ہے، یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ بڑی حد تک قاضی عبدالغفار کی صحبت میں مجاہدۂ حق کی جستجو ہی کا ثمر ہے۔ قیام پاکستان سے قبل سبطے صاحب جن دیگر اخبارات و جرائد سے وابستہ رہے ان میں ''نیشنل ہیرالڈ''، ''قومی جنگ'' اور ''پیپلز وار'' شامل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ''امروز''، ''پاکستان ٹائمز''، ''لیل ونہار'' اور ''سول اینڈ ملٹری گزٹ''، میں چھپتے رہے۔''

''لیل ونہار'' دو بار نکلا اور بند ہوا۔ پہلی بار یہ اس وقت نکلا جب پاکستان میں ۱۹۵۶ء کا دستور نافذ ہوجانے کے باوجود پارلیمانی نظام کی کشتی ڈانواڈول رہی تھی۔ یہ آئین اپنے دو سال بھی پورے نہ کرسکا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی طرح ''لیل ونہار'' میں سبط حسن صاحب صرف دو سال تک ایڈیٹر رہ سکے۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

''لیل ونہار کا پہلا پرچہ ۲۰ جنوری ۵۷ء کو شائع ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نومبر ۵۶ء میں اس پرچے کی ادارت میرے سپرد کرتے وقت میاں صاحب مرحوم نے کہا تھا کہ میں اس پرچے کو الہلال اور ہمدرد کی مانند ایک یادگار پرچہ بنانا چاہتا ہوں اور میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کو الہلال اور ہمدرد کا انجام شاید یاد نہیں۔ اور میاں صاحب نے فرمایا تھا کہ سب یاد ہے لیکن میں اور تم دونوں جیل کے عادی ہیں پھر ڈر کس بات کا۔''

سبط حسن صاحب صحافت کی اسی روایت کے امین تھے۔ یہ صحافت ایک اعلیٰ نصب العین کی صحافت تھی، جو موجودہ صحافت کی طرح محض منافع خوری اور مفاد پرستی کے تابع نہیں تھی۔ اس نصب العین کی پاسداری مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی کرتے رہے تھے۔

قید و بند، صحافتی پابندیاں اور سرکاری مخالفین بھی ان کا راستہ نہ روک سکی تھیں۔ سرسید کی صحافت کے برعکس یہ ایک نئی طرح کی صحافت تھی جس میں انگریز سے وفاداری کی روایت کہیں

بہت پیچھے رہ گئی تھی اور قومی آزادی کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ حسرت، جوہر اور آزاد — تینوں بیک وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ، شاعر، ادیب اور سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ اس نئی صحافت کے امین اور پاسدار بھی تھے۔ سیاسی اعتبار سے تینوں سامراجیت اور استحصال کے دشمن تھے۔

صحافت میں بظاہر تینوں کا رنگ اپنا اپنا تھا۔ حسرت کا ''اردو کے معلّیٰ'' بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید'' کلاسیکی ادب اور انقلابی سیاست کا امتزاج پیش کرتا تھا۔ یہ انقلابی سیاست ہر قسم کے اعتدال پسندانہ خیالات کی مخالف تھی۔'' جوہر نے انگریزی زبان میں ''کامریڈ'' کا اجراء کیا جس کے ذریعے انہوں نے ایک طرف انگریزی تعلیم سے آراستہ ذہنوں کو متاثر کرنے اور دوسری طرف انگریز حکمرانوں کو عوام کے جذبات سے باخبر رکھنے کا کام لیا۔ انہوں نے ''ہمدرد'' کے نام سے اردو روزنامہ جاری کر کے عام لوگوں تک بھی رسائی حاصل کی۔ مولانا آزاد کے قاری سیاسی طور پر باشعور اور برصغیر کی تاریخ و معاشرت سے آگہی رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ یہاں اگر ہم مولانا ظفرعلی خان اور ان کے ''زمیندار'' کا بھی ذکر کردیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ''زمیندار'' نے ان تینوں کے برعکس عوامی انداز اختیار کیا۔ ''زمیندار'' کے قاری بالکل عام لوگ تھے۔

حسرت کے نزدیک یقین یا عقیدہ خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جسے محض کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا، اخلاقی گناہوں میں بدترین گناہ ہے اور جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں خیال تک پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ حسرت نے نہ صرف جرات و بیباکی کو اپنا شعار بنایا نہ صرف ہر قسم کے سمجھوتوں سے اجتناب کیا بلکہ صحافت کے پیشہ ورانہ اصولوں کی بھی دل و جان سے پاسداری کی چنانچہ جب ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ایک ایسا سیاسی مقالہ شائع کیا جو انگریز حکومت کے قانون کی زد میں آ گیا تو انہوں نے مقالہ نگار کا نام ظاہر کرنے سے انکار کردیا جس پر انہیں دوسال قید بامشقت (جس میں چکی کی مشقت بھی شامل تھی) کی سزا سنائی گئی۔ وہ مضمون کے اصل مصنف کا نام ظاہر کر کے خود چھٹکارا پاسکتے تھے لیکن انہوں نے سچی صحافت کے اس بنیادی اصول کی پیروی کی جس میں صاحب مضمون کے نام کا اخفا (اگر اسے ظاہر نہ کرنے کی خواہش کی گئی ہو) بنیادی شرط ہوتی ہے۔

محمد علی جوہر کو صحافت اور سیاست میں اپنے کارناموں کی بدولت رئیس الاحرار کا خطاب

ملا۔ صحافت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ صحافی کو رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں، بلکہ رائے عامہ پیدا کرنے والا بھی ہونا چاہیے۔ وہ خبر کے حقائق پر مبنی ہونے کو بھی بہت اہم گردانتے تھے تاکہ مورخ اس کی بنیاد پر تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کر سکے۔ وہ اداریے میں محنت، تحقیق اور مطالعے کی اہمیت پر بھی بہت زور دیتے تھے اور ان کا یہ اصرار بھی تھا کہ اخبار نویس کو ہر حال میں ذاتیات سے بالاتر رہنا چاہیے۔ ان کے یہ صحافتی اصول ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' سے پوری طرح ابھر کر سامنے آئے۔

مولانا آزاد نے بچپن سے ہی شوقیہ اخبار نویسی شروع کر دی تھی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ''الہلال'' کا پہلا شمارہ سامنے آیا۔ اس کے اداریے میں انہوں نے صحافت کے ''تجارتی کاروبار اور دکاندارانہ شغل'' کی مذمت کی۔ صحافت ان کے نزدیک کاروبار نہیں ایک مشن تھا۔ چند روز بعد ۲۷ جولائی کو انہوں نے اپنے ایک اور اداریے میں لکھا:

> ''اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سمِ قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور اجروں کے عطیوں کو قومی امانت، قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچوں میں ''کام ایڈیٹر کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔''

پنجاب کے زمینداروں کی ترجمانی کے مقصد سے جاری ہونے والا ''زمیندار'' جب مولانا ظفر علی خان کی ادارت میں آیا تو اس کا کردار ہی بدل گیا۔ بار بار زرِ ضمانت کی طلبی، پھر اخبار کی ضبطی، پریس کی ضبطی، اخبار کی بندش، دوبارہ اجرا، خود مولانا کی نظر بندی اور اخبار پر سنسر شپ۔ یہ تمام پابندیاں اخبار کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ روک سکیں۔ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے ''ستارۂ صبح'' جاری کیا جس میں اپنے صحافتی اصولوں کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

> ''اخبار نویسی کے پیشے میں جب ہم نے قدم رکھا تو اولین مقصد جو ہمارے پیش نظر تھا، اس غریب طبقے کی اصلاح تھی جو اگرچہ نادار ہے لیکن حقیقت میں ملک کا اصل سرمایہ ہے۔ دولت مندوں کے التزامِ عشرت، امراء کے جاہ و جلال، سلطنت

کی سطوت وجبروت، سب دریا اس ایک چھوٹے سے چشمے سے بہ نکلے ہیں۔ دہقان کے خون کی گرمی، قومی زندگی کا اصل مایۂ حرارت ہے۔ کسان کے پسینے کا ایک قطرہ سلطنت کی حقیقی امید ہے۔ یہ جو شہروں میں رہتے ہیں اور اجلے اجلے گاؤ تکیے لگا کر جھمجھاتی مسندوں پر بیٹھتے ہیں اور پنڈالوں میں رونق افروز ہوکر آئے دن رزولیوشن پاس کرتے ہیں اور آرام کرسیوں پر لیٹ کر بہ زعم خود قومی مسائل حل کیا کرتے ہیں، بلکہ کائنات کو تروبالا کردیا کرتے ہیں یہ (لوگ) کیا ہیں؟ غور سے دیکھا جائے تو ان کی حیثیت پر پشہ سے زیادہ نہیں۔"

بیسویں صدی کی دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی میں یہ بزرگ نصب العین کی صحافت کو آگے بڑھاتے رہے چنانچہ علی گڑھ میں زیر تعلیم سبط حسن بھی با مقصد صحافت کے کارواں کے ساتھ جڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اسی صحافت کے راستے وہ سیاست میں آئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور سے انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور جنوری ۱۹۵۷ء میں "لیل ونہار" کے مدیر مقرر ہوگئے۔ سبط حسن کی ادارت کا پہلا دور جنوری ۱۹۵۷ء سے اپریل ۱۹۵۹ء تک پر محیط ہے اور سید جعفر احمد کے لفظوں میں "لیل ونہار جس صوری ومعنوی حسن کا حامل تھا وہ اردو صحافت میں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد دیکھنے میں آیا۔" انگریزی صحافت سے اس کا جواب "ویوپوائنٹ" کی صورت میں ہی سامنے آسکا اور وہ بھی اس لئے کہ مظہر علی خان بھی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی اسی ٹیم کا حصہ تھے جس میں سبط حسن شامل تھے۔ سبط حسن صاحب کے اپنے لفظوں میں:

"لیل ونہار شائع ہوا تو قارئین نے اس کی توقع سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات پرانے پرچے ڈیڑھ روپے دو روپے میں خریدتے تھے (لیل ونہار کے ایک شمارے کی قیمت آٹھ آنے تھی) مئی ۱۹۵۷ء میں جنگِ آزادی نمبر شائع ہوا تو سارے ملک میں دھوم مچ گئی اور پریس کو ایک ہفتے کے اندر چار ایڈیشن چھاپنے پڑے پھر بھی مانگ پوری نہ ہوئی۔"

سبط حسن صاحب کے خیال میں مقبولیت کی وجہ محض 'لیل ونہار' کا "حسن ترتیب وتعارف نہ تھا بلکہ وہ مندرجات تھے جن میں ابنائے وطن کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی جاتی تھی۔" دس سال بعد ۱۹۷۰ء میں انہوں نے "لیل ونہار پر کیا گزری؟" کے عنوان سے اپنی

صحافتی پالیسی اور جدوجہد کی تفصیل ان لفظوں میں بیان کی تھی:

''پروگریسو پیپرز کے دوسرے پرچوں— پاکستان ٹائمز اور امروز کی مانند لیل ونہار کی بھی آرزو تھی کہ پاکستان ایک فلاحی ریاست بنے اور یہاں حقیقی معنوں میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ پاکستان امریکہ کی معاشی فوجی اور سیاسی گرفت سے آزاد ہو کر ایک باعزت ملک کی حیثیت سے ترقی کرے اور سیٹو اور سنٹو کے فوجی معاہدوں سے گلو خلاصی پائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک میں جمہوری اقدار کو فروغ ہو اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور سرکاری افسروں کا جو امریکہ کے وظیفہ خوار تھے زور ٹوٹے۔ اسمبلیوں کے انتخابات ہوں اور ان میں عوام کے چنے ہوئے نمائندے شریک ہو کر زمام اختیار اپنے ہاتھوں میں لیں۔ اسی بناء پر ارباب اقتدار ان پرچوں پر اور ان کے روح رواں میاں افتخار الدین پر ملک کا دشمن، روس اور چین کا ایجنٹ اور اسی قسم کے دوسرے بے بنیاد الزامات لگاتے تھے۔ مگر خود زمانے نے بتادیا کہ میاں صاحب اور ان کے اخباروں کا موقف درست تھا یا ان بزرگوں کا جو ہماری مخالفت کرتے تھے۔ آج ملک کے سبھی اخبار و جرائد وہی باتیں کہہ رہے ہیں جو ہم اب سے دس برس پہلے کہتے تھے اور مورد الزام ٹھہرتے تھے۔''

(۳)

سبط حسن صاحب سمیت پروگریسیو پیپرز کے دوسرے کارکنوں پر کیسے ہاتھ ڈالا گیا اور پھر ان ترقی پسند اخبارات پر کیسے قبضہ کیا گیا۔ یہ کہانی بہتر ہے خود سبط حسن صاحب کی زبانی سنی جائے۔

''۵۸ء کے وسط میں عام انتخابات کے چرچے شروع ہوئے جس طرح ان دنوں ہیں۔ پھر اعلان ہوا کہ انتخابات فروری ۵۹ء میں ہوں گے۔ لیکن ۱۸ اکتوبر کو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ملک میں مارشل لا نافذ کردیا گیا ہے۔ آئین منسوخ ہو گیا ہے وزارتیں اور اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں جلسہ جلوس کی ممانعت ہے اور اخباروں پر فوجی سنسر شپ لگادی گئی ہے یہ اتنا اچانک ہوا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور

کس سے مشورہ لیں۔بدقسمتی سے میاں صاحب ان دنوں لندن میں بیمار پڑے ہوئے تھے اور ان سے رابطہ قائم کرنا ناممکن تھا۔لیکن ایوب خاں نے میری مشکل جلد ہی آسان کردی۔۸ اکتوبر کو ''انقلاب'' آیا۔۱۳/۱۲ اکتوبر کی رات کو پولیس نے مجھے سوتے میں اٹھایا اور گرفتار کر کے جیل خانے بھیج دیا چار پانچ روز کے بعد احمد ندیم قاسمی بھی ہم اسیروں میں شامل ہوگئے اور چند ہی ہفتے گذرے تھے کہ ایک دن دیکھا کہ فیض احمد فیض بھی مسکراتے ہوئے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ وہ (اور ابوالاثر حفیظ جالندھری) حکومت کی ایما پر کسی ادبی تقریب میں شرکت کرنے تاشقند گئے ہوئے تھے۔واپس آئے تو گرفتار کرلئے گئے۔

ہم لوگوں کو ''تحفظ پاکستان'' کی خاطر سیکورٹی آف پاکستان ایکٹ کے تحت پکڑا گیا تھا۔اس کالے قانون میں نہ تو ملزم کو فرد جرم ملتی ہے نہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اور نہ اسیری کی کوئی میعاد مقرر ہوتی ہے۔گرفتاری اور رہائی دونوں حکومت کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔عدلیہ کو اس میں مداخلت کا اختیار نہیں ہوتا جیل میں ہمیں سی کلاس ملی چنانچہ ناشتہ میں گڑ میں پکا ہوا دلیا، کھانے میں دو روٹیاں اور ایک کٹورہ کالے رنگ کا پانی جس کی تہہ میں مسور کی دال کے چند دانے شرمائے پڑے ہوتے۔بان کی ایک تپڑی ہمارا بستر تھا اور کچے فرش کی ایک اندھیری کوٹھڑی ہماری قیام گاہ جس کا آہنی دروازہ سرشام بند ہوجاتا تھا۔نہ خط نہ پتر نہ ملاقات نہ ساتھی۔

''میں جسٹس کیانی مرحوم کے حکم سے فروری ۵۹ء میں رہا ہوا۔اس وقت پورا ملک جیل خانہ بنا ہوا تھا اور جیل کے اندر فقط کیانی مرحوم کے طنزیہ مضامین ہی سے پتہ چلتا تھا کہ پاکستان کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔مجھے یاد ہے کہ چوہدری اسلم اور میں جب کیانی صاحب کی عدالت میں (پشاور میں) پیش ہوئے تھے تو کیانی صاحب نے پولیس کی فائل پڑھ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم راولپنڈی سازش کیس میں بھی ماخوذ تھے۔اور میں نے کہا تھا کہ جی نہیں میں تو نظر بند تھا اور کیانی صاحب نے بھری عدالت میں فرمایا تھا کہ گھبرایئے نہیں وہ فوجی سازش ناکام رہی لیکن یہ سازش تو کامیاب ہوگئی اور ہم لوگ کیانی صاحب کی اس جرات مندانہ تنقید پر حیران ہوگئے تھے۔

''ہماری رہائی کے کچھ عرصے بعد میاں صاحب بھی لندن سے واپس آ گئے۔ ان کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی اور دل کے دورے برابر پڑ رہے تھے لیکن ان کے عزم اور حوصلے میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور نہ ان کی ہمت پست ہوئی تھی۔ البتہ ان کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ پروگریسیو پیپرز کی آواز مدھم ہوگئی ہے۔

''ہم لوگوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ دیکھیے حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ نرم روی سے کام لیا جائے ورنہ پرچے بند ہو جائیں گے۔ مگر وہ برابر یہی کہتے رہے کہ تم لوگ بزدل ہو۔ مارشل لاء سے ڈرتے ہو، اس اختلاف رائے کے باوجود انہوں نے ہمارے کام میں کبھی مداخلت نہیں کی...... ہماری تحریر کا ایک ایک لفظ مارشل لاء کے سنسر افسر کی اجازت سے چھپتا رہا۔

''لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایوب خاں اور ان کے مشیروں کو ان پرچوں کی یہ نرم روی بھی کھٹکتی ہے اور وہ پروگریسیو پیپرز پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ منصوبہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء کو مکمل ہوا۔

''اس روز مجھے گجرانوالہ کی عدالت میں بطور گواہ پیش ہونا تھا مارشل لاء کے کسی مخبر نے حکومت سے شکایت کی تھی کہ گجرانوالہ جیل میں قیدیوں کے ساتھ رعایت برتی جاتی ہے۔ اس الزام کی تحقیقات ایک مجسٹریٹ کے سپرد تھی۔ میں چونکہ گجرانوالہ جیل سے رہا ہوا تھا اس لئے نام نہاد رعایت کے عینی شاہد کی حیثیت سے مجھے بھی بطور گواہ طلب کیا گیا تھا۔

''میں گھر سے صبح سات بجے رتن چند کی سرائے کو روانہ ہوا جہاں سے گجرانوالہ کی بسیں چلتی ہیں۔ رتن چند سرائے کا راستہ پروگریسو پیپرز کی عمارت کے سامنے گذرتا ہے۔ تانگہ وہاں پہنچا تو میں نے تانگہ والے سے کہا کہ تم ٹھہرو میں ذرا اخبار لے لوں۔ پھاٹک میں داخل ہوا تو مجھے سی۔ آئی۔ ڈی کا وہ انسپکٹر نظر آیا جو جیل میں بیٹی نوشابہ سے میری ملاقات کی نگرانی کرنے آیا کرتا تھا۔ وہ ہال میں رکھے ہوئے اخباروں کے بنڈل الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور اس کی پشت پھاٹک کی طرف تھی۔ اسے اتنے سویرے وہاں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو سیڑھیوں پر اور سڑک کے اس پار میدان میں ہر طرف پولیس کے مسلح

سپاہی کھڑے نظر آئے اتنے میں انسپکٹر صاحب نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔مسکراتے ہوئے میرے قریب آئے اور کہنے لگے کہ شاہ صاحب اتنے سویرے آپ یہاں کیسے میں نے جواب دیا کہ میں گجرانوالہ جارہا ہوں۔لیکن اتنے سویرے آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔ بڑے فاتحانہ انداز میں بولے آپ کو معلوم نہیں۔حکومت نے آپ کے اخبار کو تحویل میں لے لیا ہے۔ میں بھونچکا ہوکر ان کا منہ دیکھنے لگا تو انہوں نے کہا اوپر جایئے وہاں ڈی آئی جی صاحب موجود ہیں۔ میں سیڑھاں پھلانگتا اوپر پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا تو وہاں بالکل سناٹا البتہ میری میز کی سب درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ کاغذات اور فائل میز پر بکھرے پڑے تھے اور الماری کی کتابیں فرش پر ڈھیر کردی گئی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ میرے کمرے کی تلاشی ہوئی ہے۔فون اٹھایا لیکن وہ بند تھا۔

''کمرے سے نکل کر میں پاکستان ٹائمز کی طرف چلا کہ شاید وہاں کوئی اپنا رفیق کار مل جائے تو اس سے پوچھوں۔ اتنے میں ڈی آئی جی صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس اور کئی دوسرے افسر سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے سرکاری حکم نامہ دکھایا۔ میں نے کہا جناب آخر یہ سب ہوا کیوں؟ کوئی وجہ تو بتایئے اس حکم نامہ میں تو کوئی سبب نہیں بیان کیا گیا ہے۔ یوں بھی ہمارے اخباروں کا تو ایک ایک لفظ سنسر سے منظور ہوکر آتا ہے۔ پھر حکومت کو اس اقدام کی کیا ضرورت پیش آئی۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا بھائی میں تو سرکاری ملازم ہوں۔ مجھے جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کررہا ہوں۔ میں نے لاجواب ہوکر کہا کہ مجھے آج صبح گجرانوالہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔آپ بتائیں میں آزاد ہوں یا گرفتار۔ (میرا خیال تھا کہ میاں صاحب، امیر حسین شاہ اور تینوں ایڈیٹر ضرور گرفتار کرلئے جائیں گے)ڈی آئی جی صاحب نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ فکر نہ کریں ہمارا ارادہ کسی کو گرفتار کرنے کا نہیں۔ آپ شوق سے گجرانوالہ جائیں۔ انہوں نے بتایا کہ مسٹر سرفراز پروگیسو پیپرز کے ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے ہیں لیکن وہ ابھی تک دفتر نہیں پہنچے ہیں۔

''میں دو بجے دن کے وقت گجرانوالہ سے واپس آیا۔دفتر پہنچا تو دیکھا کہ ہر

دروازے پر پولیس کا پہرہ ہے اور برآمدوں اور غلام گردش میں پولیس کے آدمی بنچوں پر بیٹھے ہیں۔ خوف اور دہشت کی عجیب فضا تھی۔ ہر شخص سہا ہوا تھا۔ حسن عابدی اور نصیر انور کی زبانی معلوم ہوا کہ سرفراز نے پروگریسو پیپرز کے ادارتی عملے کی میٹنگ طلب کی تھی۔ میں چونکہ اس میٹنگ میں شریک نہ تھا اس لئے نصیر انور کی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

نصیر انور کا بیان

''پھر کسی نے وقت کا احساس دلایا۔ اٹھو بھئی، سرکار کے بھیجے ہوئے ایڈمنسٹریٹر ہم سب سے مخاطب ہونے کو ہیں۔

ہال میں پہنچے۔ پاکستان ٹائمز امروز اور لیل ونہار کے ادارہ تحریر کے سبھی ارکان جمع تھے۔ نگاہیں مظہر علی خاں، احمد ندیم قاسمی اور سبط حسن کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ ایڈمنسٹریٹر سرفراز صاحب نے اپنی تقریر میں یقین دلایا کہ آپ میں سے کسی کو بھی ملازمت سے الگ نہیں کیا جائے گا۔ آپ الگ ہونا بھی چاہیں تو نہیں ہو سکتے کیونکہ لازمی سروس کا آرڈیننس نافذ کر دیا گیا ہے۔

تقریر جاری رہی مگر کوئی بھی لفظ سنائی نہ دیا۔

سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

تقریر ختم ہو گئی!

قدرے توقف کے بعد سرفراز صاحب نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کوئی سوال''؟ صاف نظر آ رہا ہے کہ ہر کوئی سوال بن کر ہی بیٹھا ہے پھر بھی سوال کے لیے پوچھا گیا، کتنی عجیب بات ہے۔

یکا یک پاکستان ٹائمز کے ایک ذمہ دار رکن اپنی جگہ سے اٹھے وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ شاید میری طرح اور بھی یہ سوچنے لگے کہ اب یہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ مگر اس پہاڑ میں سے ایک چھوٹا سا جھینگر نکلا۔ اس اقدام پر راگ الاپتے ہوئے اس نے کہا ''سر'' ہمارے اوور ٹائم کے بہت سے بل رکے پڑے ہیں۔ ان کی ادائیگی کا بندوبست ہو جائے تو میرے ساتھی آپ کے جان ومال کو دعائیں دیں گے۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان ٹائمز کے ایک اور شنڈے نے جھولی پھیلائی ''سر'' ہمیں آمدورفت کا الاؤنس بھی ملنا چاہیے سر......''

''چہرے سے عیاں تھا کہ سرفراز صاحب مارے شرم کے پانی پانی ہورہے تھے کہ ان پیٹ کے بندوں کو قابو میں لانے کے لیے خواہ مخواہ پولیس اور اسلحہ کا تکلف کیا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ کیا اور محفل برخاست کردی۔''

''چار بجے کے قریب مظہر علی خاں کا چپڑاسی آیا کہ مظہر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہاں گیا تو قاسمی صاحب اور دو تین اور ساتھی بیٹھے تھے۔ سب کے چہروں پر اداسی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا بیٹے کی لاش کے منتظر ہیں۔ مظہر نے کہا کہ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے لیکن میاں صاحب کا حکم ہے کہ تم لوگ ابھی استعفیٰ نہ دو بلکہ بدستور کام کرتے رہو۔ قاسمی صاحب نے اور میں نے بہت کہا کہ بھائی ہم بھی مستعفی ہوجاتے ہیں لیکن مظہر نہ مانے انہوں نے کہا کہ میاں صاحب نے کسی مصلحت کی بنا پر یہ حکم دیا ہے لہٰذا تم لوگ بدستور کام کرتے رہو۔

''گھنٹہ بھر کے بعد مسٹر سرفراز کا فون آیا کہ آپ مجھ سے مل لیں تب پتہ چلا کہ فون کے تار دوبارہ زندہ ہوگئے ہیں۔ میں ملنے گیا تو وہ میاں افتخار الدین کی کرسی پر براجمان تھے۔ انہیں میاں صاحب کی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر مجھے معاً خیال آیا کہ بعض آدمی پستہ قد ہونے کے باوجود اپنی کرسی سے بڑے ہوتے ہیں اور بعض دراز قد ہونے کے باوجود کرسی سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ پہلے میں اس کمرے میں ایک شریف انسان سے ملنے آتا تھا جو مجھے کمپنی کا ملازم نہیں بلکہ اپنا رفیق کار سمجھتا تھا۔ مجھے پیار کرتا تھا۔ مجھے ڈانٹتا تھا۔ مجھے الٹے سیدھے مشورے دیتا تھا مجھ سے سیاسی بحثیں کرتا تھا۔ لطیفے سناتا تھا، ہنساتا تھا اور اگر دکھ ہو تو میری دلجوئی کرتا تھا اور اب اسی عظیم انسان کی جگہ کرسی پر ایک بونا افسر بیٹھا ہے۔ اب مجھے آدمی کو نہیں کرسی کو سلام کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

''مسٹر سرفراز بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ چائے منگوائی اور لیل ونہار کے بارے میں یوں گفتگو کرنے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیل ونہار کا تازہ شمارہ اسی

دن چھپ کر آیا تھا اور ان کی میز پر رکھا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ آپ نے تبت پر چین کے قبضے کی حمایت کیوں کی ہے۔ میں نے کہا تبت کو تو انگریز اور پنڈت نہرو بھی چین ہی کا صوبہ سمجھتے ہیں اور تاریخ بھی یہی کہتی ہے بولے نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ ذرا سخت ہے۔ میں نے کہا کہ سنسر والوں نے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس پر ان کو حیرت ہوئی بڑے تجاہل عارفانہ سے بولے مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کا پرچہ بھی سنسر ہوتا ہے۔ پھر تو کہہ دیجئے کہ اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ میں نے کہا اس کا حکم تو آپ خود ہی دیں اور ایک حکم کی درخواست میں بھی لایا ہوں۔ فرمایا وہ کیا۔ میں نے کہا کہ میری سبکدوشی ۔ کہنے لگے جلدی کیا ہے۔ آپ کا پرچہ تو ہفت روزہ ہے۔ شاید اس وقت تک میرے جانشین کے لیے امیدواروں میں رسہ کشی جاری تھی۔

'' دوسرے دن اتوار تھا۔ میں میاں صاحب سے ملنے گیا۔ ان کی کوٹھی سی آئی ڈی والوں سے گھری ہوئی تھی لیکن کسی نے مجھے نہیں روکا۔ میاں صاحب حسب معمول بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ سید امیر حسین شاہ، میاں محمود علی قصوری، مظہر علی خاں، عبداللہ ملک اور حمید اختر وہاں پہلے سے موجود تھے اور پروگریسو پیپرز ہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر مظہر کے استعفیٰ کا ذکر نکلا میاں صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولے۔ یار ہم تو نواب زادے سے مار کھا گئے۔ استعفیٰ دینے کی مہلت ہی نہ ملی۔ چیئرمینی سے برطرف کر دیئے گئے۔ پھر میرا حال پوچھا۔ میں نے کہا سرفراز سے باتیں تو ہوئی ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ میاں صاحب نے پھر ایک زور دار قہقہہ لگایا اور بولے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہماری طرح تم بھی برطرف کئے جاؤ۔

'' پیر کے دن دفتر گیا تو دس گیارہ بجے کے قریب جنرل منیجر میاں مقصود منہ لٹکائے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اسے میری طرف بڑھا کر وہ چپ چاپ واپس چلے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا تو سرفراز صاحب نے لکھا تھا کہ آپ لیل و نہار کی ایڈیٹری سے سبکدوش کئے جاتے ہیں۔ دفتر سے اپنا حساب کر لیں میرے جانشین کا انتخاب ہو چکا تھا۔

''لیکن جانشین آتے رہے اور لیل ونہار کے بھاری پتھر کو چوم کر رخصت
ہوتے رہے پھر ایک دن خبر آئی کہ لیل ونہار بند ہوگیا ہے اور تب ہم نے جانا کہ ۔

مکاں منعم کا سونے سے، یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس وخاشاک کا گھر بھی، بڑی مشکل سے بنتا ہے

(۴)

لیکن لیل ونہار تو وقت کے تسلسل کا نام ہے۔ اسے روکنا اسے بند کرنا کس کے بس میں ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں ''لیل ونہار'' کا پھر اجراء ہوا۔ سبطے صاحب نے حسرت موہانی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان جیسے چار درویشوں کا قصہ پرانا نہ ہونے دیا۔ ۱۹۷۰ء میں بھی ۱۹۵۸ء کی طرح انتخابات ہونے والے تھے۔ ضرورت تھی کہ فیض احمد فیض، سبط حسن، حسن عابدی اور دوسرے دوست عوام کے سیاسی (اور انتخابی) شعور کی ترجمانی کے فرائض انجام دیں۔ انتخابات سے قبل، انتخابات کے دوران اور انتخابات کے چند ماہ بعد تک یہ فریضہ بڑی خوبی اور اخلاص سے انجام دیا گیا کہ آج ہمیں ان دو برسوں کی سچی تاریخ کے لیے ''لیل ونہار'' کے ان پرچوں سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس دور میں جیسا کہ میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں، اداریہ نویسی کا زیادہ کام فیض صاحب نے کیا۔ سبط حسن صاحب نے بہت کم اداریے لکھے لیکن جتنے بھی لکھے، وہ ان کی سابقہ صحافتی روش کے عین مطابق تھے۔

لیکن سبط حسن صاحب اور ہم سب بھی تاریخ کے ایک سنگین موڑ پر کھڑے تھے۔ فیض صاحب نے اپنے ایک اداریے میں بجا طور پر اس تشویش کا اظہار کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ پاکستان کا وجود نہ رہا یا ملک پارہ پارہ ہوگیا تو تاریخ ہمارے رہنماؤں کو، خواہ وہ مشرقی پاکستان کے ہوں یا مغربی پاکستان کے، ہرگز ہرگز معاف نہیں کرے گی۔

فیض کے خدشات بجا ثابت ہوئے۔ چند ماہ کے اندر اندر ملک ٹوٹ گیا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ''لیل ونہار'' ایک بار پھر بند ہوگیا۔ خس وخاشاک کا یہ گھر دوبارہ بھی بڑی مشکل سے بنا تھا لیکن خون جب گلیوں میں بہایا جارہا ہو اس وقت خونِ دل سے اس گھر کی بقا ممکن نہیں ہوتی۔

احمد سلیم

یہ کتاب

''پاکستانی ادب'' کے ایک اداریے میں سبطِ صاحب نے لکھا ہے کہ سقراط کہتا تھا کہ میں یونانیوں کے لیے ایک بڑمکھی ہوں۔ انہیں ہمیشہ جھنجھوڑتا اور جگاتا رہتا ہوں۔ ان کے ذہنوں میں سوال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سبطِ صاحب کو اگر پاکستانیوں کے حوالے سے بڑمکھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہم وطنوں کے ذہنوں میں ایسے سوال اور خیال پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ کسی نہ کسی بامقصد گفتگو کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہوجاتے، مضامین لکھتے، ان میں بھی کوئی نہ کوئی ذہنی اور علمی تحریک شروع ہوجاتی۔ وہ جانتے تھے کہ آپس میں رابطہ قائم رکھنا اور ایک خاص تنقیدی اور شعوری سطح پر اسے برقرار رکھنا کتنا قیمتی انسانی سرمایہ ہے۔ اگر رابطے ختم ہوجائیں تو دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف دشمن بیٹھ جاتے ہیں۔ دل مضبوط اور وسیع ہونے کے بجائے تنگ اور کمزور ہوجاتے ہیں اور نظر ہمیشہ جھکی رہتی ہے۔ صحت مند اختلاف، زندگی میں سوچ کی ترقی کے لیے ایک طرح کی پونجی ہے۔

یہ کتاب ''لیل و نہار'' اور ''پاکستانی ادب'' جیسے قابلِ ذکر رسالوں کے اُن اداریوں پر مشتمل ہے جنہیں سبطِ صاحب نے مختلف اوقات میں لکھا تھا۔ بنیادی طور پر سبطِ صاحب ایک سماجی تاریخ دان تھے۔ وہ بدلتی ہوئی حکومتوں اور حکمرانوں کے بجائے اُن تبدیلیوں کا اثر عوام اور روزمرہ کی عام زندگی پر جو ہوتا تھا، اسے اہمیت دیتے تھے۔ یہ اداریے بھی مورخ کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ ایک تسلسل ہیں پاکستان میں آنے والی تبدیلیوں کا، بین الاقوامی سیاست کا، ملک

میں پکنے والی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے جال کا۔ ان اداریوں کو پڑھ کر معمولی ذہن کا شہری بھی اپنے حالات اور تاریخ کو بہ آسانی سمجھ لیتا ہے۔ ہمارے ملک کے مختصر ترین تاریخی دور پر کیا کچھ نہیں بیتا۔ بنگلہ دیش کا سانحہ تو خیر ایک اتنا بڑا دھوکہ تھا کہ کتنے پاکستانیوں کی زندگی اب پہلے جیسی نہیں رہی لیکن اس سے قطع نظر ابتدا سے ہی حکومت خواہ کسی نے بھی کی لیکن حکمران، لیڈر اور سیاست دان جو بھی رہے انہوں نے بلا کسی شرم اور تکلف کے ملک بڑا اجڑا کر لوٹا اور بیچا ہے، عوام کو ہمیشہ دھوکے میں رکھا ہے۔ ذہنی، مالی، ثقافتی، تہذیبی اور علمی طور پر انہیں کمزور اور پست رہنے دیا اور یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا قومی مزاج جارحانہ حد تک احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ حکمران اور لیڈر گلا پھاڑ پھاڑ کر عوام کی رٹ لگاتے رہتے ہیں بالکل اس طرح جیسے کہ وہ بھیڑ بکریوں کے گلے ہیں۔ بقول فیض ؎

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

سبطِ صاحب کو ہمیشہ سیاسی پارٹیوں سے یہی شکایت رہی کہ لیڈر حضرات نوجوانوں اور طالبِ علموں کو اپنے مطلب حل کرنے اور لیڈری چمکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں سیاسی خودغرضیوں میں اُلجھاتے ہیں لیکن ان میں علم و شعور پیدا نہیں ہونے دیتے اور ایسا وہ دانستہ کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کارکنوں میں سوال کرنے اور اختلاف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ بس وہ کٹھ پتلی بنے ہر بات پر گردن ہلاتے رہیں اور سر جھکا کر کہنا مانتے رہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے میدان پر تشدد سیاست اور سیاسی ڈھول دھپوں کے لیے نہیں ہوتے وہاں سنجیدہ علمیت سے بھرپور بحث مباحثے ہونے چاہییں جبکہ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہے۔

سبطِ صاحب نے یہ بات مختلف زاویوں سے ان اداریوں اور مضامین میں بار بار دہرائی ہے۔ نوجوانوں کو ایک بامقصد زندگی سے اور انسان کو انسانیت سے محروم کرنا ایک سنگین آفاقی جرم ہے۔ انہوں نے ہمیشہ انسانوں کے لیے بہتر معیارِ زندگی اور ذہنی بلندی کے خواب دیکھے۔ ان کی تحریروں میں رونا دھونا نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ انسان کو خودداری اور اس کی ذات کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دانش ور رہنما تھے۔ اپنی آزادانہ اور منفرد سوچ کے ناطے اپنی ذمہ داری اور اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہی نہیں تھے بلکہ نبھاتے بھی تھے۔ ان اداریوں اور تحریروں میں انہیں اپنے اس رول کا بھرپور ادراک ہے۔ انہوں نے بچاؤ کے لیے خانے تلاش

نہیں کیے بلکہ اس چیلنج کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے جو غالباً پس ماندہ معاشروں میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے ایسی ہی شخصیتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

''پاکستانی ادب'' چار سال تک نکلا۔ کبھی رُک رُک کر اور کبھی لگا تار پابندی کے ساتھ۔ سبطِ صاحب مسلسل اور انتھک کام کرنے کے عادی تھے۔ وہ اس زمانے میں ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے پبلک ریلیشنز منیجر بھی تھے۔ وہ اشتہاروں میں بہت چھوٹی سی غلطی کو پکڑ لیتے۔ کاپی رائٹنگ کو درست کرتے، ساتھ ہی اپنے پی اے کو ڈکٹیشن لکھواتے رہتے۔ ان کی ہجے اور گرامر کی غلطیوں کو درست کرتے جاتے۔ بیچ بیچ میں ملنے والے آتے رہتے۔ وہ یہ سب کچھ بیک وقت کرتے اور ذرا بھی نہ اُلجھتے نہ confuse ہوتے اور ذرا سی فرصت ملتی تو دوبارہ پائپ سُلگاتے اور قلم سنبھال لیتے۔ جن لوگوں میں انہیں ذرہ برابر بھی کام کرنے کی صلاحیت نظر آتی ان پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہتے۔ کاہل سے کاہل انسان بھی ان کے اثر میں کام کرنے لگتا۔

''پاکستانی ادب'' کے بعض اداریے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ عام روش سے ہٹ کر چونکا دینے والے۔ ایسی فکر انگیز بحثوں کا آغاز کرتے ہیں جنہیں چھوتے ہوئے بھی ادیب اور دانش ور ڈرتے تھے۔ وہ اردو سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اپنی مادری زبان سے کون پیار نہیں کرتا۔ یہ محبت انہیں پاکستان کی دوسری قومی زبانوں سے اتنا ہی پیار کرنا اور ان کا احترام کرنا سکھاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسی ہمہ جہتی ہے جو پاکستان کے تمام باشندوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بھولے سے بھی کہیں ایک جملہ یا لفظ نہیں لکھتے جو شدت پسندی یا تنگ نظری کی لپیٹ میں آئے یا کسی کی دل آزاری کا سبب بنے۔ آج ہمیں ان سب چیزوں کی بڑے پیمانے پر ضرورت ہے۔ یہ توازن اور علمیت سبطِ صاحب نے برسوں کی ریاضت اور ڈسپلن سے سیکھا تھا۔ ان کی تحریروں میں خشکی اور کھردرا پن نہیں ہے بلکہ شگفتہ دلکشی ہے۔

گزشتہ پانچ برسوں میں سوشلسٹ ملکوں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، ہمارے اپنے ملک میں معاشرہ جس طرح تنزل اور انحطاط کا شکار ہے اسے سمجھنے اور برداشت کرنے کے لیے ایک حساس شخص کو کئی دلوں اور دماغوں کی ضرورت ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر سبطِ صاحب آج زندہ ہوتے تو وہ یہ سب کچھ دیکھتے۔ اس پر غور کرتے، سمجھتے اور پھر ان کی مشکل پسند طبیعت انہیں مجبور کر دیتی کہ وہ اس پوری صورتِ حال کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے لکھنا شروع کر دیں۔

یہ اداریے بہترین صحافت کی مثال ہیں اور احمد سلیم نے انہیں مرتب کر کے آج کی پاکستانی

قوم اور آنے والی اَن گنت نسلوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس قدر محنت طلب کام شاید وہی کر سکتے ہیں اور وہی ایسی ذمہ داریوں کو نبھانے کی صلاحیت اور ہمت رکھتے ہیں۔

سعیدہ گزدر
۶ جولائی ۱۹۹۲ء

اپنے بارے میں

(فیض احمد فیض)

کیا ہمارے ہاں، روزنامہ، ہفت روزہ، ماہانہ، دوماہی، سہ ماہی، سیاسی، ادبی، علمی، فلمی، انگریزی، اردو، سندھی، پشتو، اخبار، رسالے، جریدے پہلے ہی کافی بلکہ وافر تعداد میں موجود نہیں؟ کیا اس نقار خانے میں ایک اور طوطی کا اضافہ ضروری تھا؟ اگر تھا تو کیوں اور نہیں تھا تو اس تکلف کا سبب! آپ کہہ سکتے ہیں کہ اوّل تو ایسے سوالوں کا کوئی قطعی جواب نہیں ہوا کرتا اور اگر ہے تو وہ مدیر، ناشر یا ادیب کے بجائے عام پڑھنے والوں کو دینا چاہیے۔ مسئلہ تو ان کی رضا اور ضرورت کا ہے نہ کہ ناشروں اور مدیروں کی پسند و مصلحت کا لیکن یہ بات بجائے خود بحث طلب ہے— شہریوں سے بالکل الگ تھلگ قوم ہوتے ہیں جن کا باوا آدم باقی مخلوق سے نرالا ہے؟— کیا وہ خود کبھی کچھ نہیں پڑھتے—؟ کیا ان کو بھی اُنھیں مسائل، اُنھیں گتھیوں اور اُلجھنوں سے سابقہ نہیں پڑتا جنہیں سلجھانے کی ہمیں خلش رہتی ہے؟— کیا قومی اور بین الاقوامی سیاست، معیشت، ادب اور علوم وفنون کے بارے میں انہیں کوئی الگ معلومات درکار ہوتی ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کو الگ؟— ظاہر ہے کہ یوں ہونا تو نہیں چاہیے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بہت سے مالک، ناشر، مدیر، ادیب، اپنے کو واقعی عام پڑھنے والوں سے الگ اور بڑھیا چیز سمجھتے ہیں اور عوام کے مذاق اور فہم و ادراک کے بارے میں اوٹ پٹانگ نظریے گھڑتے رہتے ہیں،— بات یوں ہے کہ بعض معاشروں کا نظام تقاضا کرتا ہے کہ جملہ موجودات میں عوام اور خواص کی تفریق

ملحوظ رکھی جائے۔ اور ہر کاروبار (خاص طور پر ذہنی اور فکری کاروبار) کی باگ ڈور خواص ہی کے ہاتھ میں رہے اور انھیں کی مصلحتوں کی کار برآری کرے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس نوع کے معاشرے میں جیسے انسان حاکم و محکوم، ادنیٰ اور اعلیٰ ہوتے ہیں، ایسے ہی عمومی مصرف کی ہر چیز میں بھی ادنیٰ اور اعلیٰ، گھٹیا اور بڑھیا کی تفریق ارادتاً قائم رکھی جاتی ہے۔ مادّی استعمال کی اشیا کا تو خیر دام و درم سے تعلق ہے لیکن ان کے علاوہ کتابیں ہیں، رسالے ہیں، فلمیں ہیں، ریڈیو پروگرام ہیں، اس نوع کی جملہ تخلیقات میں عوام اور خواص کے مفروضہ مذاق کے مطابق اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم شعوری طور سے کی جاتی ہے تاکہ کچھ کالانعام کی ناند کا گھتولا بنیں کچھ اہلِ ثروت کے دستر خوان کا خاصہ۔

ہمارے ہاں اس پر مستزاد یہ ہے کہ دورِ غلامی کے ترکے میں ایک بدیسی زبان کا طوق بھی ملا ہے۔ امورِ ریاست اور اعلیٰ تعلیم و تدریس کا کاروبار نہ صرف آج کل انگریزی زبان میں چلتا ہے بلکہ ہمارے خواص نے اس کاروبار کا آئندہ بیس برس تک کا ٹھیکہ اسی زبان الملوک کو سونپ دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر انگریزی چیز بڑھیا ہے ہر دیسی چیز گھٹیا، انگریزی کتب اعلیٰ ہوتی ہیں اردو کتاب ادنیٰ، انگریزی فلم فن پارہ ہوتا ہے اردو فلم مجموعۂ خرافات۔ انگریزی زبان کا ابجد خواں تعلیم یافتہ گنا جاتا ہے اردو، فارسی، عربی، سندھی، پشتو کا فاضل اجل جاہل مطلق اسی لیے انگریزی اخبار اور انگریزی رسالے معتبر ہوتے ہیں۔ اپنی قومی زبان کا ہر اخبار اور جریدہ چیتھڑا۔ پھر اس پر اضافہ یہ ہے کہ اِکا دُکا سرپھروں، بہت سے مالکوں، ناشروں، مدیروں، مصنفوں اور عام پڑھنے والوں نے گھٹیا اور بڑھیا کی یہ تفریق قانونِ فطرت کی طرح قبول اور تسلیم بھی کر رکھی ہے۔ چنانچہ کسی پڑھنے والے کو ایک معقول معلوماتی رسالے کی طلب ہو تو کسی بدیسی تالیف ہی کی سُوجھے گی اور کوئی ناشر ایک بڑھیا اخبار یا رسالے کا سوچے تو انگریزی اخبار یا رسالے ہی کا منصوبہ بنائے گا۔ بالفرض کوئی صاحب کسی قومی زبان ہی میں اشاعتِ عالیہ کی فکر کریں تو بھی خواص ہی کی خریداری ذہن میں رکھیں گے اور یہ التزام کریں گے کہ یا تو اس اشاعت کے مندرجات عوام کے فہم سے بالا ہوں یا اس میں خواص کے مشاغل و تفریحات کے علاوہ کوئی قصہ نہ ہو۔ عوام کی زندگی، ان کے مسائل، ان کے دُکھ درد اور ہنسی کھیل کی کوئی جھلک اس میں نظر نہ آئے۔ اب شاید ہم اپنے ابتدائی سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ ''لیل و نہار'' کے موجودہ صورت میں اجرا کا ایک مقصد اُس تشنگی کی تسکین ہے جو ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے ہم نے خود کئی بار محسوس کی

ہے۔ روزانہ اخبارات کے مطالعے ہی سے ہر ذی شعور کے ذہن میں کئی سوالات مرتب ہوتے ہیں جن کا جواب ان روزناموں کے صفحات میں نہیں ملتا۔ علمی اور فنی حتیٰ کہ بہت سے سیاسی اور معاشی مباحث بھی عام روزناموں کے اوراق میں نہیں سما سکتے۔ علمی اور ادبی مجلّے عام طور پر بہت محدود اور خصوصی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ہمارے مروجہ ہفت روزہ پرچے صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے نقشِ دگر طراز دہ کے تقاضائی ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہاں، اپنی زبان میں اسی نوع کے بدیسی رسائل کا کوئی بدل پیدا ہو جس کی وساطت سے محض جگ بیتی کے بجائے آپ بیتی کا کچھ حصہ بھی اہلِ وطن کے ذہن نشین ہو سکے۔ ہمارے ذرائع اور صلاحیتیں محدود ہیں اور یہ نقشِ اوّل — اس ابتدائی تجربے کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ہمیں پورا احساس ہے — ان خامیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے مزید توقف کے بجائے ہم نے اپنے قارئین کی امدادِ مشورت پہ بھروسا کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ شماروں میں ہم طباعت اور مندرجات دونوں کے معیار کو حسبِ خاطر بہتر کر سکیں گے۔

پہلا حصہ............جمہوری دور

(جنوری ۱۹۵۷ء......اکتوبر ۱۹۵۸ء)

صفحہ نمبر ۲۱ سے ۲۴۰ تک

آزادی کی حفاظت

مملکتِ پاکستان کو قائم ہوئے دس سال گزر چکے ہیں اور آج جب کہ ہم اس متاعِ عزیز کی گیارھویں سالگرہ منا رہے تھے ہمیں سب سے پہلے ان ہزاروں لاکھوں جاں بازانِ وطن اور مجاہدینِ حرّیت کے قدموں پر محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے ہیں جنہوں نے کشتِ آزادی کو اپنے خون سے سینچا اور جن کی قربانیوں اور سرفروشیوں کی بدولت آج ہم دنیا میں سرخرو اور سربلند ہیں۔

مطالبۂ پاکستان کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہم آزاد فضا میں آزادی کا سانس لیں۔ غلامی کی جوئے کم آب کو زندگی کے بحرِ بیکراں میں بدلیں اور اس خطۂ ارض کو اپنی مرضی کے مطابق بنائیں اور سنواریں۔ قومی تعمیر اور ملی تشکیل کے لیے دس سال کی مدت گو بہت مختصر مدت ہے مگر اتنی مختصر بھی نہیں کہ ظفرمندیوں اور محرومیوں کا جائزہ نہ لیا جا سکے اور قومی رجحانات اور تحریکات کی نوعیت متعین کرنا ناممکن ہو۔

قائدِ اعظم کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ سیاسی آزادی قومی اور شخصی آزادی کا فقط ایک جز ہے اور تحفظِ آزادی کی ذمہ داریاں حصولِ آزادی کے فرائض سے کم اہمیت نہیں رکھتیں لیکن قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد آزادی کے اس جامع تصور کے نقوش آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے گئے۔ سیاسی آزادی ہی کو بنیادی حقیقت سمجھ لیا گیا اور معاشرتی اور شخصی آزادی کی طرف سے توجہ

ہٹ گئی حالانکہ سیاسی آزادی تو شخصی اور معاشرتی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، سیاسی آزادی اس لیے حاصل کی جاتی ہے کہ معاشرے کے مزاج اور کردار کو قومی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے اور آزادی کی صحت مند روایتیں قائم کی جائیں۔

قومی آزادی کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان اقدار کا جائزہ لیا جاتا جو انگریزی اقتدار سے ہمیں ورثے میں ملی تھیں اور نظم و نسق کے تمام پہلوؤں کی جانچ کی جاتی جن کا ڈھانچہ انگریزوں نے ایک خاص مقصد سے بنایا تھا۔ نوکر شاہی کی روایات انہیں کی قائم کردہ تھیں۔ قوانینِ مملکت انہیں کے وضع کردہ تھے، تعلیم کا نصاب انہیں کا تیار کردہ تھا اور فوج کی تنظیم انہیں کی مرتب کی ہوئی تھی۔ عبوری دور میں ان قوانین سے مفر نہ تھا لیکن عبوری دور گزر جانے کے بعد آج بھی مملکت کے مختلف شعبوں پر غیر ملکی روایتوں کا اثر بدستور غالب ہے بلکہ شاید اس میں اور اضافہ ہوا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ قوانین وضوابط فقط اس بنا پر منسوخ کر دیے جائیں کہ ان کے وضع کرنے والے فرنگی آقا تھے لیکن ان کا جائزہ تو لیا جاسکتا تھا تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ان سے غلامی کی بُو آتی ہے یا نہیں۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ دس سال کی آزادی کے بعد آج بھی ہمارے سوچنے کا انداز اور ہمارا نقطہ نظر غیر ملکی اثرات کے تابع ہے۔ ہمارے جسم آزاد ہوں تو ہوں ہماری روح ہنوز اسیر ہے۔

گزشتہ دس سال میں ہمارے ملک نے زندگی کے بعض شعبوں میں یقیناً ترقی کی ہے، بہت سے کارخانے قائم ہوئے ہیں، کئی صنعتوں میں ہم قریب قریب خود کفیل ہو چکے ہیں لیکن اس ترقی کے باوجود عام شکایت یہی ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ خوراک، تعلیم رہائش، روزگار اور حفظانِ صحت کے مسائل روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں، اشیائے صرف برابر مہنگی ہوتی جاتی ہیں اور لوگوں کی قوتِ خرید گھٹتی جاتی ہے اس کی وجہ سے ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑھ رہی ہے جو مملکت کے تحفظ واستحکام کے لیے مضرت کا باعث بن سکتی ہے۔ سیاسی آزادی معاشی آزادی کے بغیر نامکمل ہی نہیں ملک کے لیے نقصان دہ بھی ہے— بلاشبہ گزشتہ دس سال کا سب سے بڑا کارنامہ جمہوری آئین کا نفاذ تھا۔ اس آئین سے گو شخصی آزادی اور جمہوریت کے تمام تقاضے پورے نہیں ہوتے لیکن آئین سے پیشتر شخصی آزادی کو جو خطرات لاحق تھے اب رفع ہو چکے ہیں۔ ابتدا میں بعض صاحب ثروت لوگوں نے قوم کو شخصی آزادی کے پیدائشی حق سے محروم کر کے اپنی شخصی مطلق العنانی کا ریت محل تعمیر کرنا چاہا تھا لیکن

انہیں ناکامی ہوئی۔ بعض سیفٹی ایکٹ منسوخ ہو چکے ہیں، بعضوں کو ہماری عدالت ہائے عالیہ نے آئین کے منافی قرار دے دیا۔ باقی ماندہ کے استعمال میں بھی اب وہ فیاضی نہیں دکھائی جاتی جو چند سال پیشتر تک بہت عام تھی مگر شخصی آزادی میں اس وسعت کے باوجود پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندے اپنا حق رائے دہندگی — جو تمام شہری حقوق کا سرچشمہ ہے — دس سال میں ایک بار بھی استعمال نہیں کر سکے ہیں۔

ہمارے بعض مقتدر عناصر گزشتہ کئی سال سے ملک میں ایک خاص ذہنیت کو رواج دینے کے درپے ہیں۔ وہ ہم پاکستانیوں کے دلوں میں یہ بٹھانا چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت کی سرپرستی قبول کیے بغیر ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور ہم ایک دن زندہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ ''حقیقت پسندانہ'' مشورہ اُن پاکستانیوں کو دیا جا رہا ہے جنہوں نے ابھی دس سال گزرے بلا ہتھیار اٹھائے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت سے اپنی آزادی کا حق منوالیا تھا۔ ہم امداد کے ہرگز مخالف نہیں لیکن جن شرائط پر اور جس قیمت پر ہمیں یہ امداد مل رہی ہے اس پر تو وزیرِ خارجہ اور وزیرِ مال بھی اب دبے لفظوں میں اعتراض کر رہے ہیں اور ان کا بھی خیال ہے کہ اس امداد سے ملک کی آزادی دوسروں کی پابند ہوئی جا رہی ہے۔ قومی خودداری کا تقاضا تھا کہ قوم میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار کیا جاتا اور ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی مدد آپ کرنے کی تلقین کی جاتی لیکن اس کے برعکس ہم میں احساسِ کمتری پیدا کیا جا رہا ہے۔ ہم نے آزادی اس لیے تو نہیں حاصل کی تھی کہ تمام عمر غیروں کے محتاج اور دستِ نگر رہیں۔ اگر آٹھ کروڑ کی آبادی لاانتہا زرعی اور معدنی ذخائر کے باوجود ہم دوسروں کی سرپرستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو پھر آزاد پاکستان میں آزادی کا استحکام کیسے ممکن ہے؟

آزادی خواہ وہ قومی ہو یا معاشرتی اور شخصی کوئی ایسی شے نہیں جسے ایک بار حاصل کرنے کے بعد اس کی طرف بے فکری اختیار کر لی جائے۔ آزادی کی حدیں برابر وسیع ہوتی جاتی ہیں۔ اسی لحاظ سے اس کے تحفظ کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ کام فقط حکومت کا نہیں بلکہ قوم کے تمام باشندوں کا مشترکہ فرض ہے کہ وہ اس کی بقا تحفظ و ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں اور ایسے عناصر کو ابھرنے نہ دیں جو اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد کی خاطر وطن کی آزادی اور خودمختاری دوسروں کو سونپ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

۱۱ اگست ۱۹۵۷ء

قائدِ اعظم کے بعد قوم پر کیا گزری

یہی دن تھے جب قائدِ اعظم محمد علی جناح ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے تھے۔ اس نو سال کی مختصر مدت میں ہمارے مقتدر رہ نماؤں نے ملک و ملت کی خدمت کچھ اس انداز سے کی ہے کہ اگر قائدِ اعظم دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ سکیں کہ یہ وہی پاکستان ہے جس کا وعدہ انہوں نے مسلمانوں سے کیا تھا اور جس کی خوش حالی اور بہبودی اس عظیم شخصیت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

قائدِ اعظم تمام عمر چند بنیادی اصولوں اور بنیادی قدروں کی خاطر جدوجہد کرتے رہے—انگریزوں سے ان کا اختلاف اسی بنا پر تھا اور کانگریس سے ان کی ٹکر اسی وجہ سے تھی— سچ تو یہ ہے کہ یہ اصول اور قدریں ان کے کردار کا جز بن گئی تھیں۔ مصلحت کے تقاضے انہیں اپنے نصب العین سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹا نہ سکتے تھے اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے مقابلے میں وہ کبھی خوف اور جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی ضرب المثل جرأت و بے باکی اسی اصول پرستی کا پرتو تھی اور ان کی خود اعتمادی اور صاف گوئی اسی فلسفۂ حیات کا عکس۔ قائدِ اعظم نے جس وقت پاکستان کا نعرہ بلند کیا تھا تو اپنے اور بے گانے دونوں نے ان کی اس ''دیوانگی'' کا مذاق اُڑایا تھا۔ ان کو ''حقیقت پسند'' بننے کا مشورہ دیا تھا اور انگریزوں کی طاقت کو ہوّا بنا کر پیش کیا تھا لیکن قائدِ اعظم نے دنیا کو دکھا دیا کہ آخری فتح اصول پر قائم رہنے والوں کی ہوتی ہے اور بڑی سے بڑی قوت کو بھی سچے نصب العین پر چلنے والوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ آج یہی ''حقیقت

پسند'' حضرات قوم کے نصب العین کو مصلحت اندیشیوں پر قربان کر رہے ہیں اور قوم میں خوف و ہراس اور احساسِ کمتری پیدا کر کے پاکستان کو اغیار کا خیمہ بردار بنا رہے ہیں۔ قائدِ اعظم بھیک مانگنے کو قومی غیرت اور خودداری کی توہین خیال کرتے تھے لیکن آج یہ گداگری ہماری قومی سیرت بنتی جا رہی ہے۔ کتنی دور نکل آئے ہم قائدِ اعظم کی منزل سے ـــ!

قائدِ اعظم کے بدترین دشمن بھی ان کی دیانت کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جاہ و منصب اور دولت و عزت کا بڑے سے بڑا لالچ بھی قائدِ اعظم کے پائے ثبات میں لغزش نہیں لا سکتا اور نہ انہیں کسی قیمت پر خریدا جا سکتا۔ وہ کون سی آزمائش تھی جس میں انہیں مبتلا کرنے کی سعی نہ کی گئی لیکن قائدِ اعظم بکاؤ مال نہ تھے۔ انہیں سودے بازی اور درباری سازش سے بھی فطری نفرت تھی۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور جو کچھ کرنا ہوتا برسرِ عام کرتے۔ قائدِ اعظم کی پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں خفیہ باب کوئی نہیں۔ البتہ ان کی تقلید کا دعویٰ کرنے والی مقتدر ہستیاں ذرا اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں تو انہیں قائدِ اعظم کی طبعی استقامت اور اپنی منفعت بخش تلوّن مزاجی کا فرق صاف نظر آ جائے گا ـــ اس مہنگائی کے زمانے میں ضمیر کتنا سستا اور ایمان کی قیمت کتنی کم ہے ـــ برادرانِ یوسف اپنی وفاداریوں کو ٹھیکوں، لائسنسوں، پرمٹوں اور وزارتوں کے چند ٹکڑوں کے عوض فروخت کرتے ہوئے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتے۔ اب تو یہ بردہ فروشی قوم فروشی میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔

قوم و وطن اور ضمیر کا سودا کرنے والے قائدِ اعظم کے زمانے میں بھی تھے۔ انگریزوں نے انہیں یہی سکھایا تھا لیکن قائدِ اعظم نے ان کی پشت پناہی اور ہمّت افزائی کبھی نہ کی۔ پیروڈا کا قانون قائدِ اعظم کی ہدایت ہی پر بنا تھا اور ایک صوبے کے وزیرِ اعلیٰ کے خلاف قائدِ اعظم ہی نے تادیبی کارروائی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

قائدِ اعظم نے قوم کو ''اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم'' کا سبق دیا تھا۔ قائدِ اعظم کا یہ ارشاد سرکاری دفتروں میں آج بھی بڑی بڑی تختیوں پر لکھا ہوا نظر آئے گا لیکن ان دِنوں ''اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم'' کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ قائدِ اعظم نے فرمایا تھا کہ ''کسی ایک طبقے کو لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کی اجازت نہیں ہوگی۔ پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کو ترقی کے مساوی مواقع میسر ہوں گے۔ پاکستان، امیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوابوں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے نہیں بنایا گیا۔ یہ غریبوں کا ملک ہے اور

اس پر غریبوں ہی کو حکومت کا حق ہے" مگر — قائدِ اعظم کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے —

یہ گزارشات اعتراض برائے اعتراض نہیں اور نہ کسی مخصوص گروہ یا طاقت کی تنقید مقصود ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ قائدِ اعظم کے یومِ وفات پر ہم سب — حکومت، سیاسی جماعتیں اور عام شہری — سنجیدگی سے غور کریں کہ کیا آج ہمارا مسلک اور طریقۂ کار وہی ہے جو قائدِ اعظم کا تھا اور کیا ہم قوم کو قائدِ اعظم کے بتائے ہوئے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ اگر ہم قائدِ اعظم کے کردار و عمل کو آج کے حالات میں لائق تقلید نہیں سمجھتے تو ہمیں صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر ہمیں یقین ہے کہ وہ بنیادی اصول اور جمہوری قدریں جن پر کاربند ہو کر قائدِ اعظم نے مسلمانوں کی رہ نمائی کی تھی آج بھی مفید ہیں تو پھر ہمیں اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا پڑے گا۔

۸ ستمبر ۱۹۵۷ء

جشنِ جمہوریہ

ہمارے ملک میں قدرت کا حُسن اسی موسم میں نکھرتا ہے۔ گلشن گلشن پھول کھلتے ہیں اور جنوں خیز ہوائیں چلتی ہیں اور کھیت لہلہاتے ہیں۔ انسان کے جسم میں خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے اور دل ہنسنے گانے اور گنگنانے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ یہی موسم بہار ہمارے یومِ جمہوریہ کا مژدہ بھی لاتا ہے۔ وطن کی محبت کہتی ہے آؤ سب مل کر جشن منائیں کہ آج جمہوریۂ پاکستان کی سالگرہ ہے۔ ہنسنا اور خوش ہونا، گانا اور گنگنانا کسے پسند نہیں مگر جب دل رو رہا ہو اور دماغ پریشانیوں سے پراگندہ ہو اور جسم مصائب کے بوجھ سے شل اور فضا اہلِ ہوس کی خود غرضیوں سے زہر آلود تو دُھومیں مچانے کا حوصلہ کیسے پیدا ہو۔

اس قومی تقریب سعید پر آلام و مصائب کا ماتم کرنا مناسب نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ سالِ گزشتہ کی مانند یومِ جمہوریہ اب کے بھی اپنے جلو میں وزارتی بحران ہی کا پرچم اُڑاتا آیا۔ گزشتہ سال گورمانی صاحب نے عین یومِ جمہوریہ کے موقع پر جمہوریت پر شب خون مارا تھا۔ اب کے مغربی پاکستان اسمبلی کے ارکان نے اوپر کے اشارے سے جمہوریت کے نازک و ناتواں پودے پر جو ضربیں لگائیں وہ اس شب خون پر بھی سبقت لے گئیں۔

سردار عبدالرشید کی برطرفی کی افواہیں تو کئی ہفتے سے سننے میں آ رہی تھیں مگر گزشتہ دس پندرہ دن میں واقعات نے بڑی ڈرامائی شکل اختیار کر لی۔ نواب مظفر علی خاں قزلباش منیلا میں امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس سے دیر تک ''تبادلۂ خیالات'' کر کے وطن واپس تشریف

لائے تو مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ بننے کی دیرینہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی۔ کرسیِ اقتدار کی جنگ شدت سے جاری تھی۔اسی اثنا میں اسمبلی کے دس ممبر ری پبلکن پارٹی سے نکل کر حزبِ اختلاف سے جاملے۔ مرکز کے وزیرِ امورِداخلہ نے جوکہ پارٹی کے ستون سمجھے جاتے تھے اچانک استعفیٰ دے دیا۔ رہی سہی کمی نیشنل عوامی پارٹی کے ارکان کی اکثریت نے پوری کر دی اور اپنی جماعت کے آئین و مسلک کو بالائے طاق رکھ کر مسلم لیگ سے ایک مضحکہ خیز سمجھوتہ کرلیا۔ ایسا سمجھوتہ جس کی قیمت اُس کاغذ سے بھی کم ہے جس پر دستخط ہوئے ہیں۔ ہوسِ اقتدار کی دوڑ میں مسلم لیگ بھی پیچھے نہ رہی۔ اس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو ترک کر کے مخلوط انتخاب کی حمایت منظور کر لی۔ سردار عبدالرشید نے استعفیٰ دے دیا۔نواب مظفر علی خاں قزلباش ان کی جگہ وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے اور وہ ری پبلکن ارکان جو مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے دوسرے ہی دن اپنی پرانی نشستوں پر واپس آ گئے۔

اس سارے تماشے میں جمہوری اصولوں، پارلیمانی روایتوں اور جماعتی اغراض و مقاصد کو پامال کرنے والی خود ہمارے ملک کی سیاسی جماعتیں تھیں اور جمہوریت کے ان دعوے داروں نے یہ سب کچھ ذاتی اغراض کی خاطر کیا ہے۔

ہم نے گزشتہ سال یومِ جمہوریہ کے موقع پر عرض کیا تھا کہ

> ’’آئے دن کا یہ سیاسی بحران اور وزارتوں کا یہ بننا بگڑنا کوئی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک نہایت سنگین عارضے کی علامت ہے وہ یہ کہ نئے آئین کے بعد بھی اربابِ حل و عقد ملک کے جمہوری تقاضوں کو پورا کرنے سے گریز کر رہے ہیں ــــ‘‘

اب کے حالات زیادہ ناگفتہ بہ ہیں۔ اس ایک سال میں ہم نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ترقیاں کی ہیں، جو کھویا، پایا اور سیکھا ہے اس کا جائزہ لینا تو ممکن نہیں البتہ ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ اس مدت میں جمہوری قدروں کو فروغ نہیں ہوا ہے۔ الیکشن ہنوز ایک وعدۂ فردا ہے۔رہ گئے ارکانِ اسمبلی سو ان کے ضمیر کی روشنیاں اور مدھم ہوئی ہیں۔سیاسی جماعتوں کی سازشوں اور سودے بازیوں کے بازار اور چمکے ہیں۔ مطلق العنانیوں اور بدنظمیوں میں اور اضافہ ہوا ہے اور لوگوں کی معاشی اُلجھنیں اور بڑھی ہیں۔ ذرا سوچیے کہ امیدوں کے چراغ جب یوں ایک ایک کر کے بجھتے جا رہے ہوں تو چراغاں کرنے کی خواہش کیسے اُبھرے اور مسرت کا جشن

کیسے منایا جائے۔

ابنائے وطن اگران صبر آزما حالات میں بھی یوم جمہوریہ کی عید مناتے ہیں تو یہ چیز ان کے جذبہ حب الوطنی پر دلالت کرتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو جمہوریت کتنی عزیز ہے۔ اقتدار کی بلندیوں پر بیٹھنے والے کاش پاکستانی عوام کے اس مقدس جذبے کا احترام کرسکتے، کاش انہیں عام لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء

یومِ انبساط و احتساب

ہمارا یومِ استقلال قوم کے لیے یومِ انبساط بھی ہے اور یومِ احتساب بھی — مانا کہ مصائب کے طوفان میں مسرتوں کے پھول نہیں کھلا کرتے اور نہ غمِ ایام کی تلخیوں سے مئے شیریں کے چشمے اُبلتے ہیں لیکن آزادی وہ نعمت ہے جسے سُود و زیاں کے پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ یہ وہ متاعِ بے بہا ہے جس پر دنیا کی تمام دولتیں اور آسائشیں نثار کی جاسکتیں ہیں کیونکہ آزادی کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ اس کا کوئی نعم البدل۔ لاکھ تکلیفیں سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہم کو غیر ملکی آقاؤں کی غلامی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی اور آج ہم اپنی قسمت کے آپ مالک ہیں — ہماری زندگی میں اس سے بڑھ کر خوشی کا لمحہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

لیکن خوشی کے اس مبارک موقع پر ہمیں اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ بھی کرنا چاہیے اور اُن فرائض اور ذمہ داریوں پر بھی غور کرنا چاہیے جو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ اس کے لیے غیر ملکی ماہرین کی کمیٹی یا تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت نہیں — کسی گاؤں، کسی قصبے، کسی بازار میں سے گزر جایئے، کسی چائے خانے، کسی کلب، کسی مدرسے، کسی شفا خانے، کسی گھر میں چند لمحوں کے لیے رُک جایئے، اتنی فرصت بھی نہ ہو تو کسی راہ چلتے سے پوچھ کر دیکھیے شکایتوں کا ایک دفتر ہے جو کھل جائے گا۔ آپ سنتے سنتے تنگ آجائیں گے وہ کہتے کہتے نہ تھکے گا۔ لطف یہ ہے کہ صدرِ مملکت سے لے کر گاؤں کے پٹواری تک ہر صاحبِ اختیار کو قوم کے درد و مصیبت کی اس داستان سے پوری پوری آگاہی ہے۔

چودہ اگست کی یہ مبارک تقریب ہم بارھویں بار منا رہے ہیں۔ اس مدت میں بچے جوان ہوگئے، جوانوں کے سر پر نقرئی بال چمکنے لگے اور ادھیڑ عمر والوں کو عاقبت کی فکر دامن گیر ہوگئی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بنیادی مقاصد ہنوز شرمندۂ تکمیل ہیں۔ خدا خدا کر کے آٹھ سال بعد آئین سازی کا مرحلہ طے ہوا تو عام انتخابات کی راہ میں رکاوٹیں پڑنے لگیں — تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور ملتوی کر دی جاتی ہیں۔ اس لیے کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ الیکشن کب ہوں گے اور ہوں گے بھی یا نہیں — لیکن آئین اور الیکشن سے قطعِ نظر اگر ہمارے نام نہاد نمائندگانِ قوم میں قوم کا ذرّہ برابر بھی درد ہوتا تو وہ اصلاح کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے مگر ہماری اسمبلیوں نے گزشتہ دس بارہ سال میں ملک کے بنیادی مسائل پر اپنے طبقاتی یا ذاتی مفاد سے بلند ہوکر شاید ہی کبھی قومی نقطہ نظر سے غور کیا ہو۔ اسمبلی کے اجلاس ہوتے ہیں تو آرڈیننسوں کی توثیق کے لیے یا پرانے مہروں کی جگہ نئے مہروں کو مسندِ اقتدار پر بٹھانے کے لیے۔ آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہوگا کہ اسمبلی کا اجلاس مہنگائی اور نفع خوری یا تعلیم اور حفظانِ صحت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے بلایا گیا ہو۔

چودہ اگست کو ایوانِ اقتدار سے قوم کے نام لمبے چوڑے پیغامات نشر ہوں گے۔ قوم کو صبر و تحمل کا مشورہ دیا جائے گا، اتحاد و ایمان کی تلقین کی جائے گی، بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے خبردار کیا جائے گا، نفع خوروں کو عبرت ناک سزاؤں کی دھمکی دی جائے گی، الیکشن کا مژدہ سنایا جائے گا اور ہم ممنون ہوں گے کہ ہمارے آقاؤں نے ہمیں یاد تو کیا۔ اپنے گوناگوں مشاغل میں انہیں ہمارا خیال تو آیا لیکن اس کا کیا علاج کہ ان پیغامات سے نہ قوم کی قوتِ عمل بیدار ہوتی ہے نہ اس کا پیٹ بھرتا ہے اور نہ اُس بددلی اور بے چینی میں کمی آتی ہے جو رفتہ رفتہ نفرت اور غصے کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ لوگ چودہ اگست کو اگر خوشیاں مناتے ہیں تو اپنے وطن کی آزادی پر نہ کہ اربابِ اختیار کے بارہ سالہ کارناموں پر۔ ان کارناموں کی اصل حقیقت معلوم کرنی ہو تو کسی گاؤں، کسی قصبے، کسی بازار، کسی چائے خانے، کسی کلب، کسی گھر، کسی راہگذر پر چند لمحوں کے لیے کھڑے ہوکر کسی شخص سے پوچھ کر دیکھیے شکایتوں کا ایک دفتر ہے جو کھل جائے گا۔ آپ سنتے سنتے تنگ آجائیں گے وہ کہتے کہتے نہ تھکے گا۔

چودہ اگست کو اب کے بھی حسبِ دستور وعدوں اور منصوبوں کے سبز باغ دکھائے جائیں گے لیکن قوم ان حضرات سے یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ گزشتہ بارہ سال میں آپ نے کتنے

وعدے پورے کیے، کتنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا، لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہوا، تعلیم میں کتنے فیصدی اضافہ ہوا، جمہوریت کو کتنا فروغ ہوا، اشیاء صرف کی چیزوں میں کے فیصدی کمی ہوئی، خوراک کی پیداوار کے فیصدی بڑھی اور ملک کے باہر ہمارا وقار کتنا اُونچا ہوا۔ اگر اربابِ مسند و جاہ کے پاس ان سوالوں کا معقول جواب نہیں ہے تو پھر ان کے پیغامات بے معنی اور ان کے وعدے مضحکہ خیز ہوں گے۔

۱۰ اگست ۱۹۵۸ء

قائدِ اعظم کے جانشین

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو ہم سے جدا ہوئے دس سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں قائدِ اعظم مرحوم کے جانشینوں نے مرحوم کی خواہشوں اور تمناؤں کا جس حد تک احترام کیا اور ان کے نصب العین اور لائحہ عمل کو اپنانے کی جتنی کوشش کی وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قائدِ اعظم بے حد آئین پسند اور قانونی مزاج رکھتے تھے اور اگر کوئی ان کے روبرو یہ کہنے کی جرأت کرتا کہ آپ کے بعد پاکستان دس سال تک ملکِ بے آئین رہے گا تو ان کو کبھی یقین نہ آتا۔ اقربا پروری اور دوست نوازی کی اصطلاحیں بھی ان کے لیے ہمیشہ اجنبی رہیں اور قوم کی دولت میں سے ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر صرف کرنا وہ حرام سمجھتے تھے اور اگر کوئی ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ کے بعد آپ کے جانشین اس حرام کو اپنے لیے نہ صرف حلال بلکہ واجب قرار دیں گے تو وہ اس بات کو ہرگز نہ مانتے۔ اگر کسی سر پر غرور سے یہ صدا بلند ہوتی کہ مجھے اپنے یونینسٹ ماضی پر فخر ہے تو وہ عمر بھر اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوتے اور اگر کسی نے یہ خطرہ ظاہر کیا ہوتا کہ آپ کے بعد اقتدار کی کرسی پر انگریزوں کے نمک خوارانِ ازلی براجمان ہوں گے تو شاید وہ یہ وصیت کر جاتے کہ سول سروس کے لوگوں کو پارلیمانی عہدوں کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ مگر افسوس کہ موت نے انہیں اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع قمع کرتے اور آج عالم یہ ہے کہ اُلٹے ان کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا سر بازار خون ہو رہا ہے اور اس دعوے کے ساتھ کہ یہ سب کچھ قائدِ اعظم کی مرضی اور منشا کے عین

مطابق ہے۔

مگر ہمیں برطانیہ کے نمک خوارانِ ازلی سے نہ گلہ ہے اور نہ شکوہ کیوں کہ ہمیں ان سے خدمتِ خلق کی توقع نہ پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ دولت و اقتدار کا حصول ان کا مذہب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔عوام اور ان کے مسائل سے انہیں نہ پہلے کبھی ہمدردی اور دلچسپی تھی اور نہ اب ہے۔ البتہ ہمیں اُن رہنمایانِ ملت سے ضرور کچھ عرض کرنا ہے جنہوں نے قائدِ اعظم کی آنکھیں دیکھی ہیں۔تحریکِ پاکستان میں قائدِ اعظم کا ساتھ دیا ہے، ان کی صحبت میں بیٹھے ہیں، ان کے مزاج اور اندازِ فکر سے واقف ہیں،ان کی پسند اور ناپسند کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔اور آج بھی یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ قائدِ اعظم کے جائز جانشین دراصل وہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں کہ قائدِ اعظم ہم سے رخصت ہو چکے ہیں کیا ان حضرات نے اپنے کسی ایک فعل یا عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ واقعی قائدِ اعظم کی جانشینی کے مستحق ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو آٹھ سال تک مرکز اور صوبوں میں بلاشرکتِ غیرے حکومت کر چکے ہیں۔ اس درمیان میں سینکڑوں ایسے مواقع آئے جب وہ اپنے قول کو اپنے عمل سے ثابت کر سکتے تھے لیکن اپنے دورِ اقتدار میں انہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ اپنے کردار و عمل کا موازنہ قائدِ اعظم کے کردار و عمل سے کیا جائے۔۔۔ آج اقتدار سے محروم ہوجانے کے بعد کیسے کیسے انقلابی نعرے لگا رہے ہیں یہ حضرات۔۔۔اور اگر یہی نعرے ان کے دورِ حکمرانی میں لگائے جاتے تو نہ یہ نعرے باقی رہتے اور نہ نعرے لگانے والے۔ چنانچہ سیفٹی ایکٹ،سیکورٹی ایکٹ، بنگال ریگولیشن اور فرنٹیر کرائمز ریگولیشن وغیرہ کا بے دریغ استعمال ہمیں اب تک یاد ہے۔آج یہ شیرانِ قالین حصولِ کشمیر کے لیے جہاد کی تلقین کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کبھی یہ اعلان نہ کیا۔ وہ جاگیروں اور بڑی زمینداریوں کو ختم کرنے اور املاک پر پابندی لگانے کی باتیں بڑی ڈھٹائی سے کر رہے ہیں مگر یہ جاگیریں اور زمینداریاں تو پہلے بھی موجود تھیں پھر اس وقت ان کو کیوں نہ ختم کیا گیا جب طاقت ہاتھ میں تھی۔ ان حضرات کی منافقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پبلک جلسوں میں تو جاگیروں اور زمینداریوں کو ختم کرنے کا نعرہ لگا کر پبلک سے داد وصول کی جاتی ہے لیکن ڈھاکہ میں جب پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اسی قسم کی تجویز پیش ہوتی ہے تو اس کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔آج ملک فیروز خان نون کو فقط اس بنا پر غدار اور قوم فروش کا لقب دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان سے پُر امن سمجھوتے کے حق میں ہیں مگر شاید اِن حضرات کو

یاد نہیں رہا کہ یہی گناہ مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے وزیرِ اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ سے ۱۹۵۳ء میں سرزد ہو چکا ہے۔ انہوں نے تو پنڈت نہرو جیسے کافر کو "بڑا بھائی" تک کہہ دیا تھا لیکن اس وقت سرحد کے سابق مردِ آہن اور حال مردِ انقلاب کی رگِ حمیت نہ پھڑکی اور وہ بدستور مرکزی وزارت میں شامل رہے۔ آج جب کہ عام انتخابات کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے یہ حضرات دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر انتخاب ملتوی ہوئے تو ملک میں خون کی ندی بہہ جائے گی حالانکہ ان بزرگوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ عام انتخابات تو درکنار انہوں نے ملک کو آٹھ سال تک آئین ہی سے محروم رکھا۔

قائدِ اعظم کو منافقت اور عیاری سے جتنی نفرت تھی شاید کسی اور چیز سے نہ تھی لیکن آج ان کی جانشینی کا دعویٰ کرنے والوں نے منافقت اور عیاری ہی کو اپنا شعار بنالیا ہے اور وہ دن پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے یقیناً دورِ ابتلا کے آغاز کا دن ہوگا جس دن ان حضرات کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوگا کیونکہ جس طرح انہوں نے اس سے پیش تر آٹھ سال تک قائدِ اعظم کا نام لے لے کر ان کی خواہشوں اور آرزوؤں کا خون کیا اسی طرح وہ دوبارہ کریں گے۔

۷ ستمبر ۱۹۵۸ء

سیاسی ثقافت

نئی سیاسی تنظیم

ڈھاکہ میں مولانا بھاشانی کی دعوت پر جو سیاسی اجتماع ہو رہا ہے یہ سطور اس کے اختتام سے قبل لکھی جا رہی ہیں۔ دمِ تحریر اس اجتماع کے فیصلوں اور نتائج کا تفصیلی جائزہ تو ممکن نہیں لیکن قرائن سے یہ ضرور واضح ہے کہ اس تقریب میں ایک نئی سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جائے گی۔ اس تنظیم میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی اُن سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی شرکت کا امکان ہے جو بعض بنیادی، داخلی اور خارجی مسائل کے بارے میں ہم مسلک اور ہم خیال ہیں۔ اس مکتبِ خیال کے عقاید و آرا سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں کی مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک متحدہ باشعور اور بااصول سیاسی تنظیم کی پیدائش سے ہماری سیاسی زندگی میں مفید اور دوررس نتائج پیدا ہوں گے۔

اس ضمن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کسی نئی سیاسی تنظیم یا جماعت کی ضرورت اور گنجائش بھی ہے کہ نہیں؟ کرشک سرمک پارٹی کے رہنما جناب حمید الحق چودھری ایک تازہ بیان میں فرماتے ہیں کہ پاکستان میں کسی نئی سیاسی جماعت کا ظہور قطعی ناپسندیدہ ہے بلکہ ہمیں موجودہ سیاسی جماعتوں کی تعداد کم کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔ ان کی رائے میں ہماری سیاسی ابتری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہمارے ہاں رنگ رنگ کی سیاسی جماعتوں اور بھانت بھانت کی سیاسی بولیوں کی بھرمار ہے۔ چودھری صاحب کے بیان میں بین السطور دو اشارے

ہیں۔ اوّل یہ کہ مولانا بھاشانی اور ان کے ہم خیالوں کو ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل سے باز رہنا چاہیے، دوم یہ کہ موجودہ سیاسی جماعتوں، یعنی مسلم لیگ، ری پبلکن پارٹی، کرشک سرک پارٹی، عوامی لیگ وغیرہ کو یکجا ہو کر سیاسی اقتدار پر اپنا تسلط مستحکم کر لینا چاہیے۔

ان ارشادات کے مقصد اور مفہوم سے قطع نظر کیا ہمارے ہاں سیاسی جماعتوں کی واقعی اتنی کثرت ہے کہ اس کے باعث ہماری سیاست آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے؟ کیا پاکستان میں واقعی مزید سیاسی تنظیم کی گنجائش نہیں؟ ذرا غور کیجیے تو حقیقت اس سے مختلف دکھائی دے گی۔ اوّل تو یہی دیکھیے کہ پاکستان میں ایک بھی سیاسی جماعت یا تنظیم ایسی نہیں جو ملک کے دونوں حصوں میں مشترک ہو یا مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہم خیال شہریوں کی نمائندگی کر سکے۔ کسی زمانے میں یادش بخیر مسلم لیگ کو یہ حیثیت ضرور حاصل تھی لیکن اس جماعت کے زعمانے شرق و غرب میں دوستی اور یگانگت کے رشتے استوار کرنے کے بجائے ذاتی اور علاقائی دھڑے بندیوں کو اپنا شعار بنا لیا، نتیجہ یہ کہ جماعت کا نام رہ گیا تنظیم نابود ہو گئی۔

مسلم لیگ کے زوال کے بعد عوامی لیگ کو فروغ ہوا تو لوگ اس جماعت سے ایک با اصول ملک گیر سیاسی تنظیم کی توقع کرنے لگے لیکن حصولِ اقتدار کے چند ہی دن بعد حکومت میں عوامی لیگ کے سربراہ جناب حسین شہید سہروردی اور ان کے جماعتی کارکنوں میں من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید۔ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مغربی پاکستان میں جناب سہروردی کے چند ذاتی مداحوں کے علاوہ عوامی لیگ کا کوئی نام لیوا نہ رہا اور مشرقی پاکستان کے عوامی لیگی حلقوں میں آج کل افراتفری کا عالم ہے۔ دریں حالات جبکہ ملک کے دونوں حصوں میں ایک بھی متحدہ سیاسی تنظیم موجود نہیں یہ کہنا واضح طور پر غلط ہے کہ پاکستان میں مزید سیاسی تنظیم مضر یا بے سود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی متعدد سیاسی جماعتیں ایسی ہیں جن کے افراد مختلف ضرور ہیں لیکن ان کے سیاسی خدوخال میں تمیز کرنا آسان نہیں، اصل میں ان جماعتوں کو، سیاسی جماعتیں کہنا ہی غلط ہے۔ چند افراد مل کر اپنے گروہ کا کوئی سیاسی نام رکھ لیں تو اس لفظی ایجاد سے کوئی جماعت سیاسی نہیں بن جاتی۔ سیاسی جماعت کی تعمیر، سیاسی تنظیم کی بنیاد پر ہوتی ہے اور سیاسی تنظیم کا نقشہ، سیاسی اصول و عقاید، سیاسی پروگرام اور حکمتِ عملی کے مطابق وضع کیا جاتا ہے۔ یہ تعریف پیشِ نظر رکھی جائے تو ہماری بیشتر سیاسی گروہ بندیاں جنھیں وزارت سازی اور وزارت شکنی کے علاوہ کام نہیں سیاسی جماعتوں کے زُمرے سے خارج ہو جاتی ہیں۔ مسلم لیگ،

ری پبلکن پارٹی، کرشک سرمک پارٹی اور حصولِ وزارت سے بعد کی عوامی لیگ، کیا ہم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کے سیاسی اعمال و کردار میں کیا فرق ہے۔ وہ داخلی اور خارجی مسائل کے بارے میں (مخلوط اور جداگانہ طریق انتخاب کے واحد مسئلے کے علاوہ) ان کے مسالک ایک دوسرے سے کیسے مختلف ہیں؟ اس صورت میں یہ کہنا کہ پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی بھرمار ہے قطعی صحیح نہیں۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ ہمارے ہاں ذاتی اور علاقائی جتھوں، ٹولیوں اور دھڑوں کی بھرمار ہے جنہوں نے اپنے کو مختلف سیاسی نام دے رکھے ہیں۔ ہماری سیاسی زندگی کا اوّلین تقاضا یہی ہے کہ اِن کے بجائے یہاں بااصول سیاسی جماعتیں منظم ہوں جن کا مقصود محض حصولِ جاہ و اقتدار سے مختلف اور جن کا حلقۂ کار اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ایوانوں اور ذی اثر امرا کے محلات سے وسیع تر ہو، اِن کے مقاصد واضح، اِن کا رخ متعین، اِن کے عقاید مستقل ہنگامی مصلحتوں سے بالا ہوں، یوں ہو سکے تو ہماری سیاسی فضا کا بہت سا گرد و غبار چھٹ جائے گا۔ شخصی اور درباری اجارے مٹ جائیں گے۔ عوام اپنے مفاد اور عقیدے کی رعایت سے سیاسی طور پر متحد ہو سکیں گے اور خواص ہر رُت کے ساتھ رنگ بدلنا چھوڑ دیں گے۔

اغلب ہے کہ ڈھاکہ میں ایک پُرخلوص سیاسی تنظیم کا قیام اس منزل کی جانب پہلا قدم ہوگا۔ اس اعتبار سے جملہ اختلافات کے باوجود اس تحریک کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

۲۸ جولائی ۱۹۵۷ء

نازک پودا

جن لوگوں کو لندن جانے کا اتفاق ہوا ہے انہوں نے ہائیڈ پارک میں آزادیٔ تقریر کے چند مضحکہ خیز مناظر دیکھے ہوں گے۔ کوئی سر پھرا مقرر اسٹول پر کھڑا شاہی خاندان کو برا بھلا کہہ رہا ہے، کوئی وزیر اعظم کے بخیے ادھیڑ رہا ہے، کوئی جمہوریت کی مخالفت میں دُھنواں دھار تقریر کر رہا ہے، کوئی حضرت مسیح کے ظہور کی بشارت دے رہا ہے، کوئی مذہب کے حق میں بول رہا ہے، کوئی مذہب کے خلاف زہر اُگل رہا ہے۔ غرض جس کے جو دل میں آتا ہے کہتا ہے اور تماشائی خاموشی سے سنتے ہیں۔ بات ناگوار ہوئی تو دوسرے مقرر کے مجمع میں شریک ہو گئے لیکن شدید اختلاف کے باوجود نہ کوئی شخص کسی کا جلسہ توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ کسی کا سر زخمی ہوتا ہے۔

ہائیڈ پارک کے اندر آزادیٔ تقریر کے یہ مناظر نہ تو مثالی ہیں اور نہ ہر جگہ ان کا رواج پایا جاتا ہے البتہ ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر مخالف گروہ یا جماعت تھوڑا ضبط و تحمل سے کام لے اور دوسروں کے جذبات کو اپنے جذبات کی مانند قابلِ احترام تصور کرتے ہوئے رواداری برتے تو معاشرے میں اِن دنوں جو تلخیاں اور نفرتیں بڑھ رہی ہیں وہ بہت کم ہو جائیں۔ حیدرآباد میں وزیر اعظم سہروردی تقریر کرتے ہیں تو مخالف جماعت کے لوگ ہلڑ بازی اور شور وغل کر کے ان کے جلسے کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ حکومت کی مخالف جماعت کراچی میں جلسہ کرتی ہے تو حکمراں جماعت کے لوگ جلسے میں خلل ڈال دیتے ہیں۔ ڈھاکہ میں جمہوری کنونشن ہوتا ہے تو اس پر

غنڈوں کی مدد سے پتھراؤ کیا جاتا ہے اور اب تو سیاسی مخالفین کو قتل کرنے کے منصوبے بھی منظرِ عام پر آنے لگے ہیں۔

ہمارا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہے۔ ہم نے بارہا مسٹر سہروردی کی داخلی اور خارجی پالیسی پر سخت لفظوں میں اعتراض کیا ہے لیکن ہمارا ایقان ہے کہ مسٹر سہروردی کا یہ جمہوری حق ہے کہ وہ نہایت آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں۔ اسی طرح ملک کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا پورا پورا حق ہے کہ وہ آئین کی حدود میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی فرد یا جماعت دوسرے فرد یا جماعت کی سرگرمیوں کو ملک وملت کے لیے مضر سمجھے۔ ایسی صورت میں اسے یہ حق ہے کہ وہ قوم کو ملک وملت کے ان دشمنوں کی سرگرمیوں سے آگاہ کر دے لیکن دونوں فریق میں سے کسی کو — جمہوری نظام میں — یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنے مخالف کی زبان پر تالے لگا دے۔ اس کے جلسوں میں خلل ڈالے، اس کے خلاف غنڈے استعمال کرے یا اسے قتل کر دے۔

جمہوریت کی روایت ایک دو دن میں نہیں بنتی اور نہ دنیا کا کوئی قانون اسے بہ یک جنبشِ قلم رائج کرسکتا ہے۔ جمہوری روایت تو برسوں کی محنت مشقت سے قائم ہوتی ہے۔ بہت پتا مارنا پڑتا ہے اس کی خاطر۔ اپنی ذاتی خواہشوں کو دبانا پڑتا ہے، اپنی ذاتی پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں سے درگذر کرنا پڑتا ہے تب کہیں جمہوری قدروں اور اصولوں کو فروغ ہوتا ہے۔ جذباتیت جمہوریت کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔ جو قوم جذباتیت کے جال میں اُلجھی وہ جمہوریت پسند کبھی نہیں ہوسکتی۔

بعض جماعتیں جب تک اقلیت میں رہتی ہیں شخصی آزادی کی بڑی زور شور سے حمایت کرتی ہیں۔ جمہوریت کا واسطہ دیا جاتا ہے، اپیلوں پر دستخط کرائے جاتے ہیں اور آزادئ تقریر و تحریر کے حق میں مقالے لکھے جاتے ہیں لیکن یوں ہی ان کا پلہ بھاری ہوگیا یا وہ خطرے کی زد سے نکل گئیں اور نزلہ کسی دوسرے عضوِ ضعیف پر گرنے لگا تو ساری اصول پرستی بھلا دی جاتی ہے اور مخالف گروہ پر جو تشدد ہوتا ہے اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک جمہوری قدر اپنے لیے ہوتی ہے اور دوسری مخالف جماعتوں کے لیے۔ جمہوری روایتوں کے فروغ کے لیے دراصل ہماری سیاسی جماعتوں کا یہ منافقانہ طرزِ عمل سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ملک کی تمام

سیاسی جماعتوں کو سوچنا چاہیے کہ جمہوری روایتوں اور شخصی آزادی کے دشمن سب کے دشمن ہیں۔ آج اگر ان کے حملوں کا رُخ کسی مخصوص گروہ یا جماعت کی جانب ہے تو کل اس جماعت کو ختم کر کے وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کریں گے۔

۱۵ستمبر ۱۹۵۷ء

مرکزی وزارت کا قضیہ

ہمارے ریاستی نظام کی بنیاد برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت پر قائم ہے۔ پارلیمانی جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ کی امانت — اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ ملک کے باشندے ہوتے ہیں — پارلیمنٹ کے سپرد ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب ملک کی بالغ آبادی کی رائے سے ایک متعینہ مدت کے لیے کیا جاتا ہے اور جس فرد کو پارلیمنٹ کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا ہے عنانِ حکومت اس کے حوالے کردی جاتی ہے۔ یہ شخص اپنے ہر فعل کے لیے پارلیمنٹ کے روبرو جواب دہ ہوتا ہے۔ ریاست کے سربراہ کا کام (خواہ وہ موروثی تاجدار ہو یا منتخب شدہ صدر) آئین کا تحفظ کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ریاست کے عناصرِ ثلاثہ — مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ — آئین کے مطابق عمل کررہے ہیں یا نہیں۔ صدرِ مملکت کسی جماعت یا گروہ کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ جماعتوں کے باہمی مناقشات میں بالکل غیر جانبدار ہوتا ہے۔

گزشتہ دس سال میں اربابِ اقتدار کی جانب سے بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا راج ہے لیکن جب کبھی اس قول کو فعل کی کسوٹی پر پرکھنے کا وقت آیا ہے تو تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کے انتقال کے بعد سے اب تک مرکزی حکومتیں پانچ بار بدلی جاچکی ہیں لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ تبدیلی ملکی پارلیمنٹ کی مرضی سے ہوئی ہو۔ مانا کہ ہماری پارلیمنٹ ملک کے آٹھ کروڑ باشندوں کی صحیح نمائندہ نہیں ہے لیکن بہرصورت پارلیمنٹ ہے اور کسی ایک فرد سے خواہ وہ کتنا ہی دانا و تجربہ کار

کیوں نہ ہو قوم کی بہتر مزاج شناس اور نمائندہ ہے اس لیے پارلیمانی روایت کا تقاضہ یہی تھا کہ ہر بار وزیرِ اعظم کو علیحدہ کرنے سے پیشتر پارلیمنٹ کی مرضی معلوم کر لی جاتی۔ جہاں مرکزی وزارتوں کا یہ حشر ہو، وہاں صوبائی وزارتوں کو کون خاطر میں لاتا چنانچہ صوبائی گورنروں نے ایک نہیں متعدد بار صوبائی وزارتوں کو بیک جنبشِ قلم برطرف کیا اور یہ عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہ کی کہ انہیں صوبائی اسمبلوں کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک یونٹ سے پیش تر میاں مشتاق احمد گورمانی نے ملک فیروز خاں نون کی وزارت کو اسی طرح برطرف کیا تھا۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد توقع تھی کہ پارلیمانی جمہوریت کی کوئی بہتر روایت قائم ہوگی لیکن گزشتہ مئی میں میاں مشتاق گورمانی نے مغربی پاکستان کی وزارت اور اسمبلی کو برطرف کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ توقعات عبث تھیں۔ حیرت ہے کہ وزیرِ اعظم حسین شہید سہروردی نے بھی جو آج پارلیمنٹ کے اعتماد کی باتیں کرتے ہیں اس وقت یہ نہ کہا کہ مغربی پاکستان اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسمبلی کی اکثریت کس کے ساتھ ہے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جو حربہ انہوں نے مئی میں مغربی پاکستان اسمبلی کے خلاف استعمال کیا تھا، ۱۱ر اکتوبر کو وہی حربہ ان کے خلاف استعمال کیا گیا۔

ہم نہ مسٹر سہروردی کے وکیل ہیں نہ مخالف۔ ان کے جس فعل کو ہم نے ملک اور جمہوریت کے لیے مفید سمجھا اس کی حمایت کی اور جس فعل کو مضر سمجھا اس کی مخالفت کی۔ اس لیے سوال ان کی ذات کا نہیں بلکہ چند بنیادی اصولوں کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر سہروردی جس مخلوط وزارت کے قائد تھے اس میں ان کی اپنی جماعت بڑی اقلیت میں تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں تھا اور اگر ان کی وزارت کا مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش ہوتا تو انہیں شکست ہو جاتی لیکن اس کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ انہیں وزارتِ عظمیٰ سے الگ کرنے کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا اس سے پارلیمانی جمہوریت کی روایتوں کو فروغ نہیں ہوتا۔ مسٹر سہروردی نے صدرِ مملکت کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ۲۴ اکتوبر کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایوان کی اکثریت کس کے ساتھ ہے لیکن صدر نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی اور ان سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ اب گزشتہ ایک ہفتے سے نئے وزیرِ اعظم کی تلاش ہو رہی ہے اور مسٹر سہروردی مستعفی ہو جانے کے بعد بھی بدستور وزیرِ اعظم ہیں۔ اگر یہی کرنا تھا تو پھر قومی اسمبلی کا اجلاس کیوں نہ طلب کر لیا گیا۔ اس غیر پارلیمانی طرزِ عمل کا ایک تشویش ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ملک کے مختلف حلقے صدرِ مملکت پر جانب داری کا الزام لگا رہے ہیں اور اعلانیہ کہہ رہے

ہیں کہ صدرِ مملکت ایک خاص جماعت کی سرپرستی اور طرفداری کر رہے ہیں۔ صدرِ مملکت کی ذات کو پارٹیوں کے جھگڑوں سے بلند ہونا چاہیے تاکہ کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ وہ کسی خاص فرد یا جماعت کے حامی ہیں۔

ان سطروں کے قارئین کی نظر سے گزرنے سے پیشتر پاکستان کے ساتویں وزیرِ اعظم کا انتخاب ہو چکا ہوگا لیکن گزشتہ آٹھ دس دن سے کراچی میں ''قوم و ملک کے خادم'' سودے بازی اور جوڑ توڑ کا جو شرمناک مظاہرہ کر رہے ہیں اور حصولِ اقتدار کی خاطر جس بے شرمی اور بے غیرتی سے اپنے نام نہاد اصولوں کی قربانی پیش کر رہے ہیں اس پر قوم اور وطن کے ہر بہی خواہ کی گردن ندامت سے جھک جانی چاہیے۔ جاہ و منصب کے طلب گاروں کی یہ ٹولی ہی دراصل ہماری قومی شہرت اور غیرت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ کیا اس تماشے کے بعد بھی جو کراچی میں آٹھ دس روز سے کھیلا جا رہا ہے یہ شکایت کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کا وقار، پاکستان کے باہر گھٹتا جا رہا ہے۔

ہمیں اس سے دلچسپی نہیں کہ وزیرِ اعظم کون مقرر ہوتا ہے البتہ ہمیں اس سے ضرور دلچسپی ہے کہ نئے وزیرِ اعظم صاحب پاکستانیوں کے روزمرہ کے اَن گنت مسائل کو حل کرنے کی خاطر فوری طور پر کیا کرتے ہیں اور عام انتخابات کی تاریخوں کو قریب تر لانے میں ہماری کیا مدد کرتے ہیں۔

۱۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء

صدرِ مملکت کی ذات

صدرِ مملکت جناب اسکندر مرزا کی ذات اِن دِنوں اخباروں اور پبلک جلسوں میں بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ ابتدا میں سرگوشیاں ہوئیں، پھر دبی زبان سے شکایت کی جانے لگی، پھر اخباروں میں اعتراض شائع ہونے لگے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہزاروں کے جلسے میں جو ایک نہایت ذمے دار سیاسی لیڈر کی صدارت میں ہو رہا تھا صدر اسکندر مرزا پر پارلیمانی مقدمہ (ام پیچ منٹ) چلانے کا مطالبہ کیا گیا۔ معترضین کا کہنا ہے کہ صدرِ مملکت ایک مخصوص سیاسی جماعت کی جا و بے جا پُشت پناہی کرتے ہیں اور آئین میں جو اختیارات ان کو حاصل ہیں ان سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

پاکستان میں صدرِ مملکت کی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو ہندوستان، ترکی یا فرانس کے صدر کی ہے۔ وہ صدر منتخب ہو جانے کے بعد کسی جماعت یا گروہ کا نمائندہ نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی ذات جماعتی، طبقاتی اور سیاسی اختلافات سے بلند ہوتی ہے۔ وہ پوری مملکت کی علامت بن جاتا ہے۔ پارلیمانی جمہوریتوں کے صدر اپنے کردار و عمل سے اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ذات کو نزاعی امور سے الگ ہی رکھتے ہیں تاکہ کسی گروہ یا جماعت کو یہ الزام لگانے کا موقع نہ ملے کہ صدرِ مملکت جانب داری برتتے ہیں۔ مگر صدرِ مملکت کے لیے ملک کے تمام فرقوں اور گروہوں کا مکمل اعتماد حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے مسلسل کوشش، بے حد احتیاط اور عدل و انصاف کے شدید احساس کی ضرورت ہوتی ہے اور ذرا سی لاپروائی یا غفلت

سارے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہے۔

صدرِ مملکت پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ ایسے وقت میں کیا گیا ہے جب موصوف ملک میں موجود نہیں ہیں بلکہ یورپ کا دورہ کر رہے ہیں۔ صدرِ مملکت کے اس دورے پر بھی کڑی نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ صدرِ مملکت کی اپنی ذاتی اور نجی زندگی بھی ہے اور وہ ایک پرائیویٹ شہری کی حیثیت سے سیر وسیاحت کا حق رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ جہاں کہیں بھی تشریف لے جائیں گے سرکاری اور غیر سرکاری حلقے ان کا خیر مقدم صدرِ پاکستان کی حیثیت ہی سے کریں گے۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے ان کی ملاقات اور ملکہ ایلزبتھ کے محل میں ان کی ضیافت خود اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ صدر جہاں بھی جائیں صدر رہیں گے لیکن فرانس، اسپین اور پرتگال کا دورہ تو وہ بحیثیت صدرِ پاکستان فرما رہے ہیں۔ فرانس میں وہ صدر جمہوریہ کے مہمان ہوں گے اور ان کے ہمراہ شکار بھی کھیلیں گے۔ حیرت ہے کہ صدر اسکندر مرزا کا پروگرام مرتب کرنے والوں نے پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کے جذبات و احساسات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا حالانکہ انہیں علم ہونا چاہیے کہ فرانسیسی حکومت کے ہاتھوں الجزائر میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہو رہا ہے اور فرانسیسی فوجیں سفاکی اور غارت گری کے جو حیا سوز مظاہرے وہاں کر رہی ہیں ان کے باعث پاکستان کا بچہ بچہ فرانس سے نفرت کرنے پر مجبور ہے۔ صدر اسکندر مرزا کو فرانس جانے کا مشورہ دینے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ صدرِ محترم کے اس سفر کا ردِعمل مسلمانانِ عالم پر عموماً اور شمالی افریقہ کے عربوں پر خصوصاً کیا ہوگا۔ عرب دنیا بشمول تیونس و مراکش الجزائر کے مجاہدینِ آزادی سے ہمدردی کر رہی ہے اور فرانس سے سخت متنفر ہے۔ اگر ہم الجزائر کے مظلوموں کی چارہ گری نہیں کر سکتے تو کم سے کم ہمیں ان کے زخموں پر نمک پاشی سے تو احتراز کرنا چاہیے۔ عربوں میں ہم یوں ہی کیا کم مطعون ہیں کہ رنجشوں اور شکایتوں کے نئے اسباب فراہم کیے جائیں۔

مسٹر حسین شہید سہروردی قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد ہیں۔ ان کا اخلاقی فرض تو یہ ہے کہ صدرِ مملکت پر مقدمہ چلانے کا جو مطالبہ انہوں نے بھرے جلسے میں منظور کروایا تھا اسے قومی اسمبلی میں دہرائیں تاکہ صدرِ مملکت کو بھی صفائی پیش کرنے کا موقع ملے ورنہ ابھی تو صدر کی ذات پر حملے ہو رہے ہیں مگر وہ ان حملوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اگر مسٹر سہروردی نے قومی اسمبلی میں یہ مطالبہ نہ پیش کیا تو پاکستان کے عوام یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ

مسٹر سہروردی طاقت سے محروم ہونے کے بعد اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے ہیں اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کی خاطر اپنے آپ کو مظلوم و مجبور ظاہر کر رہے ہیں۔

۳ نومبر ۱۹۵۷ء

قومی اتحاد کے دشمن

پاکستان کے اس علاقے میں جمہوریت کے ننھے اور نازک پودے پر پچھلے دو ہفتے بڑے کٹھن گزرے۔ اب تک شہریوں کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کرنے کے ناخوش گوار ''فرائض'' ہماری حکومتیں سرانجام دیتی تھیں لیکن اب کے ایک خاص گروہ نے یہ ناخوش گوار ''فرائض'' اپنے ذمے لے لیے اور ''عوام'' کے نام پر ایسی عوام دشمن حرکتوں کا مظاہرہ کیا کہ تہذیب وشائستگی کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے لوگ مخلوط انتخاب کے سخت مخالف ہیں۔ وہ ایک یونٹ کو پاکستان کی سالمیت اور وحدت کا سنگِ بنیاد تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا بھاشانی کے جلسوں میں جو گڑبڑ کی اس کی وجہ یہی تھی کہ مولانا بھاشانی اور ان کے رفقا ایک یونٹ کے خلاف ہیں اور مخلوط انتخاب کی حمایت کرتے ہیں۔

ایک یونٹ اور مخلوط انتخاب کے حسن و قبح پر ہم متعدد بار اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ پاکستان ایک یونٹ بننے سے پیشتر بھی سلامت تھا، ایک یونٹ بن جانے کے بعد بھی سلامت ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی سلامت رہے گا خواہ ایک یونٹ باقی رہے یا نہ رہے۔ اسی طرح اسمبلیوں کے الیکشن جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر ہوئے تب بھی پاکستان سلامت رہا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے الیکشن مخلوط انتخاب کی بنیاد پر ہوئے تب بھی پاکستان سلامت رہا اور آئندہ بھی سلامت رہے گا۔ خواہ جداگانہ نیابت کا طریقہ رائج ہو خواہ مخلوط نیابت کا۔ حیرت اس بات پر ہے

کہ جو لوگ جلسوں میں ہنگامے کا سبب ایک یونٹ اور مخلوط انتخاب کو قرار دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ابھی چند ماہ پیشتر اسی شہر لاہور میں صوبائی اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت نے ایک یونٹ کو توڑنے کی تجویز منظور کی تھی اور مخلوط انتخاب کے اصول کو تسلیم کیا تھا۔ اس وقت پنجاب کے ''عوام'' نے نہ اسمبلی کے روبرو کوئی مظاہرہ کیا نہ لیڈروں پر خشت بازی کی۔ مسٹر سہروردی اور مخلوط انتخاب کے دوسرے حامیوں نے لاہور اور دوسرے شہروں میں متعدد بار پبلک جلسوں میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا لیکن ہُلّڑ بازی تو الگ رہی کسی نے مخالفت میں آواز تک نہ اٹھائی پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ ہنگامے اور ہُلّڑ بازیاں عوام کے غیظ وغضب کی غمازی کرتی ہیں — ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان حرکتوں کی ذمّے داری جمہورِ پاکستان پر نہیں بلکہ غنڈوں کے چند منظم گروہ ہیں جو بعض خود غرض عناصر کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ''امن وقانون'' کی حفاظت جن لوگوں کے سپرد ہے انہوں نے اپنی ذمّے داری پوری کرنے میں کیا مستعدی دکھائی۔ آئینِ پاکستان میں شہریوں کے چند بنیادی حقوق کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مثلاً تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی۔ پولیس اور حکّامِ متعلقہ کا کام ان حقوق کی حفاظت کرنا ہے لیکن راولپنڈی، سرگودھا، لائل پور، لاہور اور دوسرے مقامات پر پولیس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے شہریوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت نہیں ہوئی البتہ غنڈوں کی ہمت افزائی ضرور ہوئی۔

اس مسئلے کا ایک اور اہم پہلو ہماری غور وتوجہ کا محتاج ہے۔ جن عناصر نے جلسہ توڑنے والے گروہوں کو اُکسایا انہوں نے کیا یہ سوچنے کی زحمت بھی کی کہ ان حرکتوں کا ردِعمل سرحد، مشرقی پاکستان، بلوچستان اور سندھ کے علاقوں پر کیا ہوگا۔ مولانا بھاشانی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مولانا بھاشانی مشرقی پاکستان کے ہر دلعزیز رہنما ہیں۔ یہاں ان کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی ہے اس سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان دوستی اور محبت کے تعلقات کو فروغ تو نہ ہوگا بلکہ غلط فہمیاں اور تلخیاں بڑھیں گی۔ قومی اتحاد کے رشتے کمزور ہوں گے۔ مغربی پاکستان کی اکثر سیاسی جماعتوں نے اور ملک کے بیشتر مقتدر رہنماؤں نے اس غنڈے پن اور ہُلّڑ بازی کی ملامت کی ہے۔ یہ نازیبا حرکتیں جمہوریت کے منافی ہیں۔ جمہوریت کو ہمارے ملک میں اسی وقت فروغ ہوسکتا ہے جب تمام جماعتیں نصب العین اور طریقۂ کار کے اختلاف کے باوجود رواداری، ضبط اور تحمل سے کام لیں، دوسروں

کے نقطۂ نظر کا احترام کرنا سیکھیں تا کہ ہر جماعت اور فرد کو اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ کا پورا پورا موقع ملے۔ پاکستان کے عوام احمق نہیں ہیں۔ وہ اچھے بُرے اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا جانتے ہیں۔ وہ ایسی ہر سیاست کو رد کر دیں گے جس سے ملک و ملت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ جو گروہ جداگانہ انتخاب اور ایک یونٹ کی برتری اینٹوں، پتھروں اور لاٹھیوں کے زور سے منوانا چاہتا ہے وہ دراصل جداگانہ انتخاب اور ایک یونٹ کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے اور اسلام کو بدنام کرنے کے درپے ہے کیونکہ اسلام کے مقتدر تر بزرگوں نے لوگوں کو بزورِ شمشیر کلمہ گو نہیں بنایا تھا۔ سچائیاں تشدّد سے رواج نہیں پاتیں۔ حق کی آواز لاٹھیوں کے شور میں نہیں گونجتی۔ تشدّد دراصل اظہارِ عجز ہے۔ تشدّد کا حربہ وہ استعمال کرتا ہے جو اپنے اعمال، اقوال اور اخلاق سے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے سے قاصر ہوتا ہے۔

۱۰ نومبر ۱۹۵۷ء

وزارتی بحران؟

مرکز میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی مخلوط وزارت غالباً ایک ہی ماہ میں اپنی عمر طبیعی کو پہنچ گئی ہے۔ آئندہ چند دنوں میں طریقِ انتخاب کے مسئلے پر اگر نیا وزارتی بحران پیدا ہو جائے تو اس پر کسی کو حیرت نہ ہوگی۔ وزیر اعظم مسٹر چندری گر نے برسر اقتدار آتے ہی جداگانہ طریقِ انتخاب کے سوال پر کچھ اس طرح اصرار کرنا شروع کیا کہ نئی کولیشن کا مستقبل سابقہ کولیشن وزارت سے بھی زیادہ مشکوک نظر آنے لگا۔

ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اتحاد کی تو کسی حد تک نظریاتی اساس بھی تھی کیونکہ طریقِ انتخاب اور (ابتدا میں) ایک یونٹ کے بارے میں ان کے موقف میں ہم آہنگی موجود تھی لیکن نئی کولیشن کے قیام سے پہلے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی اپنی تمام نظریاتی قلابازیوں کے باوصف طریقِ انتخاب کے سوال پر واضح اختلاف رائے رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں پارٹیوں کی مخلوط وزارت بنی۔ مگر افسوس ہے کہ اقتدار کی جنگ کا خاتمہ نہ ہو سکا بلکہ سیاسی رسہ کشی بدستور جاری رہی اور اب تمام زورِ بیاں اس بات پر صرف کیا جا رہا ہے کہ ملک و قوم کی بقا جداگانہ طریقِ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کا تصفیہ ہوا تو ملک کے سارے مسائل کی گرہیں خود بخود کھل جائیں گی۔

ہمیں یہاں مخلوط یا جداگانہ طریقِ انتخاب کے حسن و قبح سے بحث نہیں لیکن اربابِ اقتدار نے طریقِ انتخاب کی بحث کو ازسرِ نو چھیڑ کر عام انتخابات کے امکانات اور ملک کے سیاسی

مستقبل کو شدید خطرات سے دو چار کر دیا ہے۔ اگر اس بحث نے شدت اختیار کی (اور کولیشن میں شریک دوسری پارٹیوں کے موقف کے پیشِ نظر، یہ امر بعید از قیاس نہیں) تو لازمی نتیجہ ایک نئے وزارتی بحران کی صورت میں رونما ہوگا اور یہ محض وزارتی بحران نہیں ہوگا بلکہ ایک شدید سیاسی بحران ہوگا۔ اس آئے دن کے بحران کا نتیجہ کیا ہوگا یہ بہ آسانی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ پارلیمانی نظامِ حکومت کا خاتمہ؟ — جمہوری قدروں کی پامالی؟ انقلابی کونسل کے پردے میں آمریت کا قیام؟ ایسے میں ملک جن مصائب میں مبتلا ہوسکتا ہے اس کا اندیشہ اربابِ اقتدار کے نزدیک جماعتی مفادات سے زیادہ غور طلب نہیں ہوگا لیکن اس کا تعلق پونے آٹھ کروڑ پاکستانیوں کے مستقبل سے ضرور ہے۔

مسلم لیگ پارٹی سے ہماری گزارش ہے کہ ایک ایسے مسئلے کو اشتعال انگیزی کا ذریعہ نہ بنائے جو ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ وہ اپنی جماعتی حیثیت کی بحالی کے لیے ان مسائل پر توجہ مبذول کرے جو واقعی قومی فلاح کے لیے لازماً توجہ طلب ہیں۔

کولیشن وزارت میں شریک موثر ترین جماعت ری پبلکن پارٹی کا موقف بھی طریقِ انتخاب کے مسئلے پر کلی طور پر موجب اطمینان نہیں۔ اس سلسلے میں پارٹی کی مرکزی تنظیمی کمیٹی کا فیصلہ مضحکہ خیز حد تک موقع پرستی پر مبنی ہے۔ ری پبلکن پارٹی کے منشور میں مخلوط طریق انتخاب کی حمایت کی گئی ہے۔ قومی اسمبلی کے بھرے ایوان میں بھی وہ اپنے موقف کا اظہار کر چکی ہے لیکن چند ہی ماہ بعد نہ معلوم وہ کون سے اسباب رونما ہوئے ہیں جن کی بنا پر پارٹی نے اس مسئلے پر مشرقی پاکستان کے شہریوں کی رائے معلوم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کا مفہوم اور کیا ہوسکتا ہے کہ یا تو ری پبلکن پارٹی کا سابقہ فیصلہ جو اس نے عوام کی رائے معلوم کیے بغیر صادر کیا بے اصولی پر مبنی تھا یا اس کی حالیہ روش موقع پرستی کے سبب سے ہے۔

ہماری مقتدر سیاسی جماعتوں میں اب شاید عام لوگوں کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتی رہتی ہیں تاکہ لوگوں کے ذہن اِنھیں غیر ضروری باتوں میں اُلجھے رہیں۔ ورنہ عام انتخابات سے چند ماہ پیشتر جان بوجھ کر ایسی نزاعی بحثیں چھیڑنا جن سے وزارتی بحران پیدا ہو اور الیکشن معرضِ خطر میں پڑیں وطن دوستی کی دلیل نہیں۔ کیا جداگانہ اور مخلوط انتخاب کی بحث کو اور ایک یونٹ کی تنسیخ کے مسئلے کو عام انتخابات تک ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔ عام انتخابات دس سال سے ٹلتے چلے آرہے ہیں۔ اس

ناقابلِ معافی تاخیر کے باعث ساری دنیا میں ہمارا مذاق اُڑ رہا ہے لیکن ہمارے نام نہاد رہنماؤں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے وقار کا ذرّہ برابر خیال نہیں — طریقِ انتخاب یا ایک یونٹ کا مسئلہ اگر ان کو اتنا ہی عزیز ہے تو وہ اس کو الیکشن کا موضوع کیوں نہیں بناتے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ قوم کی اکثریت کیا چاہتی ہے۔ الیکشن سے قبل ان مسائل میں اُلجھنا اور وزارتی بحران پیدا کرنا بڑی عاقبت نااندیشی ہوگی۔

۲۴ نومبر ۱۹۵۷ء

ایک اور وزارتی بحران

وزارت بازی اور وزارت سازی ہمارے ملک میں ایک مستقل پیشے کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا اربابِ حل وعقد لوگوں کے روزانہ کے تمام مسائل حل کر چکے ہیں اوراب فرصت کے اوقات میں انہیں وزارتی گھروندے بنانے اور بگاڑنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہا۔ گزشتہ دو ماہ سے کراچی کے ایوانِ اقتدار میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے ہم حیران ہیں کہ اسے کس نام سے منسوب کریں اوراس پر تبصرہ کرتے وقت کون سا لہجہ اختیار کریں۔ الیکشن کے ابتدائی انتظامات مکمل نہیں ہو چکتے کہ مسٹر سہروردی ایک یونٹ کا شاخسانہ چھوڑ دیتے ہیں اور ری پبلکن پارٹی برہم ہو کر اپنا دستِ تعاون کھینچ لیتی ہے گویا ایک یونٹ کو توڑنا ری پبلکن پارٹی کا فرضِ اوّلین تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے ساتھ مل کر وزارت بناتے وقت اسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ وہ مسٹر سہروردی سے کیوں خفا ہوئی تھی۔ ری پبلکن پارٹی کے لیڈر مسلم لیگ سے جداگانہ انتخاب کا وعدہ کر لیتے ہیں حالانکہ پارٹی کا منشور مخلوط انتخاب کی حمایت کرتا ہے۔ منشور کی خلاف ورزی کرتے وقت ری پبلکن لیڈر اپنی پارٹی سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ مسلم لیگ کے زعما الیکشن کے تمام انتظامات کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ وہ جداگانہ انتخاب پر یوں اصرار کرتے ہیں گویا جداگانہ انتخاب بھی ارکانِ مذہب میں داخل ہے۔ اگر ان کی اس طفلانہ ضد سے عام انتخابات سال دو سال کے لیے ملتوی ہو جاتے ہیں تو ان کی بلا سے اور اگر مشرقی پاکستان کے لوگوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور غلط فہمیاں اور بدگمانیاں بڑھتی ہیں تو انہیں اس سے بھی

کوئی سروکار نہیں۔

موجودہ وزارتی بحران دراصل نتیجہ ہے اس ذہنیت کا جو جماعتی اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک یہ ذہنیت کارفرما ہے وزارت سازی اور وزارت بازی کے کاروبار میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ سیاسی جماعتیں اپنے نصب العین کو فراموش کر کے پرانے وعدوں سے منحرف ہوتی رہیں گی۔ نئے معاہدوں پر دستخط کیے جائیں گے لیکن ابھی سیاہی بھی نہ سوکھے گی کہ حریفوں سے ساز باز شروع ہوجائے گی اور حلیفوں کو نیچا دکھانے کے منصوبے بننے لگیں گے۔

مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے زعما کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا چنانچہ موجودہ وزارتی بحران نہ غیر متوقع تھا اور نہ حیرت انگیز البتہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ یہ دونوں جماعتیں چھ ہفتے تک کیسے یکجا رہیں۔

ذہنی انتشار اور بدگمانیوں کی موجودہ فضا میں صدرِ مملکت کا طرزِ عمل اگر ناقابلِ فہم نہیں تو حیرت انگیز ضرور ہے۔ مسٹر چندریگر وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کو پارلیمنٹ کی اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں لیکن صدرِ مملکت مسٹر چندریگر ہی کو دوبارہ وزارت سازی کی دعوت دیتے ہیں حالانکہ دو ماہ قبل جب مسٹر سہروردی نے استعفیٰ دے کر دوبارہ وزارت بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی تو صدرِ مملکت نے ان کی درخواست یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ پارلیمانی روایت کا تقاضہ ہے کہ حزبِ اختلاف کے قائد کو وزارت سازی کا موقع دیا جائے مگر صدر نے نہ جانے کن مصلحتوں کے تحت اس پارلیمانی روایت کو نئی زندگی عطا نہ کی اور مسٹر چندریگر کے استعفے کے بعد حزبِ اختلاف کے قائد کو وزارت سازی کی دعوت نہ دی۔ اگر یہ ممکن نہ تھا تو وزارت سازی کا کام پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت ہی کے سپرد کر دیا جاتا۔

مسٹر چندریگر کے مشورے پر پارلیمنٹ کے اجلاس کا التوا دراصل اس حقیقت کا اعلانیہ اعتراف ہے کہ پارلیمنٹ کی اکثریت جداگانہ انتخاب کے بنیادی اور نزاعی مسئلے پر مسٹر چندریگر کی ہم خیال نہیں — پارلیمنٹ کے ۴۵ ممبروں کا مشترکہ اعلان بھی اسی بات کی تصدیق کرتا ہے کہ مسٹر چندریگر پارلیمنٹ کے اعتماد سے محروم ہوچکے ہیں لیکن اقلیت میں ہونے کے باوجود اگر مسٹر چندریگر پارلیمنٹ کے چند ممبروں کو وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوجائیں تو بھی وزارتی بحران اور طاقت آزمائی کی فضا بدستور باقی رہے گی۔ اور اگر مسٹر چندریگر نئی وزارت بنانے

میں ناکام رہے تو صدرِ مملکت کا فرض ہے کہ وہ حزبِ اختلاف کے قائد یا ری پبلکن پارٹی کے لیڈر کو وزارت بنانے کی دعوت دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ صدر محترم اپنے آئینی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ برتیں گے اور سیاسی جماعتوں پر دباؤ ڈال کر انہیں کسی خاص فرد یا کسی خاص مسلک کی تقلید پر مجبور کریں گے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت کے فیصلوں کا احترام کرنا صدرِ مملکت کا فرض ہے اور اب کہ پارلیمنٹ کی اکثریت نے غیر رسمی طور پر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے صدرِ مملکت کو چاہیے کہ پارلیمنٹ کا اجلاس فوراً طلب کریں تاکہ نئے وزیرِ اعظم کو خواہ وہ کسی بھی جماعت سے تعلق رکھتا ہو یہ ثابت کرنے کا موقع ملے کہ اکثریت اس کے ساتھ ہے۔

مرکز کی نئی وزارت کو (خواہ وہ کسی جماعت کی ہو) یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی حیثیت ایک ''نگران'' وزارت سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا پہلا اور آخری فریضہ ملک میں جلد از جلد عام اور آزاد انتخابات کروانا ہے نہ کہ جداگانہ انتخاب اور ایک یونٹ کے نزاعی مسائل کو حل کرنا۔ یہ مسائل پارلیمانی جوڑ توڑ سے حل ہو بھی نہیں سکتے۔ جو سیاسی جماعتیں ان مسائل کو اپنی زندگی اور موت کا سوال بنائے ہوئے ہیں انہیں چاہیے کہ وزارتی بحران پیدا کر کے انتخابات کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں بلکہ ان مسائل ہی کی بنیاد پر انتخابات میں شریک ہوں۔ عوام جو فیصلہ کریں گے وہ ہر جماعت کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء

بڑھتے سائے

قومی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے تو ملک کے مسائل حل ہوں یا نہ ہوں چند دن کے ہنگاموں سے گھر کی رونق ضرور بڑھ جاتی ہے۔ معزز ارکان کی شیریں گفتاریوں کے جوہر کھلتے ہیں، دشنام طرازیوں کے در وا ہوتے ہیں، مملکت کے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے اور خوش انتظامیوں کے راز طشت از بام ہوتے ہیں۔ اقتدار کا ہر کلمہ احساسِ قومی اور جذبۂ قربانی سے معمور ہوتا ہے اور لیلائے وزارت کا ہر رخ انکساری اور پاک بازی کی تصویر۔ پرانے ناوک فگن جن کی ہولناکیوں نے قوم کے جسمِ لاغر میں ایک قطرۂ خون بھی نہ چھوڑا چارہ سازی اور دردمندی کے مرہم مفت تقسیم کرتے ہیں۔ وہ شکاری جن کے فتراک ان دنوں ثروت و اختیار سے خالی ہیں صیادوں کی سنگ دلی کا ماتم کرتے ہیں، منافقت حق بینی و حق گوئی کا سوانگ بھر لیتی ہے اور عیاری اور مکاری تقدس کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ پیشانیاں ندامت کے پسینوں سے تر ہوتی ہیں اور لب توبہ و استغفار سے بوجھل۔ غرض ایوان کا گوشہ گوشہ عدل و انصاف، آزادی و جمہوریت اور فرض و خدمت کے حسین الفاظ سے گونجنے لگتا ہے۔ کتنے پاک باطن اور پاک دامن ہیں ہمارے یہ نمائندے!

اربابِ اختیار کے کارہائے نمایاں سے کون واقف نہیں لیکن خود تبصرہ کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ یہ داستانِ الم کسی گھر کے بھیدی کی زبانی سنی جائے۔ اس نے کہا۔

''ہمارے بارے میں ملک میں عام تاثر یہ ہے کہ ہم لوگ (قومی اسمبلی کے ارکان) مجموعی

طور پر نااہل بھی ہیں اور بد دیانت بھی۔'' اس نے کہا: ''اگر ہمارے ملک میں کوئی ڈکٹیٹر برسر اقتدار آیا تو وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ قومی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے سب ممبروں کو جیل میں بند کر دے گا یا گولی مار دے گا۔عوام میں مقبول ہونے کی خاطر یہ اس کا سب سے پہلا قدم ہوگا''۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ جن ذاتِ شریف نے ارکانِ مجلس کو عوام کے ان تاثرات سے آگاہ کیا وہ خود دس سال تک مرکز میں وزیر، وزیرگر اور وزیرِ اعظم رہ چکے ہیں۔ ہم ان سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ اپنے عہدِ اقتدار میں انہوں نے عوام کے ان تاثرات کو بدلنے کی کیا کوشش کی۔ ہم نے تو ان کا یہ اقتباس اس لیے پیش کیا ہے کہ حالات کی نزاکت واضح ہو جائے۔ ان کے ایک اور ہم صفیر ہیں جو کل تک مرکز میں وزیرِ دفاع تھے اور برسوں ہمارے صوبے کے وزیرِ خزانہ اور وزیرِ اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔ حکومتیں ان کے اشارے پر بنتی بگڑتی تھیں اور حکام ان کی مرضی سے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ''زراعت ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے مگر زراعت کی جانب توجہ نہیں دی جاتی اور فاضل اراضیاں کاشت کاروں میں تقسیم نہیں کی جاتیں اور نہ زرعی نظام کا فرسودہ ڈھانچہ بدلا جاتا''۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ جن ذاتِ شریف نے زراعت کی زبوں حالی کا رونا رویا ہے انہوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں کتنی زمینیں کاشتکاروں میں تقسیم کیں اور زرعی نظام میں کون سا انقلاب برپا کیا۔ ہم نے تو ان کا یہ اقتباس اس لیے پیش کیا ہے کہ حالات کی نزاکت واضح ہو جائے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اگر کوئی شخص غیر ملکی امداد کی تسمہ پائی کی طرف بھولے سے بھی اشارہ کر دیتا تو یہی بزرگ اسے پاکستان کا دشمن، غدار اور انتشار پسند کہنے سے گریز نہ کرتے مگر آج حالات نے انہیں بھی تلخ نوائی پر مجبور کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''بیرونی امداد پر انحصار سے قوم کا اخلاق پست ہو رہا ہے، وہ جونک بنتی جا رہی ہے۔ اس مکمل گداگری نے اقوامِ عالم میں ہمارا وقار گرا دیا ہے۔ پاکستان اس لیے نہیں قائم ہوا تھا کہ میراثیوں کی ایک قوم بنائی جائے۔ آج پاکستان امریکہ یا برطانیہ کے ساتھ اس لیے نہیں ہے کہ وہ جمہوریت کا شیدائی ہے بلکہ اس لیے ہے کہ یہ ملک ہمیں بھیک دیتے ہیں'' ابھی کل تک اس بیرونی امداد کو من وسلویٰ سمجھا جاتا تھا اور اس من وسلویٰ کو نامنظور کرنے والوں کے خلاف کفرانِ نعمت کے فتوے صادر ہوتے تھے۔ آج اس بیرونی امداد کو قبول کرنے والوں کو ''میراثی'' کا لقب دیا جاتا ہے!

انقلابات ہیں زمانے کے!

دیوار پر سائے کی حرکت اور اس کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سائے رقصِ حیات کا پرتو نہیں ہیں بلکہ محکومی، مفلسی اور ہلاکت کی تاریکیاں ہیں۔ بصیرت کی نگاہیں تباہیوں کا یہ تماشا کب تک دیکھتی رہیں گی۔

۹ مارچ ۱۹۵۸ء

اقرار و اعتراف — انعام و اکرام

شاعر نے کہا تھا کہ پہلے دل شگفتہ ہوتا ہے تب گلاب کی کلیاں کھلتی ہیں اور شکایت کی تھی کہ "اب کے خزاں، بہار سے پہلے ہی آ گئی۔" یومِ جمہوریہ کے موقع پر صدر مملکت، وزیرِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے پیغامات میں بہارِ وطن کی آمد کا مُودہ تلاش کرنے والوں کے تاثرات بھی خزاں گزیدہ شاعر سے چنداں مختلف نہیں۔

اب کہ صدرِ مملکت نے ان تمام تلخ حقیقتوں کا صاف صاف اعتراف کرلیا جن کے ذکر سے کرسی نشینانِ اقتدار کی پیشانیوں پر شکنیں پڑ جاتی تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں امن و قانون کی قوتیں کمزور ہوئی ہیں، عام لوگوں پر معاشی بوجھ بڑھا ہے، مصارفِ زندگی میں اضافہ ہوا ہے، نظم و نسق خراب ہوا ہے، رشوت ستانیوں کو فروغ ہوا ہے، ہر شخص ذات کو خدمت پر ترجیح دیتا ہے اور دولت سمیٹنے اور اقتدار حاصل کرنے کا جنون ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم اتنی صاف گوئی سے تو کام نہ لے سکے لیکن یہ اقرار انہوں نے بھی کیا کہ لوگوں میں شدید پست ہمتی اور مایوسی پھیلی ہوئی ہے اور وہ نہایت تشویش ناک معاشی مصائب میں گرفتار ہیں۔ اب تک ہمارے چارہ گر بیمار کی بیماری ہی سے انکار کرتے تھے اور فریاد کی ہر آواز غداروں، انتشار پسندوں اور تخریبی کارروائی کرنے والوں کے شور و غوغا سے تعبیر کی جاتی تھیں — شکر ہے کہ ہمارے مسیحانفسوں نے مریض کو مریض تو مانا۔ امراض کی تشخیص تو کی۔

مگر حیرت ہے کہ اس نبض شناسی اور مزاج دانی کے باوجود نہ قومی امراض کے اسباب و

علل پر روشنی ڈالی گئی اور نہ حافظ کے لیے درمانِ درد تجویز ہوا۔ کسی نے یہ نہ بتایا کہ قوم کو ان بیماریوں میں مبتلا کس نے کیا۔ نظم و نسق کا شیرازہ منتشر کرنے والے کون لوگ ہیں، امن و قانون کی قوتوں کو کمزور کرنے کی ذمہ داری کس پر ہے، حصولِ اقتدار کی جنگ میں کون پیش پیش ہے۔ ناجائز طریقوں سے روپیہ سمیٹنے کی وبا کو کس نے ہوا دی ہے، عام لوگوں پر معاشی بوجھ کون سے طبقے ڈال رہے ہیں اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کس نے کیا ہے۔ مریض کو مریض تسلیم کرنے اور اس کی حالت پر افسوس کرنے سے تو شفا نہ ہوگی۔

اربابِ اقتدار نے حالات کی تنقید کے ساتھ اگر اس طریقہٗ کار اور حکمتِ عملی کا بھی جائزہ لیا ہوتا جس پر ہماری حکومتیں دس سال سے چل رہی ہیں تو انہیں دانشوروں پر خفا ہونے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔ گزشتہ دس سال میں مرکز اور صوبوں میں جتنی وزارتیں بنیں ان کا نصب العین یہی رہا ہے کہ اپنی کرسی اقتدار کی حفاظت کی جائے اور اپنی جماعت، اپنے احباب و اعزا، اپنے حلیف و ہم نوا، اپنے طبقے اور برادری کو امیر سے امیر تر اور مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے۔ ہماری خارجی پالیسی بھی اسی محور پر گھومتی رہی اور ہماری داخلی پالیسی بھی اسی مقصد کے گرد طواف کرتی رہی۔ دس سال سے ایک غیر نمائندہ قومی اسمبلی اگر ہم پر مسلط ہے تو اس کا باعث بھی یہی ''نصب العین'' ہے۔ ملک میں اب تک الیکشن نہیں ہوسکے تو اس کا باعث بھی یہی ''نصب العین'' ہے اور آج ملک کا جو حال ہو رہا ہے وہ بھی لازمی اور منطقی نتیجہ ہے اس ''نصب العین'' کا۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے پیغام میں ان اسباب کی جانب نہایت بلیغ اشارے کیے ہیں۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ — ''جو لوگ خود کھلی موقع پرستی، خود غرضی اور بے اصولے پن کے مرتکب ہیں اور ملک کی سیاسی زندگی کو مسخ کر رہے ہیں اور نظم و نسق اور معیشت کے ڈھانچے کو نقصان پہنچا رہے ہیں، آج اصول، نصب العین اور اصلاح کی باتیں کر رہے ہیں اور اپنی بداعمالیوں اور نالائقیوں کا الزام دوسروں پر رکھ رہے ہیں''۔ محترمہ نے قوم کو اس ''پوشیدہ ہاتھ'' کی ریشہ دوانیوں سے بھی متنبہ کیا جو قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔

لطف یہ ہے کہ ایک طرف قوم کے نام یہ اہم پیغامات نشر ہو رہے تھے دوسری طرف اُن لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا جا رہا تھا جن کی غالب اکثریت نے تشکیلِ پاکستان کی تحریک کے لیے کوئی قربانی کی نہ تعمیرِ وطن میں کوئی نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ وہی امرائے دربار اور افسرانِ مملکت ہیں جو اپنی ذات کو قومی خدمت پر ترجیح دیتے ہیں اور جن کے دس سالہ کارناموں

کی بدولت پاکستان آج مصیبت میں مبتلا ہے۔ غلط بخشیوں کی یہ طویل فہرست جتنی مضحکہ خیز ہے اتنی ہی حوصلہ شکن بھی ہے۔ اس کے بعد بے ایمان اور نااہل افسروں میں توڑ جوڑ اور خوشامد کا رجحان اور بڑھے گا اور ایمان دار اور فرض شناس افسروں کی ہمتیں پست ہوں گی۔ مربعے، تمغے اور خطابات کی اس بے تحاشا تقسیم سے ان تمغوں اور خطابوں کی وقعت بھی گرے گی اور نظم و نسق بھی بہتر نہ ہوگا۔

معاشی حکمتِ عملی کا مسئلہ ہو یا خارجی پالیسی کا، وزارت سازی کی تگ و دَو ہو یا خطابات و انعامات کی تقسیم، اربابِ اختیار کو چاہیے کہ اب تو ذاتی، جماعتی اور طبقاتی مفاد کی آلائشوں سے بچ کر کوئی قدم اٹھائیں۔ اب تو پانی سر سے اُونچا ہوتا جاتا ہے۔ آخر کب تک ہمارے صبر و ضبط کا امتحان لیا جائے گا۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۸ء

سحر ہونے تک

ہارون الرشید کے عہد میں گھڑی کا رواج نہ تھا ورنہ الف لیلہ کا مصنف ہمیں ضرور بتاتا کہ خلیفۂ وقت نے کے بج کر کے منٹ پر ابوالحسن کو داروئے بے ہوشی سنگھایا۔ ابوالحسن شاہی محل میں کس وقت داخل ہوا اور اس نے کتنی دیر تختِ شاہی پر بیٹھ کر بادشاہت کی۔ مگر ''خلفائے'' پاکستان کی الف لیلہ لکھی جائے گی تو مصنف کو ایوانِ اقتدار کی سرگرمیوں اور پاکستانی ابوالحسنوں کی خود فراموشیوں کا ہر واقعہ وقت کی زنجیر میں جکڑا ہوا ملے گا۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ خلیفۂ بغداد کا مقصد محض تفریحِ طبع تھا لیکن یہاں ابوحسین سرکار کی آڑ لے کر جو تماشا کھیلا گیا اس کا مقصد جمہوریت کو فنا کرنا تھا۔

گزشتہ چند ہفتوں سے پاکستان کی دونوں صوبائی اسمبلیوں میں کرسیِ اقتدار کی خاطر رسّہ کشیاں اور ریشہ دوانیاں برابر جاری ہیں۔ مغربی پاکستان میں مسلم لیگ نے نیشنل عوامی پارٹی سے رشتہ جوڑا لیکن ری پبلکن پارٹی نے اپنے وزیرِ اعلیٰ کو قربان کر کے اور کئی بوالہوسوں کو وزارت کی بھیک دے کر اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ نے پہلے تو نیشنل عوامی پارٹی کو توڑنا چاہا لیکن جب نیشنل عوامی پارٹی نے اس کا ساتھ نہ دیا تو کرشک پارٹی کو سبز باغ دکھایا گیا جس کے لیڈر گورنر فضل الحق اور مسٹر حمید الحق چودھری ہیں۔ مسٹر یوسف علی چودھری نے ڈھاکے کی کمان سنبھالی اور مسٹر حمید الحق چودھری اور مسٹر چندریگر کو کراچی کا مورچہ سونپا گیا۔

اب واقعات کی رفتار تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ ۳۰ مارچ کی

رات کو گورنر فضل الحق سے سفارش کرتے ہیں کہ صوبائی اسمبلی کا اجلاس جون تک کے لیے برخاست کر دیا جائے۔ گورنر کہتے ہیں رات کے وقت میں نہ دیکھ سکتا ہوں نہ سن سکتا ہوں۔ دن نکل لے تو آپ کی تجویز پر غور کروں گا۔ ۳۱ مارچ کا سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے مگر گورنر فضل الحق فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اب مرکزِ ثقل کراچی منتقل ہو جاتا ہے۔ مسٹر عطا الرحمٰن وزیرِ اعظم نون سے گورنر کی شکایت کرتے ہیں کہ انہوں نے میری سفارش نہ مان کر آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی وزیرِ اعظم کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے مشرقی پاکستان کے گورنر کو برطرف نہ کیا تو ان کی جماعت، نون وزارت کی حمایت سے دست کش ہو جائے گی۔ ادھر مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ اپنے مہروں کی نقل و حرکت کا بغور مطالعہ کر رہی ہے۔ ڈھاکہ سے ٹیلی فون کا انتظار ہے۔ ایوانِ صدر سے طلبی کی امید ہے۔ وزیرِاعظم نون جلدی جلدی اپنی کابینہ کا ہنگامی اجلاس طلب کرتے ہیں مگر اس کابینہ کے اندر بھی ایسے افراد موجود ہیں جو عطا الرحمان کی وزارت کو برطرف کرانے میں پیش پیش ہیں۔ غرضیکہ اجلاس ہوتا ہے اور ساڑھے سات بجے شام کے وقت گورنر فضل الحق کی برطرفی کا فیصلہ کرتا ہے۔ آٹھ بجے صدرِ مملکت اس پروانے پر دستخط ثبت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی گورنر فضل الحق سے ٹیلی فون پر کچھ گفتگو کرتے ہیں اور مسٹر چندریگر اور مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری کو ایوانِ صدر میں طلب کرتے ہیں۔ اب ڈرامے کا سین دوبارہ ڈھاکہ منتقل ہو جاتا ہے۔ گورنر فضل الحق اسی رات مسٹر عطا الرحمان کی وزارت کو برطرف کرتے ہیں اور پونے گیارہ بجے کرشک پارٹی کے لیڈر مسٹر ابو حسین سرکار کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔ مسٹر ابو حسین سرکار ہارون رشید کے تخت پر بیٹھتے ہی گورنر کو اسمبلی برخاست کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور گورنر اس مشورے کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔

مگر پہلی اپریل کا سورج طلوع ہوتا ہے تو نہ گورنر فضل الحق کی گورنری رہتی ہے اور نہ ابو حسین سرکار کی وزارت۔ مسٹر عطا الرحمان ۳۰۔۱۱ بجے دن کے وقت نئے گورنر کے روبرو دوبارہ وزارت کا حلفِ وفاداری اٹھا لیتے ہیں اور جو ڈرامہ ۳۰ مارچ کی رات کو شروع ہوا تھا ختم ہو جاتا ہے۔

کتنے ''پوشیدہ ہاتھ'' جمہوریت کو نیست و نابود کرنے پر آمادہ ہیں۔ ذرا جمہوریت غافل ہوئی اور انہوں نے شب خون مارا۔ اس لیے جو لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ''پوشیدہ ہاتھوں'' کو فیصلہ کن شکست ہو چکی ہے اور اب ان میں مزید سازشوں کی سکت باقی نہیں رہی ہے وہ غلطی پر

ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جمہوریت کے قلعے میں جگہ جگہ شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی صفوں میں طالع آزماؤں اور مفاد پرستوں کی فراوانی ہے اور اس کے کمانداروں میں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو اپنے ضمیر کو بڑی ارزاں قیمت پر دشمنوں کے ہاتھ فروخت کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں اگر جمہوریت فنا ہونے سے بچ گئی تو مسٹر عطا الرحمان کی وزارت اس پر فخر نہیں کر سکتی کیونکہ اس وزارت نے اپنے دورِ حکمرانی میں جمہوری قدروں کو فروغ دینے اور جمہورِ پاکستان کے مسائل کو حل کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔ جمہوریت توڑ جوڑ سے فروغ نہیں پاتی بلکہ اس کے لیے جمہور کا اعتماد حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کی بے لوث خدمت کرنی ہوتی ہے، ان کے جذبۂ ملی کو ابھارنا پڑتا ہے اور ان کی زندگی کو خوش گوار و مطمئن بنانے کی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ جب تک مسٹر عطا الرحمان ان بنیادی فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہیں گے ان کی وزارت مسلسل ''پوشیدہ ہاتھوں'' کی زد میں رہے گی۔

۱۶ اپریل ۱۹۵۸ء

عہد شکنی

''اس قانون کو اپنی طبعی موت مرنے دیجیے''— ''اگر میرے الفاظ کی کوئی قیمت ہے تو میں یقین دلاتا ہوں'' ''میں نے اب تک ایوان میں یا اس کے باہر جو وعدے کیے ہیں ان کو ضرور پورا کیا ہے'' ''حکومت کا کوئی ارادہ نئے سیکیورٹی ایکٹ کا نہیں ہے''— یہ تھے مسٹر سہروردی کے قیمتی وعدوں کے قیمتی الفاظ جن کو وزیرِ اعظم نے ۱۸ فروری کو قومی اسمبلی میں بار بار دہرایا اور مسٹر محمود علی سے بار بار استدعا کی کہ وہ سیکیورٹی ایکٹ کی تنسیخ کے بارے میں اپنی تجویز واپس لے لیں۔

افسوس ہے کہ مسٹر سہروردی نے اپنے الفاظ کا احترام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اس وقت جبکہ سیکیورٹی ایکٹ کی ''طبعی موت'' میں فقط دو دن باقی تھے ایک آرڈیننس کے ذریعے اس رسوائے زمانہ قانون کی ''عمرِ طبعی'' میں ایک سال کا اضافہ کر دیا۔ مسٹر سہروردی نے قومی اسمبلی میں کہا تھا کہ اگر ہنگامی حالات پیدا ہوئے اور حکومت کو نیا قانون بنانا ہی پڑا تو حکومت ''ایوان کے روبرو ایک ایسا مسودۂ قانون رکھے گی جو اِن دفعات سے پاک ہوگا جن پر وقتاً فوقتاً اعتراض کیا جاتا ہے''— ان کی رائے میں کسی شہری کو بلا مقدمہ چلائے ہوئے نظر بند کرنا قابلِ اعتراض بات ہے۔

وزیرِ اعظم نے قومی اسمبلی سے تین وعدے کیے تھے۔ اوّل یہ کہ سیکیورٹی ایکٹ کو طبعی موت مرنے دیا جائے گا۔ دوئم اگر ہنگامی حالات پیدا ہوئے تو نیا مسودۂ قانون اسمبلی میں پیش کیا

جائے گا۔ سوئم سیکیورٹی ایکٹ میں ترمیم کی جائے گی تاکہ نظر بندوں پر عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکے مگر وہ مسٹر سہروردی جنہوں نے اب تک اپنا ''ہر وعدہ پورا کیا ہے'' اور وہ مسٹر سہروردی جو حزبِ مخالف کے قائد کی حیثیت سے ہمیشہ ان کالے قانونوں کی مخالفت کرتے تھے اور وہ مسٹر سہروردی جن کی جماعت نے مشرقی پاکستان میں سیفٹی ایکٹ کو منسوخ کر دیا ہے فقط ایک نہیں بلکہ اپنے تین وعدوں سے پھر گئے۔ انہوں نے سیکیورٹی ایکٹ کو طبعی موت مرنے نہیں دیا۔ انہوں نے نیا مسودۂ قانون قومی اسمبلی کے روبرو پیش نہیں کیا حالانکہ قومی اسمبلی کا اجلاس چار دن پہلے تک جاری تھا۔ انہوں نے سیکیورٹی ایکٹ میں نظر بندوں پر عدالت کے روبرو مقدمہ چلانے کی دفعہ بھی نہیں رکھی۔

وزیرِ اعظم قومی اسمبلی میں نہایت سنجیدگی اور ذمّے داری سے چند وعدے کرتے ہیں۔ پاکستان کے باشندے وزیرِ اعظم کے وعدوں پر اعتبار کر لیتے ہیں، مسٹر محمود علی اپنا مسودۂ قانون واپس لے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ سیکیورٹی ایکٹ کی طبعی موت میں فقط ایک ہفتہ باقی رہ جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم جاپان کی سیاحت پر روانہ ہوجاتے ہیں، دو دن بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بھی برخاست ہوجاتا ہے، ارکانِ اسمبلی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ تب صدر جمہوریہ کا ایک آرڈیننس اچانک جاری ہوتا ہے کہ سیکیورٹی ایکٹ میں ایک سال کی توسیع کر دی گئی ہے۔ اب اگر اہلِ وطن حکومت پر عہد شکنی کا الزام لگائیں اور یہ شبہ ظاہر کریں کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے اور آرڈیننس کا استعمال کر کے آئین کی روح مجروح کی گئی ہے تو کیا وہ حق بجانب نہ ہوں گے۔ اگر حکومت سیکیورٹی ایکیٹ کو ملک کے تحفظ اور بقا کے لئے اتنا ہی ضروری خیال کرتی تھی تو دو دن پہلے تک قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا نئے سیکیورٹی ایکٹ کا مسودہ اسمبلی کے سامنے کیوں نہ پیش کیا گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اربابِ اختیار اس رسوائے زمانہ قانون کو قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم یا خوف محسوس کرتے تھے۔

کالے قانونوں کے بارے میں اہلِ وطن کے جذبات و احساسات کسی سے پوشیدہ نہیں البتہ ہم اُن ''تخریب پسندوں'' میں سے تھے جنہوں نے فروری ہی میں یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ''سیکیورٹی ایکٹ کو آئندہ اپریل میں مرنے سے پہلے بچا لیا جائے گا'' — (لیل و نہار۔ ۲۴ فروری) افسوس ہے کہ ہمارا یہ اندیشہ درست نکلا۔

سیکورٹی ایکٹ آج نہیں تو کل منسوخ ہو کر رہے گا کیونکہ پوری قوم کا مطالبہ یہی ہے لیکن

اس سلسلے میں مسٹر سہروردی کے وعدوں کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

۵ مئی ۱۹۵۷ء

ڈاکٹر خان صاحب کی شہادت

ڈاکٹر خان صاحب قتل کر دیے گئے — قاتل کے خنجر نے جنگِ آزادی کا ایک اور آزمودہ کار سپاہی ہم سے چھین لیا۔ مگر یہ خنجر ایک مردِ کہن سال کے سینے ہی میں پیوست نہیں ہوا۔ یہ خنجر پاکستان کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔ اس خنجر سے ہماری جمہوریت کا خون ہوا ہے۔ نیکی، سادگی اور خلوص کا خون ہوا ہے، اخوت اور انسانیت کا خون ہوا ہے۔

پاکستان کا یہ مردِ مجاہد گزشتہ ربع صدی سے ملک وقوم کی خدمت میں مصروف تھا۔ اس نے سرحد میں جنگِ آزادی کا پرچم اس وقت بلند کیا جب برطانوی اقتدار کی ہیبت سے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوتا تھا اور وہ سورما جو آج حُب الوطنی کے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں غیر ملکی آقاؤں کی کفش برداری میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب نے نہ نام ونمود اور عزت ومرتبت کی خاطر قربانیاں دیں اور نہ کبھی ان قربانیوں کا معاوضہ طلب کیا۔ وزارت نے متعدد بار ان کے قدم چومے اور اقتدار نے بارہا ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں مگر ان کی زندگی دولت وثروت کی آلودگیوں سے ہمیشہ بے داغ رہی۔ نہ کبھی ان کے مزاج وکردار میں تبدیلی آئی نہ رہن سہن میں۔ نہ ان کی دوستی اور مروت میں فرق آیا نہ اخلاق اور غریب نوازی میں۔ ان کی ہر دلعزیزی کا راز اسی قلندرانہ بے نیازی میں پوشیدہ ہے۔

نواب زادہ لیاقت علی خان کے بعد ڈاکٹر خان صاحب کی اچانک موت ایک قومی المیہ ہے جس پر ملک کے ہر گوشے میں ماتم کیا جائے گا۔ ایک نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے

گی۔ قاتل نے ایسے نازک وقت میں انہیں ہم سے جدا کیا ہے جب جمہوریت کی کشتی بیچ منجدھار میں ہے اور بادِ مخالف کے جھونکے اسے ڈبونے پر آمادہ ہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب کا وجود ملک میں جمہوری قدروں کا ضامن تھا۔ ان کی رحلت ان قدروں پر ایک کاری ضرب ہے۔

پاکستان کے جمہوریت پسند عوام کو داروگیر کا وہ ہولناک زمانہ یاد ہے جب ڈاکٹر خان صاحب نے آج سے چار سال پیشتر نظر بندی سے نکل کر پہلی بار میدانِ سیاست میں قدم رکھا تھا۔ ملک میں شہری آزادی مفقود تھی۔ حکومت اور مسلم لیگ پر اعتراض کرنے والوں کو غدار کہہ کر سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا جاتا تھا چنانچہ سرحد اور پنجاب میں، سندھ، بلوچستان اور کراچی میں اور مشرقی پاکستان میں ہزاروں بے گناہ جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر خان صاحب ہی کی شخصیت تھی جس نے ملک کی سیاسی فضا بدل دی۔ جمہوری آزادی کی خوش گوار روایت قائم کی، نوکر شاہی کی فرعونیت کو لگام دی اور سیاسی کارکنوں میں خود اعتمادی کی روح پھونکی۔ یہ درست ہے کہ مرحوم اپنے دورِ اقتدار میں سیفٹی ایکٹ کو منسوخ نہ کرسکے لیکن لوگوں کو جتنی شخصی آزادی ان کے دورِ حکومت میں ملی ان سے پیشتر یا بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر خان صاحب سے پیشتر اقتدار ایک مخصوص جماعت کی اجارہ داری بن گیا تھا۔ مرحوم کا یہ کارنامہ بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ انہوں نے یہ اجارہ داری ختم کر دی اور اربابِ اقتدار کو حزبِ اختلاف کی اہمیت محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔

ابھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے عوامل و محرکات ذاتی تھے یا اس المناک حادثے کی پیچھے کسی خاص گروہ کا ہاتھ ہے البتہ حکومت سے ہمارا پُرزور مطالبہ ہے کہ اس سانحے کی پوری پوری تحقیقات کی جائے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کے قتل کو سات سال گزر چکے ہیں لیکن اب تک یہ نہ معلوم ہوسکا کہ قتل کے پیچھے کن افراد کا ہاتھ تھا۔ ہمیں امید ہے کہ اس مجرمانہ غفلت کی داستان دہرائی نہ جائے گی اور نہ ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کی آڑ لے کر پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کو ان کے شخصی اور آئینی حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۱ مئی ۱۹۵۸ء

پھر وہی وزارتی بحران

مسٹر عطاء الرحمان کی وزارت بالآخر مستعفی ہوگئی کیونکہ ۱۸ جون کو جب مشرقی پاکستان اسمبلی کا اجلاس ہوا تو عوامی لیگ پارٹی اکثریت کا اعتماد حاصل نہ کرسکی۔ خود نو عدد عوامی لیگی ممبر حزب اختلاف میں شامل ہوگئے۔ دس عدد کانگریسیوں نے بھی حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا اور نیشنل عوامی پارٹی جس کے ۲۸ ممبروں نے مارچ کے اجلاس میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی اس دفعہ غیر جانب دار رہی۔ اس طرح مسٹر عطاء الرحمان ۴۷ ارکان کی تائید سے محروم ہوگئے اور جب رائے شماری ہوئی تو ان کو ۱۳۸ کے مقابلے میں ۱۲۶ ووٹ ملے۔ وزارت ٹوٹ گئی۔

کہنے کو تو جو کچھ ہوا بڑے آئینی اور جمہوری طریقے پر ہوا لیکن جو لوگ مرکزی اور صوبائی سربراہوں کی حالیہ سرگرمیوں سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں ان کو اس وزارتی بحران کے اسباب ومحرکات کی تہہ تک پہنچنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی۔ وہ ریشہ دوانیوں کے رشتے باآسانی جوڑ سکتے ہیں اور ان سے نتائج بھی اخذ کرسکتے ہیں۔

عطاء الرحمان وزارت کی یہ شکست قطعاً غیر متوقع نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا تھا کہ ''خود اقتدار دونوں صوبوں میں یکساں مصروف عمل ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی موجودہ حکومت سے مطمئن نہیں اس لیے اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں،اگر عوامی لیگ کو شکست ہوجائے یا الیکشن سے قبل وہاں گورنر راج قائم ہوجائے تو حیرت نہیں۔''

یوں تو عوامی لیگ کو کرسی اقتدار سے ہٹانے کے منصوبے مدت سے بن رہے تھے لیکن

صوبائی وزارت کو توڑنے کی کوشش گزشتہ مارچ میں شدت سے شروع ہوئی۔ چنانچہ مسٹر فضل الحق نے اوپر کا اشارہ پاتے ہی ۳۰ مارچ کو وزارت توڑ دی اور مسٹر ابو حسین سرکار کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کر دیا لیکن وزیرِ اعظم نون کی وزارت اس وقت مرکزی پارلیمنٹ میں عوامی لیگ کی خوشنودی کی خواہاں تھی لہٰذا اسے مجبوراً مسٹر سہروردی کی بات ماننی پڑی اور عوامی لیگ کی صوبائی وزارت کو بحال کرنا پڑا۔ مگر سازشی عناصر نے ہار ماننے کے بجائے اپنی ریشہ دوانیاں اور تیز کر دیں۔ موہن میاں، حمیدالحق چوہدری، میاں ممتاز دولتانہ اور دوسرے پیشہ ور سیاست داں کراچی کا طواف کرنے لگے۔ کراچی سے بھی جو اٹھتا مشرقی بنگال ہی کا رخ کرتا۔ آخر جوڑ توڑ، سودے بازیاں، سیاسی دباؤ اور رشوتیں رنگ لائیں اور خود عوامی لیگ کے اندر ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے غنیم کے لیے قلعے کا پھاٹک کھول دیا۔ مہم بڑے پُر امن طریقے پر سر ہو گئی۔

عوامی لیگ نے اپنے ۲۲ ماہ کے عہدِ اقتدار میں اگر مشرقی پاکستان کی خدمت خلوص سے کی ہوتی اور وہ توقعات پوری کی ہوتیں جو صوبے کے لوگوں کو اپنے ان نمائندوں سے تھیں تو عوامی لیگ ان سازشوں کو بڑی آسانی سے ناکام بنا سکتی تھی۔ آخر ستمبر ۱۹۵۶ء میں یہ جماعت عوام ہی کے بل بوتے پر تو برسرِ اقتدار آئی تھی۔ اس وقت لوگوں کو یہ امید تھی کہ عوامی لیگ غذائی قلت کو دور کر سکے گی، صوبے کا نظم و نسق بہتر ہو جائے گا اور شہری آزادیوں پر جو پابندیاں ابو حسین سرکار نے لگا رکھی ہیں ان سے نجات ملے گی مگر افسوس ہے کہ عوامی لیگ ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے خود بھی جوڑ توڑ میں لگ گئی۔ حالانکہ مخالفین کے جوڑ توڑ کا جواب جوڑ توڑ نہ تھا بلکہ عوام کی چارہ سازی و غمگساری تھی۔ چنانچہ ہم نے مارچ کے وزارتی بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے ۶ اپریل کو عرض کیا تھا کہ ''جب تک مسٹر عطاء الرحمان ان بنیادی فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہیں گے ان کی وزارت مسلسل ''پوشیدہ ہاتھوں'' کی زد میں رہے گی''۔

اب مسٹر عطاء الرحمان اپنے سابق حامیوں پر الزام لگا رہے ہیں کہ ان کا کوئی اصول اور اعلیٰ مقصد نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کی خواہش انہیں مخالف کیمپ میں لے گئی ہے۔ ان کے یہ تاثرات ممکن ہے حقائق پر مبنی ہوں لیکن کیا انہوں نے یہ بھی سوچا کہ گزشتہ دو سال میں ان کی حکومت اور ان کی جماعت کے لیڈروں نے اصول پرستی کی کتنی مثالیں قائم کیں۔ کیا انہوں نے اُن وعدوں کا پاس کیا جو عوامی لیگ نے الیکشن میں عوام سے کیے تھے اور اگر اصول پرستی ہی ان کا شعار تھا تو نیشنل عوامی پارٹی کی تجاویز کیوں مسترد کی گئیں۔ کیا یہ تجاویز عوامی لیگ کے انتخابی منشور

کے عین مطابق نہ تھیں۔

ارباب اختیار عوامی لیگ کو اقتدار سے محروم کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ انتخابات کے موقع پر اگر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی حکومت قائم رہی تو صوبے کی غالب اکثریت عوامی لیگ کا ساتھ دے گی۔ اب کہ یہ کانٹا نکل گیا ہے ان کا خیال ہے کہ عام انتخابات میں وہ عوامی لیگ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مشرقی پاکستان کی وزارتی تبدیلی کا اثر مرکزی سیاست پر لامحالہ پڑے گا۔ گمانِ غالب ہے کہ عوامی لیگ نون وزارت کی حمایت سے دستکش ہو جائے گی کیونکہ عوامی لیگی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ عطاء الرحمان کی وزارت کو گرانے میں مرکز کا ہاتھ نہیں ہے۔ اگر عوامی لیگ نے نون وزارت کا ساتھ نہ دیا تو ری پبلکن پارٹی کرشک پارٹی اور مسلم لیگ کی حمایت حاصل کرنے پر مجبور ہوگی کہ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان میں الیکشن سے چند ماہ پیشتر یہ وزارتی بحران پیدا کیا ہے ان کا مقصد ہی یہ ہے کہ نون وزارت کو، کرشک پارٹی اور مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ خود ری پبلکن پارٹی کے اندر ایک گروہ ایسا ہے جو مسلم لیگ کے ساتھ مل کر عوامی لیگ کو زک دینا چاہتا ہے۔ پاکستان کے عام لوگوں کو اس بات سے قطعاً دلچسپی نہیں کہ مرکزی وزارت کی کرسیوں پر کون لوگ براجمان ہوتے ہیں۔ البتہ ان کو یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ان آئے دن کی وزارتی تبدیلیوں سے کہیں پاکستان کا استحکام ہی خطرے میں نہ پڑ جائے اور عام انتخابات کہیں پھر ملتوی نہ ہو جائیں۔ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کی نزاع ہنوز جاری ہے اور ایک یونٹ کا مسئلہ بھی ابھی تک طے نہیں ہو چکا ہے پھر کیا عجب کہ مرکز میں کوئی نئی مخلوط وزارت بنے تو مغربی پاکستان میں بھی وزارتی تبدیلیاں کی جائیں اور نزاعی مسائل کو بہانہ بنا کر الیکشن کو نامعلوم مدت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔

۲۲ جون ۱۹۵۸ء

صدر راج — چوتھی بار

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرکز نے مشرقی پاکستان کی وزارت کو برطرف کر کے صوبے میں صدر راج نافذ کر دیا۔ عذر یہ کیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں وہاں کوئی مستحکم اور پائیدار وزارت قائم نہیں ہو سکتی۔ ثبوت کے طور پر اسمبلی میں عطاء الرحمان وزارت اور سرکار وزارت کی شکستوں کو پیش کیا گیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو دعویٰ جتنا بے بنیاد ہے دلیلیں اتنی ہی کمزور ہیں۔

مشرقی پاکستان میں گزشتہ چار برس میں پارلیمانی حکومت چار بار برطرف کی گئی اور ہر بار یہی عذر پیش کیا گیا کہ وہاں کوئی مستحکم اور پائیدار وزارت قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر صورتِ حال واقعی یہی تھی تو اس کو ختم کرنے کا آسان اور جمہوری طریقہ یہ تھا کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کروائے جاتے لیکن مرکز نے ایسا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ توڑ جوڑ اور سودے بازی کا بازار بدستور گرم رہا۔ مخلوط وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں اور جمہوری روایات کا خون ہوتا رہا۔ اقتدار نے اس جوڑ توڑ کی مذمت کرنے کے بجائے ان سازشی عناصر کی ہمت افزائی کی جو وزارت سازی اور وزارت شکنی کے فن میں طاق تھے۔ صوبائی اسمبلی میں عطاء الرحمٰن وزارت کی شکست اسی توڑ جوڑ کا نتیجہ تھی کیونکہ دس کانگریسیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ نوعوامی لیگی ان سے منحرف ہو گئے تھے اور نیشنل عوامی پارٹی نے اُن کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں اگر گورنر صاحب ابوحسین سرکار کو وزارت سازی کی دعوت دینے کے بجائے یہ کہہ کر دفع ۱۹۳ نافذ کر دیتے کہ ان

ناقابلِ اعتبار عناصر کی مدد سے کوئی مستحکم وزارت نہیں بن سکتی جو کل ایک جماعت کی حمایت کرتے ہیں اور آج دوسری جماعت کی تو ان کی بات میں بڑا وزن ہوتا لیکن انہوں نے ابوحسین سرکار کو تو فوراً وزارت بنانے کی دعوت دے دی حالانکہ ان کی بارہ ممبروں کی اکثریت مشکوک اور غیر معتبر عناصر پر مشتمل تھی (جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا) لیکن جب ابوحسین سرکار کو شکست ہوگئی تو مسٹر عطاءُالرحمان کو وزارت سازی کی اجازت دینے کے بجائے وزارت اور اسمبلی دونوں کو دو ماہ کے لیے برخاست کر دیا گیا۔ حالانکہ عوامی لیگ نے ابوحسین سرکار کو چودہ ممبروں کی اکثریت سے شکست دی تھی۔ ناقابلِ اعتبار عناصر اگر ابوحسین سرکار کی حمایت کریں تو مستحکم وزارت بنتی ہے لیکن یہی عناصر اگر عطا الرحمان کی حمایت کریں تو مستحکم وزارت نہیں بنتی — یہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

بہر حال اب کہ مشرقی پاکستان میں صدر راج قائم ہو چکا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ مرکز دو ماہ کے اندر ہی پارلیمانی وزارت کو بحال کرنے کی کوشش کرے گا تا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کراچی کے اربابِ اقتدار ان کو ان کے آئینی حق سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔ عوامی لیگ کے بدترین دشمنوں نے بھی دفعہ ۱۹۳ کے نفاذ کو ''افسوسناک حادثے'' سے تعبیر کیا ہے۔ ایسی صورت میں تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ بجٹ کی منظوری کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو پارلیمانی حکومت کو بحال کر دیا جائے تا کہ تلخیوں اور غلط فہمیوں میں مزید اضافہ نہ ہونے پائے اور مرکزی وزارت کسی نئے بحران کا شکار نہ ہو۔ ہمارے ملک میں ایسے عناصر کی کمی نہیں جو اسرے سے جمہوریت ہی کے خلاف ہیں اور اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ الیکشن بے کار چیز ہے اور صدر کو چاہیے کہ وہ تمام اختیارات خود سنبھال لیں۔

اب اگر مرکز کسی وزارتی بحران کا شکار ہوا تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ناپائیداری کا جو عذر مشرقی پاکستان میں پیش کیا گیا وہی مرکزی وزارت کو توڑنے کا باعث بنے۔ ہنگامی حالات کی آڑ لے کر الیکشن کو نامعلوم مدت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے اور اس طرح پاکستان کے لوگ اپنے جمہوری حق سے محروم ہو جائیں اور ہمارا آئین جو الیکشن کے بعد ہی نافذ ہوگا ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جائے۔

۲۹ جون ۱۹۵۸ء

اسمبلیوں کے اجلاس

جمہوری ملکوں میں قانون ساز اسمبلیوں کا کام فقط قانون کے مسودوں پر غور کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کے فرائض اتنے مختلف النوع ہوتے ہیں کہ یہ اسمبلیاں — خواہ مرکزی ہوں یا صوبائی — تقریباً سارا سال انہیں میں اُلجھی رہتیں ہیں۔ انتظامیہ کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں پر وزیروں سے باز پُرس کرنا، عام لوگوں کی شکایتوں اور تکلیفوں کو دور کروانا، سرکاری افسروں اور ملازموں کے کاموں پر کڑی نظر رکھنا، قوم کی مادّی اور روحانی حالت کو سدھارنے کی خاطر مفید تجاویز پیش کرنا، جمہوری حقوق کی حفاظت کرنا، غرض چھوٹے بڑے اتنے کام ہوتے ہیں کہ اسمبلی کے ممبروں کو اپنے نجی کاموں کے لیے بھی مشکل سے وقت ملتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ، اٹلی، جاپان، ترکی، سیلون، برما، ہندوستان جس ملک میں بھی مغربی طرز کی پارلیمانی جمہوریت رائج ہے قانون ساز اسمبلیوں کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور ممبروں کی مصروفیتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

لیکن ہمارے ملک میں اسمبلی کے ممبروں کو قریب قریب سارا سال فرصت ہی رہتی ہے۔ یہاں اسمبلی کا اجلاس رسم پوری کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے یا صدر مملکت اور صوبائی گورنروں کے نافذ کردہ آرڈیننسوں پر انگوٹھا لگانے کی خاطر۔ مثلاً جس وقت یہ سطریں آپ کی نظر سے گزریں گی مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی نافذ شدہ آرڈیننسوں پر انگوٹھا لگا رہی ہوگی اور قومی پارلیمنٹ کی میز کرسیوں پر جمے ہوئے گرد و غبار کو صاف کیا جا رہا ہوگا۔ صوبائی اسمبلی کا ایجنڈا شائع ہو چکا ہے البتہ مرکزی اسمبلی کے ایجنڈے سے ہم اب تک آگاہ نہیں مگر ہمیں اپنے قومی نمائندوں پر بھی اتنا

ہی اعتماد ہے جتنا صوبائی نمائندوں پر اس لیے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں اب کے بھی کسی ایسے مسئلے پر کوئی مفید بحث نہ ہوگی جس کا تعلق عام لوگوں کی حالت سدھارنے سے ہے اور نہ کوئی ایسا فیصلہ کیا جائے گا جس سے پبلک کا بار ہلکا ہو۔ اگر آپ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہمارے نمائندے سنجیدگی اور سکون سے بیٹھ کر اُن تدابیر پر غور کریں گے جن سے مہنگائی دور ہو سکتی ہے یا وہ اسمگلنگ، رشوت اور قومی دولت کے زیاں کو روکنے کے منصوبے بنائیں گے یا تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر کوئی موثر قدم اٹھائیں گے یا گندم کی فراہمی میں اب کے پھر جو ناکامی ہوئی ہے اس کے اسباب کا جائزہ لیں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ ہمارے نمائندوں کا سارا وقت اب کے بھی وزارتوں کو قائم رکھنے یا وزارتوں کو گرانے کی کوشش میں صرف ہوگا۔ اس میں نہ حزبِ اقتدار کی تخصیص ہے اور نہ حزبِ مخالف کی۔ اسمبلی کے حمام میں سبھی برہنہ ہیں۔

دوسرے ملکوں میں ہر پارلیمانی جماعت تقسیم کار کے اصول پر عمل کرتی ہے۔ پارٹی کے کچھ ممبر تعلیم کے ماہر ہوتے ہیں، کچھ حفظانِ صحت کے، کچھ امورِ خارجہ سے آگہی پیدا کرتے ہیں، کچھ زرعی مسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح تجارت، صنعت و حرفت، فنونِ لطیفہ اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو الگ الگ ممبروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر پارلیمانی پارٹی کا الگ دفتر ہوتا ہے جہاں ممبروں کو مختلف موضوعات اور مسائل پر ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبر جب ایوان میں تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری پارلیمانی جماعتوں میں نہ تقسیم کار کے اصول پر عمل ہوتا ہے نہ پارٹی کا کوئی رکن مسائلِ حاضرہ سے پوری واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھتا، نہ ان جماعتوں کے باقاعدہ دفتر ہوتے ہیں جو پارٹی کے ممبروں کو معلومات بہم پہنچائیں۔ اور نہ ممبروں میں اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ از خود کسی خاص موضوع کا بالتفصیل مطالعہ کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلی میں شاید ہی کوئی بشر ہو جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ نظامِ اراضی کا ایکسپرٹ ہے یا بینکنگ اور صنعت و تجارت کے رموز سے آگاہ ہے یا امورِ خارجہ کا ماہر ہے یا تعلیمی مسائل پر پوری نظر رکھتا ہے۔

گیارہ برس کی مدت کم نہیں ہوتی۔ اگر اس درمیان لوٹ مار کے بجائے یا لوٹ مار کے پہلو بہ پہلو تھوڑی سی توجہ پارلیمانی زندگی کو سدھارنے اور پارلیمانی روایتوں کو فروغ دینے میں

صرف کی جاتی تو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر آرڈیننسوں پر انگوٹھا لگانے ہی کو اپنا بنیادی فرض نہ سمجھتے اور ملک اس پستی اور زبوں حالی کا شکار نہ ہوتا۔ کیا ہماری پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں کوئی ایسا گروپ نہیں جو دوسرے ملکوں کی پارلیمانی زندگی سے سبق لے اور اپنے مختلف النوع فرائض کو سنجیدگی سے محسوس کرے؟

۲۴ اگست ۱۹۵۸ء

صبر وضبط کا امتحان

کیا طوائف الملوکی ہے، کیا لاقانونیت اور افراتفری ہے۔ جن کا منصب قانون بنانا اور قانون کی حفاظت کرنا ہے وہ چھ آدمیوں کی خاطر ناجائز کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مشرقی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر کسی پوشیدہ طاقت کے اشارے پر اسی ناجائز کو ناجائز ثابت کرتے ہوئے ایک اس سے بڑے ناجائز فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس پر اسمبلی میں جوتم پیزار، دھینگا مشتی ہوتی ہے، سر ٹوٹتے ہیں، کرسیاں، قلم دان، شیشے ٹوٹتے ہیں، پولیس کے افسر اور غنڈے ایوان میں دندناتے پھرتے ہیں اور ان لوگوں کو قانون شکنی کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے جن سے قانون سازی کی توقع کی جاتی تھی۔

آپ نے مشرقی پاکستان کی سیر کرلی۔ اب مغربی پاکستان کا تماشہ دیکھیے۔ یہاں کراچی میں شہریوں پر اشک آور گیس کے گولے پھینکے جاتے ہیں، لائل پور میں مزدوروں پر گولیاں چلتی ہیں، درجنوں شہروں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی جاتی ہے، رضا کاروں کی تنظیم کو ایک آرڈی نینس کے ذریعے خلافِ قانون قرار دیا جاتا ہے۔ جواب میں سول نافرمانی کی دھمکی دی جاتی ہے، عورتوں اور بچوں کا دن دہاڑے قتل واغوا، چور بازاری، نفع خوری، اسمگلنگ، پرمٹ اور لائسنس کی سیاسی رشوتیں ان پر مستزاد ہیں — جگ ہنسائی مکمل ہے۔

حکومت اس طوائف الملوکی اور لاقانونیت پر تشویش کا اظہار کرتی ہے اور طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔ وزیرِ اعظم قوم سے قانون اور جمہوریت کے نام پر اپیل کرتے ہیں مگر

نہ دھمکی کارگر ہوتی اور نہ اپیل کی کوئی پروا کرتا۔ ایک طوفانِ بلا ہے جو مُنھ کھولے بڑھتا چلا آتا ہے اور ابھی تو الیکشن کو — اگر الیکشن ہوئے — چار مہینے باقی ہیں۔ ابھی تو جذبات اور مشتعل کیے جائیں گے۔ بڑے صبر آزما ہیں چار مہینے۔

اس ساری ہنگامہ خیزی اور اشتعال انگیزی کی ذمہ داری کس پر ہے۔ لاقانونیت اور افراتفری کا یہ طوفان کون لایا ہے۔ مسلم لیگ کہتی ہے اس کی ذمہ داری ری پبلکن پارٹی پر ہے۔ اقتدار ہمارے حوالے کر دو۔ ہم ایک دن میں سب کو سیدھا کر دیں گے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ سرحد کا مردِ آہن ان دنوں ہمارا صدر ہے۔ کیا تمہیں وہ پُر امن دن یاد نہیں جب اس مردِ آہن نے ڈنڈے کے قانون سے بڑے بڑوں کے بل نکال دیے تھے۔ کرشک پارٹی کہتی ہے مشرقی پاکستان میں لاقانونیت کی ساری ذمہ داری عوامی لیگ پر ہے جو غنڈوں کی سرپرستی کرتی ہے اور لوگوں میں دہشت پھیلاتی ہے۔ حکومت ہمارے حوالے کر دو پھر دیکھو الیکشن کتنے آزاد اور غیر جانب دار ہوتے ہیں۔ اگر عوامی پارٹیوں کا ایک امیدوار بھی کامیاب ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔

ری پبلکن پارٹی کے لیڈر کہ سابق مسلم لیگی ہیں اور عوامی پارٹی کے لیڈر کہ سابق مسلم لیگی بھی ہیں اور سابق کرشک بھی، گھر کے بھیدی کی حیثیت سے ان آٹھ سالہ ''قومی خدمات'' کی طویل فہرست پیش کرتے ہیں جن کی مرتکب مسلم لیگ ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ الیکشنوں میں دھاندلیاں اور سیاسی رشوتیں، گولی، لاٹھی چارج، مارشل لا اور نظر بندی، متروکہ املاک کی غلط تقسیم، لائسنسوں اور پرمٹوں کی بے جا نوازشیں، آرڈیننسوں کی بھرمار، سیاسی جماعتوں اور رضا کاروں کی تنظیم پر پابندی غرض کوئی ایسی ناجائز حرکت نہ تھی جو مسلم لیگ سے سرزد نہ ہوئی ہو۔

الزامات اور جوابی الزامات کی تحقیقات ایک فعلِ عبث ہے البتہ ان سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ ہماری کوئی سیاسی جماعت ایسی نہیں جس کی پیشانی لاقانونیت سے داغدار نہ ہو اور ہمارا کوئی سیاسی لیڈر ایسا نہیں جس نے اپنے عہدِ اقتدار میں وہ سب کچھ نہ کیا ہو جس سے طوائف الملوکی اور افراتفری پھیلتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اربابِ ہوس و اقتدار نے گزشتہ گیارہ سال میں پوری ایک نسل کی تربیت جن جمہوریت شکن بے اصولیوں پر کی ہے ان کا خمیازہ آج پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

مگر ان ہمت شکن حالات کو بدلنے کا کیا طریقہ ہے۔ تباہی کے جس جال میں، بدی کے جس چکر میں ہم پھنس گئے ہیں اس سے نکلنے کی کیا صورت ہے۔ بعض لوگ اتنے مایوس ہو چکے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ ساری دنیا میں اصلاح اور ترقی ہوسکتی ہے لیکن پاکستان میں کچھ نہیں ہوسکتا گویا پاکستان کے لوگوں کا خمیر کسی دوسری مٹی سے بنا ہے۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو جہد وعمل کی زندگی میں خود کچھ کرنا نہیں چاہتا البتہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کوئی اتاترک، کوئی ناصر پاکستان کی سرزمین سے اُٹھے اور چشم زدن میں ملک کی کایا پلٹ جائے۔ شاید انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ اپنی اس ذہنیت سے وہ اُن عناصر کے لیے فضا ساز گار کر رہے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ملک میں جمہوریت کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے اور یہاں ''کنٹرولڈ ڈیموکریسی'' ہونی چاہیے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ گیارہ سال میں یہاں جمہوریت کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے اور پھلنے پھولنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا گیا۔ یہ عناصر آج بھی اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح ملک میں طوائف الملوکی اتنی بڑھ جائے کہ انہیں جمہوری تجربوں کو ختم کرنے اور الیکشن کو ملتوی کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جائے اور ہم اُن سب لوگوں سے — خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں — اپیل کرتے ہیں جو الیکشن کے حق میں ہیں کہ وہ جذبات پر قابو رکھیں اور دامنِ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں ورنہ دشمن کے پوشیدہ ہاتھ اُن کے سب سے قیمتی جمہوری حق کا گلا گھونٹ دیں گے اور وہ دن پاکستان کی تاریخ میں یقیناً روزِ سیاہ ہوگا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء

سیاسی اور آئینی مباحث

بحران در بحران

ہمارے ملک میں آئینی اور وزارتی بحران زندگی کا معمول یا یوں کہیے کہ متعدی مرض بن گیا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوٹتا ہے اور قوم کی توجہ، لائق توجہ مسائل کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ ابھی ہم مغربی پاکستان کے وزارتی بحران کا رونا رو رہے تھے کہ صدر جمہوریہ نے امریکی طرزِ حکومت کا قضیہ چھیڑ دیا اور قیاس آرائیوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ ہمارے وزیر مال سید امجد علی صدرِ محترم سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ملک میں مغربی جرمنی کا سا نظامِ حکومت رائج ہونا چاہیے جس میں وزارت کو اسمبلی کے دو تہائی ممبروں ہی کے ووٹ سے برطرف کیا جاسکتا ہے۔ یہ بحث جاری تھی کہ موجودہ آئین کی حرمت و تقدیس پر وزیرِ اعظم مسٹر سہروردی کی تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موصوف کا روئے سخن صدرِ محترم اور وزیرِ مال کے بجائے مغربی پاکستان کی اُن جماعتوں کی طرف تھا جو ایک یونٹ کی مخالف ہیں اور اس کے لیے آئین میں ترمیم چاہتی ہیں۔ لیکن مسٹر سہروردی کا فتویٰ ہے کہ جو لوگ آئین میں ترمیم چاہتے ہیں یا صوبائی خودمختاری کی باتیں کرتے ہیں وہ پاکستان کی سالمیت کے دشمن ہیں۔ ابھی قوم اِن فتووں سے پوری طرح مستفید نہ ہو پائی تھی کہ مشرقی پاکستان سے صوبائی خودمختاری کی آوازیں آنے لگیں اور بالآخر مسٹر سہروردی ہی کی جماعت کی تجویز پر ۳ اپریل کو مشرقی پاکستان اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا۔

دراصل یہ اختلاف دو نظریوں کا اختلاف ہے۔ ایک صف میں وہ عناصر ہیں جن کا خیال ہے کہ ملک کے نظم و نسق کی اصلاح اور ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی کے لیے ایک مضبوط مرکز ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں اور وہ صوبائی اسمبلیوں اور وزیروں کے اثر سے آزاد ہو۔ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے والوں کے ذہن میں طاقت کی اسی مرکزیت کا فلسفہ تھا اور وحدانی طرزِ حکومت اور امریکی طرزِ حکومت کی تبلیغ کرنے والوں کی فکر کی اساس بھی اسی نظریے پر قائم ہے۔ دوسری صف میں وہ عناصر ہیں جن کا خیال ہے کہ ملک میں آزادی اور جمہوریت کے فروغ اور عوام کی اصلاح و فلاح کے لیے ضروری ہے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے اور مرکز کی جانب سے کم سے کم مداخلت ہو۔ ایک یونٹ کی مخالفت کرنے والوں، لسانی بنیاد پر مغربی پاکستان کو کئی صوبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کرنے والوں اور مشرقی پاکستان کے لیے مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرنے والوں کے فکر کی اساس اسی نظریے پر قائم ہے۔ ان دو متصادم نظریوں کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے لیکن کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ برسرِ پیکار عناصر کی نیتوں پر شبہہ کرے یا ان کے خلوص اور جذبۂ حُبّ الوطنی کو مشکوک قرار دے۔

ظاہر ہے کہ امریکی طرز کا نظامِ حکومت قائم کرنا ہو یا ایک یونٹ کو توڑ کر لسانی صوبے بنانا ہوں یا صوبوں کو مکمل خودمختاری عطا کرنا ہو، آئین میں بہرصورت تبدیلی کرنی ہوگی اور آئین میں تبدیلی ہوسکتی ہے کیونکہ آئین کی دفعہ ۲۱۶ کے مطابق پورے آئین کو یا اس کی چند دفعات کو بدلا جاسکتا ہے۔

لیکن آئین کو جوں کا توں رکھنے یا اس میں تبدیلی کرنے سے پیشتر ہمیں پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کی مرضی معلوم کرلینی چاہیے۔ جس آئین ساز اسمبلی نے موجودہ آئین بنایا تھا اس کو قوم نے آئین سازی کے لیے منتخب نہیں کیا تھا اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ موجودہ آئین قوم کی مرضی اور منشا کے مطابق ہے یا نہیں۔ اسی طرح آئین میں تبدیلی چاہنے والے بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ وہ قوم کی مرضی اور منشا کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ قوم کی مرضی اور منشا معلوم کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے ملک میں عام انتخاب۔ عام انتخاب کے موقع پر مختلف عناصر اور دبستانِ فکر کو عوام کے روبرو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر عوام چاہتے ہیں کہ آئین میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو وہ اُن لوگوں کو اپنا نمائندہ چنیں گے جو موجودہ

آئین کے حق میں ہیں۔ اگر عوام اس آئین سے مطمئن نہیں تو وہ آئین میں تبدیلی چاہنے والے عناصر کو منتخب کریں گے۔ بہر حال اس مسئلے کا فیصلہ عوام کی صواب دید پر چھوڑنا چاہیے اور ہمارا ایمان ہے کہ پاکستان کے عوام، پاکستان کے مفاد کے بہترین محافظ ہیں۔

۷ اپریل ۱۹۵۷ء

مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی بحث

۲۴اپریل کو قومی اسمبلی نے دو نہایت اہم قانون منظور کیے۔ ایک پورے پاکستان میں مخلوط انتخاب کا قانون تھا اور دوسرا ووٹروں کی فہرست سازی کا قانون۔ ووٹروں کی فہرست سازی کے قانون کی منظوری کے بعد اب ملک میں عام انتخابات کی تیاریوں کا آغاز ہوگا اور امید کی جاتی ہے کہ مسٹر سہروردی کی حکومت اپنے اس وعدے کو پورا کرے گی کہ عام انتخابات مارچ ۱۹۵۸ء تک ہوجائیں گے۔ رہا مخلوط انتخاب کا مسئلہ سو قومی اسمبلی نے گزشتہ اکتوبر میں مشرقی پاکستان کے لیے مخلوط انتخاب کے اصول کو تسلیم کرلیا تھا۔ البتہ مغربی پاکستان کے بارے میں مخلوط انتخاب کا فیصلہ اتنا اچانک ہوا ہے کہ بعض سیاسی گروہوں کو جداگانہ انتخاب کے نام پر اپنے مندے کاروبار کو فروغ دینے کا موقع مل گیا ہے۔ ان گروہوں کی جانب سے مخلوط انتخاب کی مخالفت مذہب کے نام پر ہورہی ہے گویا جداگانہ انتخاب بھی ارکانِ اسلام میں شامل ہے۔ لطف یہ ہے کہ ساری مہم مغربی پاکستان میں چلائی جارہی ہے جہاں اقلیتوں کا وجود برائے نام ہے اور اس وقت بھی کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج ہے صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں گنتی کے چار پانچ افراد مغربی پاکستان کی نمائندگی کررہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جداگانہ انتخاب کی آواز نہیں اٹھائی جاتی حالانکہ وہاں کروڑ ڈیڑھ کروڑ غیرمسلم آباد ہیں جو جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب کی حمایت کرتے ہیں۔

- اب مسلم لیگ کی جانب سے سول نافرمانی اور راست اقدام کی دھمکی دی جارہی ہے۔

خدا ترا بُتِ کمسن دراز سن تو کرے
جفا کے تُو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

لیکن کیا جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہی پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے جو حل نہ ہوا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا اور پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ پاکستان کے لوگوں کا معیارِ زندگی گر رہا ہے، ضرورت کی چیزوں کے دام بڑھتے جا رہے ہیں، بے روزگاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بچوں کے لیے درس گاہیں نہیں، بیماروں کے لیے دوا علاج کا انتظام نہیں، بے گھروں کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں، رشوت ستانی، چور بازاری، نفع خوری، سفارش، اقربا پروری کو فروغ ہو رہا ہے، نظم و نسق میں بدعنوانیوں کی گرم بازاری ہے لیکن حیرت ہے کہ خداوندانِ مسلم لیگ کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور ہمارے روزمرّہ کے یہ مسائل انہیں نظر نہیں آتے۔ اگر مسلم لیگ کو مغربی پاکستان کے باشندوں کے مستقبل سے سچی ہمدردی ہے تو اسے چاہیے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ کرے لیکن جو جماعت آٹھ سال تک برسرِ اقتدار رہ کر ملک کا کوئی ایک مسئلہ حل نہ کر سکی وہ وزارت سے برطرف ہونے کے بعد کیا خاک کرے گی۔

اگر مسلم لیگ ہمارے روزمرّہ کے مسائل کی طرف توجہ کرتی اور ان مسائل کو حل کرنے کی خاطر ''راست اقدام'' اور اپنے ''خون کا آخری قطرہ بہا دینے'' کا اعلان کرتی تو شاید لوگ اس کے عزم و حوصلے کا خیر مقدم کرتے لیکن ان مسائل کی طرف سے مجرمانہ غفلت اختیار کرنے کے بعد جب جداگانہ انتخاب کی خاطر ''راست اقدام'' کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو اہلِ نظر کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ یہ سارا کھیل ملک کے بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرنے اور الیکشن میں مذہب کے نام پر ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے کھیلا جا رہا ہے۔ یہ انتہائی مذموم حرکت ہے۔ راست اقدام شوق سے کیجیے مگر عوام کی مشکل کشائی کے لیے نہ کہ کرسیِ وزارت پر قبضہ کرنے کے لیے۔

۲۸ اپریل ۱۹۵۷ء

وزارت سازی

جنگ کا ایک پرانا دستور ہے کہ ہزیمت خوردہ فوج پسپا ہوتے وقت اپنے گولے بارود کے ذخائر کو آگ لگا دیتی ہے تاکہ یہ وسائل حریف افواج کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ مغربی پاکستان کی عبوری اسمبلی میں وزارت کے بوڑھے جرنیل ڈاکٹر خان صاحب نے بھی آج سے چند ماہ قبل یہی کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایوان میں اپنی منتشر طاقتوں کو پامال ہوتے ہوئے دیکھتے، یہی بہتر جانا کہ چپکے سے کھسک جائیں اور جاتے جاتے اسمبلی کو معطل کرا دیں تاکہ اس کے ارکان مخالفوں کے دست و بازو نہ بن جائیں۔ ڈاکٹر خان صاحب نے تو گورنر سے یہ بھی سفارش کی تھی کہ اسمبلی کو سرے سے توڑ دیا جائے لیکن گورنر کے نزدیک اس اقدام کی آئینی حیثیت مشکوک تھی اس لیے اسمبلی توڑی نہیں گئی۔

پھر یہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں صدر کی حکومت قائم ہوگئی بعد میں پارلیمنٹ نے اس فیصلے کی توثیق اور صدر راج کی مدت میں توسیع کر دی۔ وزرا نے سرکاری کوٹھیاں چھوڑیں، ارکانِ اسمبلی نے اپنے علاقوں کی راہ لی، عام لوگوں نے جو کبھی کسی شمار و قطار میں نہ تھے چند دنوں بعد تمام ہنگامے سے دلچسپی لینی ترک کر دی، اسمبلی میں وزارتی معرکہ آرائی کا باب ختم ہوا اور ایک نیا باب شروع ہوا، یہ تھا حصولِ جاہ کے لیے گروہوں کی باہمی آویزش اور محلاتی سازشوں کا باب۔ پہلے اس کا مرکز کراچی تھا، اب چند دنوں سے لاہور ہے۔ وزیرِ اعظم مسٹر سہروردی سے گزشتہ دنوں ری پبلکن پارٹی کے ایک وفد نے ملاقات کی اور ری پبلکن وزارت کی بحالی کا مطالبہ کیا

لیکن حزبِ مخالف کا دعویٰ ہے کہ عبوری اسمبلی میں اکثریت اسے حاصل ہے۔ جمہوری طریقہ تو یہ تھا کہ اسمبلی بحال کی جاتی اور طرفین کو طاقت آزمائی کا موقع دیا جاتا۔ دونوں کے وعدوں کی حقیقت کھل جاتی، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا لیکن مرکزی سربراہوں نے یہ نہ کیا۔ پھر سننے میں آیا کہ اربابِ اقتدار مغربی پاکستان (عبوری) اسمبلی کو سرے سے توڑ دینا چاہتے ہیں اور اب مرکزی حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ میں ایک درخواست پیش کی گئی ہے تاکہ یہ محترم عدالت فیصلہ کرے کہ حکومت کو صوبائی اسمبلی کو توڑنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو سپریم کورٹ کرے گی اور ہمیں مسرت ہے کہ اربابِ حکومت نے کسی عاجلانہ فیصلے سے قبل اس اہم نکتے کی وضاحت کے لیے ملک کی سب سے بڑی عدالت سے رجوع کیا۔ چنانچہ ہم کسی رائے زنی سے احتراز کریں گے لیکن اس سلسلے میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اسی آئین کی دفعہ ۱۴۱ کے تحت یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ صوبائی اسمبلی کی تنسیخ کے بعد چھ ماہ کی مدت میں صوبے میں عام انتخابات کرانے ہوں گے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں اگر حکومت نے مستقبلِ قریب میں عبوری اسمبلی کی تنسیخ کا فیصلہ کیا تو کیا وہ آئین کے اس آرٹیکل کا بھی احترام کرے گی اور جلد سے جلد صوبے میں عام انتخاب کے ذریعے ایک نمائندہ اسمبلی اور نمائندہ وزارت قائم کرے گی۔ مغربی پاکستان میں آئینی ابتلا کا دور اسی طرح ختم ہوگا۔ جمہوریت کی بحالی اور آئینی اصولوں کی کارفرمائی کا موقع صرف اسی صورت میں پیدا ہوگا۔

۲۶ مئی ۱۹۵۷ء

سخن ہائے گفتنی

قومی اسمبلی کا نو روزہ اجلاس چار ماہ کے طویل وقفے کے بعد ان دنوں کراچی میں ہو رہا ہے۔ حکومت نے یہ اجلاس عوامی نمائندگی کے مسودۂ قانون کو قانونی شکل دینے کی غرض سے طلب کیا ہے کیونکہ ملک میں عام انتخابات کے لیے اس قانون کی منظوری لازمی ہے۔ اس لحاظ سے قومی اسمبلی کا یہ چند روزہ اجلاس ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

قومی اسمبلی کا یہ اجلاس بڑے بدلے ہوئے حالات میں منعقد ہو رہا ہے۔ یوں تو ہمارا ملک آئے دن سیاسی بحران کا شکار رہتا ہے لیکن اب سے چار ماہ قبل کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ملک کی سیاسی فضا میں دفعتاً اتنا شدید تغیر آ جائے گا کہ اربابِ بست وکشاد کو مخالف جماعتوں سے سمجھوتے کی بات چیت کرنی پڑے گی اور ری پبلکن پارٹی کے آزردہ خاطر ناخداؤں کو منانا پڑے گا اور مشرقی پاکستان میں برسرِ اقتدار پارٹی کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور کل کے رفقا حریفوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں طاقت کے توازن میں فرق آ جائے گا اور سودا بازیاں، سرگوشیاں اور ریشہ دوانیاں عروج پر پہنچ جائیں گی۔

سیاسی تغیرات کے پہلو بہ پہلو — یا شاید انہیں کے باعث — ایک اہم تبدیلی خود قومی اسمبلی کے حقوق واختیارات میں بھی ہوئی ہے۔ اب سے چار ماہ پیشتر تک قومی اسمبلی کے کسی رکن کو اگر صدرِ مملکت یا ان کے نامزد کردہ صوبائی گورنروں سے سیاسی بدعنوانی یا جماعتی جانب داری کی

شکایت ہوتی تو وہ اس مسئلے کو قومی اسمبلی کی روبرو پیش کرسکتا تھا لیکن ۲۰ اگست کو صدرِ مملکت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے قومی اسمبلی کے قواعد وضوابط میں اچانک چند بنیادی تبدیلیاں کردیں جن کے بموجب صدرِ مملکت یا صوبائی گورنروں کی ذاتی سرگرمیاں ایوان میں زیرِ بحث نہیں لائی جاسکتیں۔ ملک کے اخباروں میں ان امور پر اِن دِنوں علی الاعلان بحثیں ہورہی ہیں لیکن قومی اسمبلی کے فرش پر اِن مسائل کو اُٹھانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔ ہمیں ان مصلحتوں کا علم نہیں جن کی بنا پر یہ آرڈیننس نافذ ہوا ہے لیکن اس آرڈیننس کا مقصد اگر یہ ہے کہ لوگ صدرِ مملکت اور گورنروں کے کردار و اعمال پر پورا پورا اعتماد کریں اور ان قابلِ احترام ہستیوں کے بارے میں دشمنوں کے پھیلائے ہوئے بے بنیاد شکوک وشبہات کو دل میں جگہ نہ دیں تو پھر ہمیں اندیشہ ہے کہ آرڈیننس کے ذریعے قومی اسمبلی کے قواعد وضوابط میں تبدیلی کرنے سے آرڈیننس کا اصل مقصد ہی فوت ہوجائے گا اور عام لوگوں پر اس کا نفسیاتی اثر اچھا نہیں پڑے گا۔

البتہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ گزشتہ تین چار ہفتوں سے دارالحکومت میں جو قیاس آرائیاں اور چہ میگوئیاں ہورہی ہیں ان کی اصل حقیقت واضح ہوجائے گی۔ ان دنوں جتنے مُنھ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے سہروردی صاحب کی وزارت کا اب چل چلاؤ ہے، کوئی ڈاکٹر خاں صاحب کو وزیرِ اعظم بنارہا ہے، کوئی ملک فیروز خاں نون کو، کوئی مشتاق احمد گورمانی کو گورنری سے علیحدہ کررہا ہے اور ان کی جگہ میر احمد علی تالپور کو تخت پر بٹھارہا ہے۔ علیٰ ہذا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس سے مختلف پارٹیوں کی صحیح طاقت اور پوزیشن کا بھی علم ہوجائے گا اور اُن دعوؤں کی قلعی بھی کھل جائے گی جو اِن پارٹیوں کی طرف سے کیے جارہے ہیں۔

لیکن سیاست کی یہ غبار آلودگیاں اگر وقتی طور پر چھٹ بھی گئیں اور موجودہ وزارتیں پارلیمانی بحران کے گرداب سے نکل گئیں تو بھی پاکستان کے ایک عام باشندے کی زندگی میں کیا فرق آئے گا۔ وہ تو یہی سوچے گا کہ قومی اسمبلی کے اس اجلاس کے بعد بھی اس کے روزانہ کے مسائل جوں کے توں رہے اور اس کی پریشانیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ تو یہ دیکھ رہا ہے کہ نہ بدیسی مال کے دام گھٹتے ہیں نہ دیسی مال کے بلکہ گزشتہ چار ماہ میں اشیائے صرف کی قیمتوں میں حیران کن اضافہ ہوا ہے۔ سبزی، پھل، انڈا، دودھ، دہی، مکھن، گوشت، آٹا، دال، چاول، مسالہ، لکڑی، کوئلہ، کپڑا، جوتا۔ غرض ضرورت کی شاید ہی کوئی چیز ہو جس کے دام نہ چڑھے ہوں۔

ان حالات میں کیا قومی اسمبلی کا یہ فرض نہیں کہ تھوڑا وقت ان مسائل پر غور و فکر کرنے پر بھی صرف کرے۔ اسمبلی کے معزز ارکان کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ معاشی پریشانیوں کے باعث لوگوں میں ان دنوں اتنی بد دلی، پست ہمتی اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے کہ وہ ووٹروں کی فہرست میں اپنے نام لکھوانے کو بھی بے سُود سمجھتے ہیں۔ ان کو اس بات کا ملال ہے کہ قومی لیڈر ووٹ مانگنے تو آ جاتے ہیں لیکن ہم سے یہ پوچھنے کبھی نہیں آتے کہ زندگی کیونکر کٹ رہی ہے۔ قومی اسمبلی کے ارکان عوامی نمائندگی کا بلِ شوق سے منظور کریں لیکن کیا انہوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن عوام کی نمائندگی کے لیے وہ اس درجہ بے چین ہیں ان کا مزاج کیسا ہے اور وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

۲۵ اگست ۱۹۵۷ء

مخلوط اور جداگانہ انتخاب

پاکستان کے مختلف حصوں کے درمیان دشمنی، بدگمانی اور عداوت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ صوبائی عصبیت پہلے بھی موجود تھی اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگ پہلے بھی ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگاتے رہتے تھے لیکن آج کل کوئی نووارد اگر ہمارے رہنماؤں کے بیانات اور تقریروں کا مطالعہ کرے اور ہمارے ''محبِ وطن'' اخباروں پر سرسری نظر ڈالے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ مشرقی پاکستان مملکتِ پاکستان کا جزوِ لاینفک نہیں ہے بلکہ کوئی دشمن ملک ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن ملک کے خلاف ہمیں ہر قسم کی زہر افشانی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کی حکومت مخلوط انتخاب کے حق میں ہے تو وہ لازماً ہندوؤں کے زیرِ اثر ہوگی۔ اگر وہاں کے سیاسی رہنما اور اسمبلی کے ممبر صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر مولانا بھاشانی یا مسٹر سہروردی کے خلاف شرپسند عناصر کراچی یا لاہور میں مظاہرہ کرتے ہیں تو مشرقی پاکستان کے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مغربی پاکستان کے لوگ بنگالیوں کے دشمن ہیں اور اگر مسٹر سہروردی کے بجائے مسٹر چندریگر وزیرِ اعظم ہو جاتے ہیں تو یہ بنگالیوں کے حق پر شدید حملہ ہے۔ یہ بدگمانیاں فقط دونوں صوبوں کے درمیان نہیں پائی جاتیں بلکہ پٹھان پنجابیوں سے بدظن ہیں، پنجابی مہاجروں کے خلاف اور سندھی اہلِ کراچی سے خوار کھائے بیٹھے ہیں۔ غرض افتراق اور نفرت کا ایک سیلاب ہے جو اِن دِنوں پورے ملک پر مسلّط ہے۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان کے مقتدر افراد اور ذی اثر ادارے اس تشویش ناک صورتِ حال کے انجام و عواقب سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اِس چنگاری کو یوں ہی ہوا دی گئی تو ایک دن پاکستان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ اربابِ اقتدار کی جانب سے وقتاً فوقتاً صوبائی عصبیت کو ختم کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اِن حضرات کو اپنے ذاتی اور جماعتی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے بعض اوقات ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کا منطقی نتیجہ صوبائی عصبیت میں مزید اضافے کی شکل میں نکلتا ہے۔

یوں تو صوبوں اور علاقوں کے درمیان بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے متعدد اسباب ہیں لیکن پاکستانی قوم میں پھوٹ ڈالنے والی اور پاکستانیوں کے دِلوں میں نفرت اور عداوت کا بیج بونے والی چیزیں اِن دنوں دو ہیں۔ ایک مغربی پاکستان کی ایک یونٹ اور دوسرے مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی نزاع۔ ایک یونٹ کی تجویز ممکن ہے ہر لحاظ سے مفید ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک یونٹ کو سرحد، سندھ اور بلوچستان پر لوگوں کی مرضی معلوم کیے بغیر نافذ کیا گیا اور ان کے شکوک وشبہات کو دوستانہ انداز میں دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ زخم ہنوز تازہ تھا کہ جداگانہ انتخاب کا سوال اٹھا دیا گیا اور نفرتیں اور عداوتیں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ ہمارے اربابِ اختیار کی عقدہ کشائیاں لائقِ داد ہیں کہ وہ ایک گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو قوم کے رشتۂ حیات میں کئی سوئی گرہوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ پہلے جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو جداگانہ انتخاب منظور نہیں تو مشرقی پاکستان کے لیے مخلوط انتخاب اور مغربی پاکستان کے لیے جداگانہ انتخاب کی تجویز منظور ہوئی۔ جب اپنوں بیگانوں سب نے اس مضحکہ خیز فیصلے کا مذاق اُڑایا تو دونوں صوبوں کے لیے مخلوط انتخاب منظور ہوا۔ اس وقت نہ مسلم لیگ نے اس کی مخالفت کی اور نہ ری پبلکن پارٹی نے یہ کہا کہ پہلے ہم مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے وہاں کے لوگوں کی مرضی تو معلوم کرلیں۔ اب مسلم لیگ نے جداگانہ انتخاب کا نعرہ لگایا ہے تو ری پبلکن پارٹی کو مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ فیصلہ کراچی میں ہوگا مشرقی بنگال میں نہیں۔

مرکزی اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ کی اکثریت ہے۔ اگر یہ دونوں جماعتیں اپنی اکثریت کے بل پر جداگانہ انتخاب کی تجویز کو اسمبلی میں منظور بھی کروالیں تو کیا اس سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان محبت اور اتحاد کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے اور بدگمانیاں اور غلط

فہمیاں کم ہو جائیں گی۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کو اکثریت کے بل پر رائج کرنے سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان نفرت و دشمنی اور شدت اختیار کرلے گی۔ مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ دراصل مشرقی پاکستان کا مسئلہ ہے جہاں غیر مسلم اقلیت کی آبادی ایک کروڑ سے زائد ہے۔ مغربی پاکستان میں انتخابات خواہ جداگانہ ہوں یا مخلوط کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہاں غیر مسلم اقلیت برائے نام ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی نے قریب قریب اتفاقِ رائے سے مخلوط انتخاب کی تجویز منظور کی ہے۔ گزشتہ ہفتے وہاں صوبائی اسمبلی کا ایک ضمنی انتخاب اس بنیاد پر لڑا گیا اور جداگانہ انتخاب کے داعی مسلم لیگی امیدوار کو شکست ہوئی۔ اِن حالات میں کیا تدبر اور دانش مندی کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ جداگانہ انتخاب کے اصول کو مشرقی پاکستان پر زبردستی نافذ نہ کیا جائے۔ ورنہ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان تلخیاں اور بڑھیں گی۔ جداگانہ انتخاب اگر اتنا ہی ضروری ہے تو عام انتخاب کے وقت اسی کو بنیادی سوال بنایا جاسکتا ہے۔ اگر دونوں بازوؤں کی اکثریت جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دے تو مخلوط انتخاب کے اصول کو بدلنے میں کتنی دیر لگے گی لیکن اس عبوری دور میں جبکہ عام انتخابات ہی خطرے میں ہیں جمہوریت کے بنیادی تقاضوں سے لاپرواہ ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا جس سے انتخابات معرضِ التوا میں پڑجائیں اور صوبائی عصبیت کو اور فروغ ہو پاکستان کے اتحاد اور سالمیت سے دشمنی کرنا ہے۔ کاش اربابِ اختیار اپنے ذاتی اور جماعتی مفاد کے بجائے پاکستان کے قومی اور ملّی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے۔

۸ دسمبر ۱۹۵۷ء

آئین کا احترام

صدرِ مملکت کی ذات آہستہ آہستہ نزاعی شخصیت بنتی جاتی ہے۔ صدرِ مملکت پر کھلم کھلا جانب داری کا الزام لگایا جار ہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایوان صدر میں اب ایسے مذاکرات بھی ہوتے ہیں، ایسے منصوبے بھی بنتے ہیں اور ایسے فیصلے بھی کیے جاتے ہیں جو ملک میں جمہوری قدروں کی بحالی اور پارلیمانی روایتوں کے استحکام کے لیے چنداں مفید نہیں ہوتے۔ گزشتہ دو ماہ میں ہمارے ملک میں مرکزی وزارت دو بار بدلی جا چکی ہے۔ اس وزارتی تغیر وتبدل کے دوران میں بھی صدرِ مملکت کی ذات برابر اعتراض کا نشانہ بنتی رہی مگر افسوس ہے کہ اب تک صدرِ مملکت کی جانب سے ایسا کوئی اقدام نہیں ہوا جس سے ان الزامات کی تردید ہو جاتی۔ اس کے برعکس ان کے حالیہ —اور سابقہ— ارشادات سے یہ شبہہ اور قوی ہو جاتا ہے کہ موصوف بعض اوقات اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو آئینی حدود کا پابند رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

دسمبر کے آخری دنوں میں پاکستان بار ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر بار ایسوسی ایشن کے صدر چودھری نذیر احمد نے صدرِ مملکت کی توجہ ملک کے بعض اہم قانونی اور آئینی مسائل کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی۔ چودھری نذیر احمد نے کہا کہ نمبر ۱ ملک کے بعض بااثر افراد کھلم کھلا آئین کی بے حرمتی کرتے ہیں اور آئین کو منسوخ کرنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ ان کا اشارہ انقلابی کونسل کی تبلیغ کرنے والوں کی طرف تھا۔ نمبر ۲ انہوں نے عارضی دور کو جلد از جلد ختم کرنے کی گزارش کی کہ جمہوری پائیداری اور آئینی نظام کا تقاضہ بھی

تھا۔ ان کا اشارہ عام انتخابات کی جانب تھا۔ نمبر ۳ انصاف کو سستا اور آسان کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور ہماری عدالتوں کی پیچیدہ اور مہنگی کارروائیوں کی شکایت کی۔ نمبر ۴ ملک کے بدلے ہوئے معاشی اور معاشرتی حالات کے پیشِ نظر مروجہ قوانین میں اصلاح کرنے کی گزارش کی اور ایک ''لا ریفارم کمیشن'' قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ نمبر ۵ اس بات پر زور دیا کہ آئین کے اندر ''رٹ'' کے جو حقوق ہمیں حاصل ہیں ان کا احترام کیا جائے اور ان میں کوئی ترمیم نہ کی جائے اور نمبر ۶ وکلا اور حکومت کے درمیان عملی تعاون کی ضرورت پر زور دیا۔

بار ایسوسی ایشن کے صدر نے جن خدشات کا ذکر کیا وہ فرضی نہ تھے اور جو تجاویز پیش کیں ان کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا مگر صدرِ مملکت نے سپاس نامے کے جواب میں جن تاثرات کا اظہار فرمایا ان سے نہ خدشات دور ہوئے اور نہ وہ مسائل حل ہوئے جن کی نشان دہی بار ایسوسی ایشن نے کی تھی۔ صدرِ مملکت نے انقلابی کونسل کی جمہوریت دشمن اور آئین کش تجویز کی مذمت کرنے کے بجائے وکیلوں کو یہ عجیب وغریب مشورہ دیا ہے کہ وہ انقلابی کونسل کی تلقین کرنے والوں سے رجوع کریں یا ان پر مقدمہ چلائیں۔ ''طوطے کی مانند جمہوریت خطرے میں ہے کی رٹ لگانے سے'' صدرِ محترم کی رائے میں ''اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔'' حیرت ہے کہ صدرِ محترم کو انقلابی کونسل کی رٹ لگانے والوں کی جانب سے جمہوریت کو جو خطرہ لاحق ہے وہ نظر نہ آیا اور نہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس سے ملک میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ موصوف اُلٹے ان لوگوں پر برس پڑے جو پارلیمانی جمہوریت کے حامی ہیں۔ جہاں تک انقلابی کونسل کے مبلغین پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلانے کا سوال ہے صدرِ مملکت شاید ہم سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس کا اختیار فقط حکومت کو ہے وکلا کو نہیں ہے۔

صدرِ مملکت نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ شاید عام انتخابات نومبر ۱۹۵۸ء میں نہ ہوسکیں کیونکہ اِن کی رائے میں طریقِ اِنتخاب کی نزاع کی وجہ سے الیکشن کمیشن کا کام اور پیچیدہ ہوگیا ہے۔ یہ درست ہے کہ طریقِ اِنتخاب کی نزاع کی وجہ سے الیکسن کمیشن کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی لیکن خود مسٹر چندریگر نے اپنی وزارت کے زمانے میں کہا تھا کہ الیکشن کمیشن نے مجھے یقین دلایا ہے کہ انتخابی فہرستیں اگر جداگانہ انتخاب کے مطابق نئے سرے سے بنائی گئیں تو بھی انتخابات نومبر میں ہوسکیں گے۔ اب تو فہرستوں کو نئے سرے سے بنانے کا مسئلہ بھی درپیش نہیں لہٰذا عام انتخابات میں تاخیر کی وجہ ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ الیکشن کمیشن کا فرض ہے کہ وہ تذبذب

کی اس فضا کو ختم کرے اور عام انتخاب کی تاریخ کا واضح اور غیر مبہم اعلان کرے۔

صدرِ مملکت نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ ہمارے ملک میں سیاسی عدم استحکام کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں تعلیم کا فیصدی اوسط بہت کم ہے۔ ''ہماری سیاسی دردِ سری کم وبیش اس وقت تک باقی رہے گی جب تک تعلیم کی فیصد شرح میں اضافہ نہیں ہوتا۔'' پاکستان کا ہر بہی خواہ صدرِ مملکت کی اس خواہش کا خیر مقدم کرے گا کہ ملک میں تعلیم عام ہو تا کہ لوگوں کے شعور وآگہی میں اضافہ ہو لیکن صدرِ مملکت نے سیاسی ناپائیداری اور تعلیم کی فی صدی شرح کے درمیان جو رشتہ تلاش کیا ہے واقعات اس کی تائید نہیں کرتے کیونکہ جمہوریت اور تعلیم لازم ملزوم حقیقتیں نہیں ہیں۔ بعض انتہائی تعلیم یافتہ ملکوں میں بھی سیاسی عدم استحکام پایا جاتا ہے جیسے فرانس میں اس کے برعکس بعض ایسے ملک بھی ہیں جہاں تعلیم کی فیصدی شرح پاکستان سے زیادہ نہیں مثلاً ہندوستان مگر وہاں جمہوری نظام رائج ہے اور وزارتی استحکام بھی پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے بیش تر سیاسی اور اقتصادی مسائل ہمارے بعض تعلیم یافتہ سیاسی رہنماؤں کے پیدا کردہ ہیں ان پڑھ عوام کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ وزارتی کرسیوں کے لیے سازش اور توڑ جوڑ یہی تعلیم یافتہ حضرات کرتے ہیں، انتخابات میں دھاندلیاں اور دھونس انہیں حضرات کا شیوہ ہے، عوام کو سبز باغ دکھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا، شہری آزادیوں پر پابندیاں لگانا اور تعلیم کو کنٹرول کرنا بھی بعض پڑھے لکھے گروہوں ہی کا شعار ہے۔ ہمارے ان پڑھ عوام کو غم آلام نے اتنی فرصت کہاں دی کہ وہ کرسی اِقتدار حاصل کرنے کے لیے تعلیم حاصل کرتے۔

اگر صدرِ محترم کا یہ ارشاد صحیح مان لیا جائے کہ تعلیم کے فروغ کے بغیر جمہوریت کا فروغ ممکن نہیں تو ہمیں اندیشہ ہے کہ قوم کو ابھی کئی صدی تک جمہوریت کا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ جس رفتار سے ہمارے ملک میں تعلیم ترقی کر رہی ہے اس میں اگر کوئی انقلابی تبدیلی نہ آئی تو ہماری غالب اکثریت صدیوں تک تعلیم کی برکتوں سے محروم رہے گی۔ یہاں یہ سوال بھی بے محل نہ ہوگا کہ اگر صدرِ مملکت تعلیم کو جمہوریت کے لیے اتنا ہی ضروری خیال فرماتے تھے تو پھر ان کی وزارتوں نے گزشتہ تین سال میں تعلیم کے فروغ کے لیے کیا کیا۔ پورے ملک کا ذکر ہی فضول ہے خود کراچی میں تعلیم کی فیصدی شرح برطانیہ یا امریکہ کے برابر لانے کی خاطر کون کون سی عملی تدابیر اختیار کی گئیں۔

ہماری سیاسی ''دردِ سری'' اور وزارتی عدم استحکام کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ملک کے آٹھ کروڑ

باشندے دس سال گزر جانے کے بعد بھی اپنے بنیادی حق سے محروم ہیں۔ نہ قانون ان کی مرضی سے بنتے، نہ قانون ساز ان کے نمائندے ہوتے، نہ حکومتوں پر ان کا کوئی اختیار ہے، نہ نظم ونسق میں انہیں دخل دینے کی اجازت ہے اور نہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے پر قادر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں نہ کوئی وزارت دیرپا ثابت ہوسکتی نہ ہماری دردِ سری ختم ہوسکتی۔ اس لیے صدرِ مملکت سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اَن پڑھ عوام کو تعلیم کی نعمت عطا کرنے سے پیشتر اس بات کا یقین دلائیں کہ ملک کی کسی طاقت کو خواہ وہ کتنی ہی بااثر کیوں نہ ہو آئین کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ صدرِ مملکت نزاعی مسائل میں اُلجھنے کے بجائے قوم کے متفقہ مطالبہ کی طرف توجہ دیں گے اور وہ ہے ملک میں جلد از جلد عام اور آزاد انتخاب۔

۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء

ایک یونٹ اور جذباتیت

جب سے مغربی پاکستان اسمبلی نے ایک یونٹ کو توڑ کر صوبوں کی ازسر نوتشکیل اور علاقائی فیڈریشن کی تجویز منظور کی ہے بعض حلقے بہت مسرور ہیں گویا ہم نے ہفت خواں فتح کرلیا ہے۔گویا مغربی پاکستان کے باشندوں کے تمام مصائب وآلام اسی ایک یونٹ کے پیدا کردہ تھے اور ایک یونٹ کے ٹوٹنے کے بعد سندھ، سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے خودمختار صوبوں میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ دوسری جانب بعض حلقے یوں مغموم اور آتشِ زیرِ پا ہیں گویا ایک یونٹ ختم ہوا تو قیامت آجائے گی اور پاکستان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ حالانکہ دو سال پیشتر تک یہاں کسی نے ایک یونٹ کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس کے باوجود پاکستان قائم تھا اور پاکستانیوں کی قومی وحدت برقرار تھی۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی غیر جمہوری فضا میں جذباتیت اتنی جاری وساری ہے کہ ہر مسئلے کو (خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا ثقافت سے، اقتصادیات سے ہو یا مذہب سے، نظم و نسق سے ہو یا رسم ورواج سے) جذباتی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اس کی موافقت اور مخالفت میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ بھی خالص جذباتی ہوتی ہیں۔ جذباتیت کی اس فراوانی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اہم سے اہم قومی مسئلے پر بھی اب ہم سنجیدگی سے غور وفکر کی عادت ترک کرتے جاتے ہیں۔ ایک یونٹ ہی کو لے لیجیے۔ اربابِ اختیار کو دفعتاً القا ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو توڑ کر

ایک وحدت میں ضم کر دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک یونٹ کی تحریک کرنے والوں کا نیک نیتی سے یہ خیال رہا ہو کہ ایک یونٹ کے بننے سے ملک وقوم کا بھلا ہوگا لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو غیر جمہوری اور آمرانہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اس کی تفصیلات کسی دوسرے صفحے پر ملاحظہ کیجیے۔ جذباتی انداز میں پروپیگنڈے کا ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا اور خوف ودہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی اخبار ایک یونٹ پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ ایک یونٹ کی تجویز نہ تھی کوئی صحیفۂ آسمانی تھی۔ جذباتیت سے قطع نظر وہ کون سی دلیل تھی جو ایک یونٹ کے حق میں نہیں دی گئی۔ نظم ونسق کے مصارف گھٹ جائیں گے، قانونی یکسانیت پیدا ہوجائے گی۔ صوبائی تعصب ختم ہوجائے گا، قومی تعمیر کے کاموں میں آسانیاں پیدا ہوجائیں گی وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور قائدِ اعظم کی تقریروں سے بھی اس کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس کی کامیابی پر شبہہ کا اظہار کیا گیا اور یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر ایک یونٹ میں اتنے محاسن پوشیدہ ہیں تو پھر عوام کی مرضی کیوں نہ معلوم کرلی جائے کیونکہ وہ پاگل تو نہیں کہ اتنی مفید اور سُودمند تجویز کو رد کردیں۔ لیکن جس نے اس جمہوری طریقہ کار کی حمایت کی اسے غدار، پاکستان کا دشمن، غیر ملکی طاقتوں کا ایجنٹ کہہ کر خاموش کر دیا گیا یا جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور پھر ایک یونٹ کا قیام بڑے طمطراق سے عمل میں آیا۔

دو سال تک مغربی پاکستان کے لوگوں کو یہ مینگنی پڑا ہوا دودھ ملتا رہا اور لوگوں نے اپنے تجربے سے دیکھ لیا کہ ایک یونٹ کے حق میں جو جذباتی دلیلیں دی جاتی تھیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔ نہ صوبائی تعصّب کم ہوا نہ نظم ونسق کے مصارف گھٹے اور نہ قانون میں یکسانیت پیدا ہوئی۔ حالات بہتر ہونے کے بجائے اور بدتر ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک یونٹ، نظم ونسق کا ایک تجربہ تھا اور اس کے بعض سیاسی مقاصد تھے۔ نظم ونسق کا یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا ہے اور وہ سیاسی تقاضے اب باقی نہیں رہے جو اس تجویز کے محرک تھے۔

بعض حلقے آئین کے تقدس کی آڑ لے کر لوگوں کے جذبات مشتعل کر رہے ہیں۔ حالانکہ آئین بھی ایک یونٹ کی مانند ہم خاکی انسانوں ہی کا بنایا ہوا ہے اور ہم چاہیں تو فقط ایک دو نہیں بلکہ اس کی تمام دفعات کو بدل سکتے ہیں۔ خود ہمارے آئین کے اندر آئین میں ترمیم کرنے کا حق موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک یونٹ کو توڑنے سے پیشتر عوام کی رائے معلوم کر لی جائے مگر ایک یونٹ کے مخالفین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایک یونٹ قائم کرتے وقت عوام کی رائے کب معلوم کی گئی تھی۔ جس غیر نمائندہ اسمبلی نے ایک یونٹ کے حق میں قرارداد منظور کی تھی اسی نے ایک یونٹ کے خلاف قرارداد منظور کی ہے۔ البتہ اس سے اسمبلی کے عام ممبروں کی خواہ وہ ری پبلکن ہوں یا مسلم لیگی بے ضمیری ضرور ثابت ہوتی ہے۔ اس بے ضمیری سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان لوگوں کو اپنا نمائندہ نہ بنایا جائے۔

بے یقینی کی موجودہ فضا میں کوئی شخص یقین سے یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ نیشنل اسمبلی، صوبائی اسمبلی کی سفارش کو منظور کرلے گی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ علاقائی فیڈریشن کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ ایک یونٹ کے ڈھانچے سے کس قدر مختلف ہوگا لیکن جو لوگ اس حُسنِ ظن میں مبتلا ہیں کہ صوبائی خودمختاری ہماری تمام قومی خرابیوں کا واحد علاج ہے وہ غلطی پر ہیں۔ ایک یونٹ بننے سے پیشتر سرحد، پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں بڑی حد تک صوبائی خودمختاری قائم تھی لیکن اس دورِ خودمختاری کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مسٹر عبدالقیوم خاں، مسٹر ایوب کھوڑو اور دوسرے وزرائے باکمال نے جمہوری قدروں کی جو بے حرمتی کی ہے اس پر تو مسلم لیگ بھی فخر نہیں کرسکتی۔ صوبائی خودمختاری کوئی مقصد نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے۔ اگر صوبائی خودمختاری سے شخصی آزادی اور جمہوریت کو فروغ ہوتا ہے، عوام کے مسائل زیادہ آسانی سے حل ہوتے ہیں اور نظم ونسق بہتر ہوتا ہے تو صوبائی خودمختاری کو ایک یونٹ پر ترجیح دی جائے گی اور اگر صوبائی خودمختاری سے چند خود غرض عناصر کی مطلق العنانیوں کو فروغ ہوا اور جمہوری قدریں پامال ہوئیں اور عوام کے مسائل حل نہ ہوئے تو پھر صوبائی خودمختاری اور ایک یونٹ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

ایک یونٹ اور عام انتخابات

ایک یونٹ کے مسئلے پر بحث کا موجودہ سلسلہ اس لحاظ سے خوش آئندہ ہے کہ غالباً اب سے پہلے کسی اہم آئینی مسئلے پر اس قدر آزادی سے اظہارِ خیال کا موقع پاکستانی باشندوں کو نصیب نہ ہوتا تھا۔ اگر صوبوں کے ادغام سے پہلے ہی عام لوگوں کو اعتماد میں لیا جاتا اور انہیں آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دیا جاتا تو شاید اس خرابیِ بسیار کی نوبت نہ آتی جو بعد میں پیدا ہوئی۔ ایک یونٹ یا تو قائم ہی نہ ہوتا یا عام لوگوں کی ایما سے قائم ہوتا تو کچھ نہ کچھ مفید نتائج برآمد ہوتے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اب کوئی ایسی قابلِ ذکر سیاسی جماعت باقی نہیں جو جماعتی طور سے ایک یونٹ کے نظام کو مستقل برقرار رکھنے پر مصر ہو، ان جماعتوں سے قطعِ نظر یونٹ کے حق میں اور یونٹ کے خلاف صحیح یا غلط کئی طرح کے دلائل اب بھی سننے میں آتے ہیں اور ہر شہری کو ان دلائل کے اظہار کا حق پہنچتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ بحث طے کیونکر ہو اور اس نزاعی مسئلے کا حل کس تدبیر سے کیا جائے۔ غالباً کسی شخص کو اس بنیادی حقیقت سے انکار نہ ہوگا کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں یونٹ کی تنسیخ اور ذیلی وفاق کے قیام کے حق میں قرار داد کی منظوری کے بعد چارۂ کار بجز اس کے کچھ اور نہ رہا کہ سارا معاملہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے کیوں کہ آئینی معاملات میں آخری فیصلے کی مجاز بھی پارلیمنٹ ہے اور اس کا فیصلہ ہمارے ملک کے بڑے سے بڑے حاکم کی رائے پر بھاری ہے۔ ہماری صوبائی اسمبلی اور پارلیمنٹ کس حد تک نمائندہ ہیں اور اِن کے ارکان کہاں تک عوامی نمائندگی کے اہل ہیں، فی الحال اس سے بحث نہیں اور نہ ہمیں

ان کے متعلق کوئی خوش فہمی ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آخر اسی پارلیمنٹ نے ہمارا آئین منظور کیا تھا۔ اگر وہ کل تک دستور سازی کی اہل تھی تو آج اس دستور میں ترمیم کرنے کا بھی حق رکھتی ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے بعد جب ہم یونٹ کے مسئلے پر جناب صدر اوروزیر اعظم کے بیانات کا مطالعہ کرتے ہیں تو خود ان بیانات کی ضرورت محلِ نظر دکھائی دیتی ہے۔

جناب اسکندر مرزا ہمارے ملک کے آئینی سربراہ ہیں اور جب وہ کسی آئینی، سیاسی یا انتظامی مسئلے پر رائے ظاہر کرتے ہیں تو وہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہوتی بلکہ حکومت کی رائے ہوتی ہے جو وزیرِ اعظم کی وساطت سے ان تک پہنچی ہے۔ حکومت کا نقطۂ نگاہ ایک یونٹ کے بارے میں کیا ہے، اس کا کسی کو علم نہیں کیوں کہ اس نے ابھی اپنے نقطۂ نگاہ کا تعین ہی نہیں کیا۔ ہمیں ایک یونٹ کی افادیت یا مضرت سے بحث نہیں لیکن اس بات کا رنج ضرور ہے کہ اصل معاملے کے پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل ہی جنابِ صدر نے اس پر اظہارِ خیال کی ضرورت محسوس کی۔ یہ شکایت مسٹر سہروردی سے بھی ہے جن کی حیثیت ہمارے نزدیک سہ گونہ ہے۔ ایک ان کی ذاتی حیثیت، دوسری جماعتی حیثیت اور تیسری وہ حیثیت جو انہیں بطور وزیرِ اعظم حاصل ہے۔ مسٹر سہروردی نے یہ بیان اگر اپنی ذاتی حیثیت میں دیا ہے تو اس کی اہمیت محدود ہے، رہی جماعت کی پوزیشن تو ہمیں عوامی لیگ پارٹی کا وہ فیصلہ یاد ہے جو ایک یونٹ کے مسئلے پر اس نے گزشتہ دو برس قبل کیا تھا یعنی ایک یونٹ کو برقرار رکھنے کے لیے عوامی لیگ پارٹی برسرِ اقتدار آتے ہی عوام کی رائے معلوم کرے گی۔ پارلیمنٹ میں یونٹ بل پر مسٹر سہروردی کی تقریر بھی وزیرِ اعظم کو یاد ہو گی۔ وزیرِ اعظم کی حیثیت میں بھی مسٹر سہروردی کے لیے یہ زیادہ مناسب نہ تھا کہ اپنی کابینہ سے مشورہ کیے بغیر ایک اہم آئینی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے جب انہیں معلوم تھا کہ کابینہ میں اس مسئلے پر اختلاف رائے موجود ہے۔

اب ایک نظر اُن دلائل پر بھی ڈالتے چلیں جو ایک یونٹ کے جواز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اگر جناب سہروردی صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ اس مرحلے پر بنیادی آئینی ترمیم سے انتخاب میں تاخیر کا خدشہ ہے اس لیے ایک یونٹ کے متعلق آئینی دفعات میں ردّ و بدل فی الحال قرینِ مصلحت نہیں تو ان کا قول زیادہ قابلِ قبول ہوتا۔ یہ اس لیے کہ انتخابات کی ضرورت اور اہمیت پر سبھی لوگ متفق ہیں لیکن سہروردی صاحب نے اس کے بجائے ایک یونٹ کی خوبیوں اور اس کی تنسیخ کی خرابیوں پر زیادہ زور دیا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اس مسئلے پر خود ان کی حکومت

میں شدید اختلافِ رائے موجود ہے، یوں انہوں نے سیاسی اور آئینی حلقوں میں ایک نئی کشمکش اور رسہ کشی کا آغاز کر دیا جس کے نتائج کے بارے میں فی الحال پیشین گوئی مشکل ہے۔ انتخابات میں تعجیل یا تاخیر والی بات میں بھی وزن جب تھا کہ جناب وزیرِ اعظم انتخابات کی کوئی قطعی تاریخ متعین فرماتے تاکہ لوگ یہ اندازہ کر سکیں کہ اس تاریخ تک مجوزہ آئینی ترمیم مکمل ہو سکتی ہیں یا نہیں۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ انتخابات جو پچھلے دس برس سے ملتوی چلے آ رہے ہیں (اور ہوتے ہوتے بات ۱۹۵۸ء کے خاتمے تک جا پہنچی ہے) خبر نہیں کب تک ہوں گے۔ اس حالت میں کوئی کیسے یقین کرے کہ اگر ایک یونٹ کی تنسیخ کا مطالبہ ملتوی کر دیا جائے تو عام انتخابات کی تاریخیں پاس کھسک آئیں گی۔ پھر یہ بھی ثابت نہیں کہ انتخابات تک ہر آئینی تبدیلی لازمی طور پر انتخابات کی تواریخ پر اثر انداز ہوگی، اس کے خلاف کیا یہ مناسب نہیں کہ آئین میں اگر سنگین نقائص موجود ہیں تو اِن کی پہلے ہی سے اصلاح کر لی جائے تاکہ ان نقائص کا غلط ردِ عمل انتخابات پر نہ پڑے۔

صحیح طریقہ یہی ہے کہ حکومت انتخابات کرانے کے لیے ایک طرف واضح طور پر تاریخ کا اعلان کرے دوسری طرف الیکشن کمیشن کو اپنے فرائض سے جلد عہدہ برآ ہونے کی ہدایت کرے۔ ساتھ ہی یونٹ کا مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا جائے۔ اگر پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت یہی مناسب سمجھے کہ ایک یونٹ کو برقرار رکھنا ہی ملک کے لیے ضروری ہے تو بجا اور اگر پارلیمنٹ کے ارکان جنہیں عام انتخابات ہمارے وزیرِ اعظم کے مقابلے میں کچھ کم عزیز نہ ہوں گے یونٹ کی تنسیخ کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اسے قبول کرنے میں بھی باک نہیں ہونا چاہیے۔ موہوم اندیشوں اور آئینی بحران کی دہائی دینا، وہ بھی ایک اہم آئینی مسئلے پر، دانش مندانہ بات نہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۵۷ء

ایک یونٹ کا قضیہ

مغربی پاکستان کی وحدت کا مسئلہ تین سال گزر جانے کے بعد بھی ہنوز ایک نزاعی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تین سال پیشتر میدانِ سیاست میں جو حیثیت ایک یونٹ کے حامیوں کی تھی آج وہی حیثیت ایک یونٹ کے مخالفوں کی ہے۔ مغربی پاکستان کی اسمبلی ایک یونٹ کے خلاف قرارداد منظور کرتی ہے۔ صوبائی اور مرکزی وزرا برسر عام ایک یونٹ کی مذمت کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ تجربہ مہنگا ثابت ہوا ہے۔ سندھ کے مختلف الخیال لیڈر (جن میں وزرائے کرام بھی شامل ہیں) ایک یونٹ توڑنے کا عہد کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر الیکشن لڑنے کے لیے متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ سرحد میں ایک یونٹ کے خلاف کانفرنسیں ہوتی ہیں اور اب خان عبدالغفار خان اور مولانا بھاشانی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ خود صدرِ مملکت یہ وعدہ فرما چکے ہیں کہ آئین میں ضروری ترمیم کر کے ایک یونٹ کو الیکشن سے قبل توڑ دیا جائے گا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ صدرِ مملکت یا نواب مظفر علی خان قزلباش نے نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں سے ایک یونٹ توڑنے کا وعدہ کیا تھا یا نہیں اور فریقین اس قسم کے خفیہ مذاکرات کے مجاز تھے یا نہیں البتہ اس نزاع نے اب جو شکل اختیار کی ہے اس سے یہ اندیشہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک یونٹ کے قضیہ کو الیکشن سے قبل طے نہ کیا گیا تو صوبائی منافرت ہی میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ شاید الیکشن ہی خطرے میں پڑ جائے اور ان ذات شریفوں کی بن آئے جو الیکشن کو نامعلوم مدت تک کے لیے ملتوی کرنے کے درپے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک یونٹ کے حق میں جو دلیلیں تین سال پیشتر دی گئی تھیں اور جو توقعات اس سے وابستہ کی گئی تھیں وہ غلط ثابت ہوئی ہیں۔ ایک یونٹ کے بعد نہ صوبائی اختلافات ختم ہوئے (ان میں شاید اضافہ ہی ہوا ہے) نہ قوانین میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا ہوئی، نہ پس ماندہ علاقوں نے ترقی کی اور نہ نظم و نسق کے مصارف میں کمی آئی۔ اس ناکامی کی وجہ خواہ یہ ہو کہ ایک یونٹ کو خلوص اور نیک نیتی سے نہیں چلایا گیا یا یہ کہ ایک یونٹ بننے کے بعد وہی عناصر برسر اقتدار آئے جو ایک یونٹ کے مخالف تھے۔ یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مفید سے مفید منصوبہ بھی اگر غیر جمہوری طریقے سے چلایا جائے یا زبردستی لوگوں پر ٹھونس دیا جائے تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔ اگر اربابِ اقتدار ایک یونٹ کو نسخۂ کیمیا سمجھتے تھے تو مصالحت اور دور اندیشی کا تقاضا تھا کہ وہ جمہوری طریقے پر عام لوگوں کی رائے معلوم کرتے۔ اگر لوگ اپنی مرضی سے اس کے حق میں رائے دیتے تو ایک یونٹ قائم کر دیا جاتا ورنہ نہیں لیکن ایک یونٹ کو نافذ کرنے میں اتنی عجلت سے کام لیا گیا اور خوف و دہشت کی ایسی فضا قائم کی گئی کہ چھوٹے صوبوں کے لوگوں کا شک اس یقین میں بدل گیا کہ ایک یونٹ کا مقصد ان کے حقوق اور مفاد کو پامال کرنا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں کوئی سیاسی جماعت ایک یونٹ کی حمایت کا اعلان نہیں کر سکتی اور نہ ایک یونٹ کی بنیاد پر الیکشن جیت سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک یونٹ کی مخالفت کو سستی شہرت کی خاطر اور الیکشن اسٹنٹ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ الزام درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ چھوٹے صوبے کے عام لوگ ایک یونٹ سے چنداں خوش نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اس مسئلے کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہی ہے کہ اس کا آخر فیصلہ عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ عام انتخابات کے بعد اگر سابق صوبہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کی اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت ایک یونٹ کے خلاف رائے دے گی تو ایک یونٹ توڑ دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ یہ اعلان قومی اسمبلی کی ایک تجویز کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس اعلان سے بدگمانی کی وہ فضا شاید ختم ہو جائے جو اس وقت ہماری سیاست میں زہر بن کر پھیل رہی ہے اور ناانصافیوں کا شکوہ اور صوبائی منافرت کا جوش بھی شاید دب جائے۔ البتہ یہ مطالبہ کہ الیکشن سے پیشتر آئین میں ضروری ترمیم کر لی جائے اور ایک یونٹ کو توڑ دیا جائے ناقابلِ عمل ہے اور نہ حقیقت پسندی پر مبنی۔ ایک یونٹ کو توڑنے کے لیے آئین کی فقط ایک دو دفعات میں ترمیم ضروری نہ ہوگی بلکہ قریب قریب آدھا

آئین بدلنا ہوگا۔ یہ ترمیم عجلت میں نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے وقت درکار ہوگا اور اس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔ لہٰذا ایک یونٹ کے مخالفین کو اپنے اس مطالبے پر اصرار نہ کرنا چاہیے ورنہ اس کی وجہ سے الیکشن خطرے میں پڑ جائیں گے اور ایک یونٹ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی یہ ماننے پر مجبور ہے کہ وقت کا سب سے اہم سیاسی تقاضا یہی ہے کہ الیکشن وقتِ مقررہ پر ہوں اور آزاد اور غیر جانب دار ہوں۔

۲۱ ستمبر ۱۹۵۸ء

امنِ عامہ کے مسائل

خونِ ناحق

گزشتہ اتوار کو لاہور میں قتل اور لاقانونیت کا جو المناک حادثہ پیش آیا اس نے ایک بار پھر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بعض ایسی بنیادی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں کہ اگر ان کو بروقت دور نہ کیا گیا تو معاشرے کا شیرازہ ہی بکھر جائے گا۔ فرد کی زندگی سماج کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے اور اس کا تحفظ ہمارا سب سے پہلا فرض ہے لیکن حالات اس درجہ بگڑ چکے ہیں کہ اب بڑے بڑے شہروں میں بھی نہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ عزت و آبرو۔ بھرے بازار میں دن دہاڑے گولیاں چلتی ہیں، بے گناہ قتل ہوتے ہیں اور عورتیں اغوا کر لی جاتی ہیں۔ ابھی تو دس سال کی ایک صبوحی غنڈہ گردی کا نشانہ بنی ہے۔ یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہر شہر اور ہر سڑک پر نہ جانے کتنی صبوحیوں کی لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی لیکن یہ قتل اور لاقانونیت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ علامت ہے کسی مہلک سماجی عارضے کی اور اشارہ ہے کسی آنے والے بڑے طوفان کی جانب۔

۱۹۴۷ء میں شمالی ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وحشت و بربریت، قتل و غارت گری کا جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا وہ تاریخِ انسانی کا شاید سب سے شرم ناک المیہ ہے۔ اس المیے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دونوں جانب کے چند ذمے دار لیڈروں نے امن شکن اور جرائم پیشہ عناصر کو قتل و غارت گری پر اکسایا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی امداد کی اور اپنے جوشِ انتقام کی

تسکین کے لیے انھیں عناصر کا تعاون حاصل کیا۔ غنڈے قومی ہیرو قرار پائے۔ اس سے پہلے معاشرے میں نہ ان کی یہ عزت تھی اور نہ انہیں یہ آزادی میسر تھی۔ ان کے دلوں سے قانون اور پولیس کا خوف ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔

ستم یہ ہوا کہ تقسیم کے بعد بعض ان حضرات کو وزارت کی کرسیاں بخشی گئیں جو غنڈوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی فرماتے تھے۔ غنڈوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور جب اقتدار کے لیے سیاسی رسہ کشی کا نیا دور شروع ہوا تو لیڈرانِ کرام ان ہی غنڈوں کی مدد سے مخالف گروہ کو روک دینے اور زِچ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے یہ تیر اغیار پر آزمایا گیا تھا۔ اب اپنوں کی باری تھی۔ مخالف گروہوں پر حملے کروانا، ان کے جلسے توڑنا، ان کے کارکنوں کو قتل کرنا غنڈوں کے ''قومی فرائض'' میں داخل ہوگیا۔ کون نہیں جانتا کہ لاہور میں لیاقت علی خان مرحوم کے جلسے کو کس کی مدد سے توڑا گیا اور جب صوبائی اسمبلی کے الیکشن کا زمانہ آیا تو لیڈرانِ کرام نے اِنھیں غنڈوں کے ذریعے جعلی ووٹ بھگتائے اور کامیاب ہوئے۔ لطف یہ کہ ۵۱ء کے الیکشن میں کئی غنڈے اور بستہ بند حضرات اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوگئے۔

یہ حقیقت ہے کہ پولیس کو جتنے اختیارات ہمارے ملک میں حاصل ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ہیں اور پولیس اگر چاہے تو یہ ساری غنڈہ گردی ایک ہفتے میں بند ہوسکتی ہے کیونکہ ہر شہر اور ہر تھانے کی پولیس اپنے علاقے کے ہر ایک غنڈے کے ذاتی حالات اور مشاغل سے کماحقہ آگاہ ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس کے پاس کتنا ناجائز اسلحہ موجود ہے، غنڈوں کے تکیے اور اڈّے کہاں کہاں ہیں اور وہاں دن رات کس قسم کا کاروبار ہوتا رہتا ہے لیکن پولیس بسا اوقات ان غنڈوں کی سرگرمیوں کی طرف سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرجاتی ہے کیوں کہ ان غنڈوں سے پولیس کے ملازمین اور چھوٹے افسروں کے تعلقات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں اور عام شبہہ یہ ہے کہ غنڈے امن و قانون کے ان محافظوں میں کچھ رقم بھی تقسیم کرتے ہیں۔ چشم پوشی کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ پولیس جانتی ہے کہ غنڈوں کو صاحبِ ثروت لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے اور ان کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ ایسی حالت میں وہ غنڈوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کرکے اپنی نوکری کو خطرے میں کیوں ڈالیں۔ پھر ایسی پولیس جس پر آئے دن قانون شکنی، ناجائز زد و کوب اور قتل کا الزام عدالتوں میں لگتا رہتا ہے غنڈہ گردی کے انسداد پر کیوں کر آمادہ کی جاسکتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض غنڈے چرس، جوئے اور افیون کا ناجائز کاروبار ترک کرنا چاہتے ہیں

لیکن انہیں ان سرگرمیوں پر مجبور کیا جاتا ہے۔

حادثۂ نکلسن روڈ کا ایک تشویش ناک پہلو یہ بھی ہے کہ قتل کے ملزمان میں کئی کم عمر لڑکے شامل ہیں جو اسکولوں کے طالب علم ہیں۔ خیال تھا کہ شاید نئی نسل ان آلودگیوں سے محفوظ رہے۔ لیکن جس گندی فضا میں ہمارے نوجوان پرورش پا رہے ہیں اور اخلاق و تہذیب کی جو مثالیں ہمارے بزرگ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان کے ہوتے ہوئے یہ توقع عبث ہے۔ سینما میں قتل، مار پیٹ اور فحش مذاق کی غیر ملکی فلموں کی نمائش اور غیر ملکی جرائم آفریں کتابوں اور رسالوں کی بازاروں میں افراط اس بات کی ضمانت ہے کہ غنڈہ گردی کے زہریلے جراثیم نئی نسل کو بھی تباہ کر کے دم لیں گے۔

غنڈہ گردی ایک سماجی مرض ہے۔ دو چار غنڈوں کو عبرت آموز سزائیں دینے اور دس بیس کو شہر بدر کرنے سے اس کا مداوا نہیں ہوسکتا۔ اس کے مکمل انسداد کے لیے پورے معاشرے کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اُن باثروت لوگوں کا اثر و رسوخ کم کرنا ہوگا جو غنڈوں کی پُشت پناہی کرتے ہیں۔ پولیس کے کردار اور مزاج کو بدلنا ہوگا تاکہ وہ اپنے آپ کو واقعی قوم کا خادم سمجھیں۔ غنڈوں کی اصلاح کی مہم چلانی ہوگی اور ان کو روزی روزگار کے شریفانہ طریقوں کی جانب مائل کرنا ہوگا لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ جب تک اصلاحِ معاشرہ کا کام نہ ہو غنڈوں کو انسانی زندگی سے کھیلنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ پولیس نے مبینہ قاتلوں کو ایک ہفتے کے اندر گرفتار کر کے جس مستعدی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ شاید اصلاحِ احوال کی جلد ہی کوئی صورت نکل آئے۔

معصوم صبوحی کا خون پورے شہر کی گردن پر ہے لیکن شہر میں اگر اس حادثے کے بعد غنڈہ گردی کا قلع قمع ہوگیا تو ہم سمجھیں گے کہ صبوحی مری نہیں ہے بلکہ زندہ ہے کیونکہ اس نے اپنی جان قربان کر کے لاہور کے لاکھوں پُر امن باشندوں کی جان بچائی ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۵۷ء

لہو پکارے گا آستیں کا

امنِ عامہ اور تحفظِ ذات کا مسئلہ روز بروز زیادہ تشویش ناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ خفیف سے خفیف اشتعال پر پستول سے فائر کر دینا یا چھرا گھونپ دینا اب روز مرّہ کا معمول بن گیا ہے۔ مزاج کی یہ برہمی اور خونِ ناحق کی یہ ارزانی کسی ایک شہر یا ایک گروہ تک محدود نہیں بلکہ خاصی ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے۔ کہیں پانی کی تقسیم پر بلوہ ہوتا ہے، کہیں عورت کے اغوا پر، کہیں خاندانی رقابتوں اور دیرینہ عداوتوں کی تسکین کے لیے قتل کیے جاتے ہیں اور کہیں سیاسی حریفوں کو راہ سے ہٹانے کے لیے۔ اس لاقانونیت کے پہلو اتنے مختلف اور پیچیدہ ہیں کہ ان کو حل کرنا تنہا نہ تو پولیس کے بس کی بات ہے نہ عدالت کی اور نہ معاشرے کے دوسرے عناصر کی۔

اس مسئلے کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ ملک کے امن پسند باشندوں میں خوف و ہراس بڑھ رہا ہے اور اسی نسبت سے انتظامیہ کے اُن عناصر پر اعتماد گھٹ رہا ہے جن کے ذمّے امنِ عامہ اور تحفظِ ذات کے فرائض عائد ہوتے ہیں مثلاً گزشتہ ہفتے نکلسن روڈ کے حادثۂ قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ۔ ''ایسی پولیس جس پر آئے دن قانون شکنی، ناجائز زدوکوب اور قتل کا الزام عدالتوں میں لگتا رہتا ہے غنڈہ گردی کے انسداد پر کیوں کر آمادہ کی جاسکتی ہے''۔ ابھی اس تحریر کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ ۳۰ مارچ کو بھاٹی گیٹ کے تھانے میں ایک شخص کریم بخش کی موت پولیس کے تشدد کے باعث واقع ہوئی۔ فاضل مجسٹریٹ نے پولیس کے اس بیان کو مسترد کر دیا کہ متوفی مرگی

کا مریض تھا۔ اگر یہ اپنی نوعیت کا پہلا یا آخری حادثہ ہوتا تو ہمیں یہ کہنے میں ہرگز عذر نہ ہوتا کہ جو کچھ ہوا سوئے اتفاق سے ہوا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اختیارات کا یہ ناجائز استعمال ایک رجحان کی شکل اختیار کر رہا ہے تو ہمیں عام شہریوں کے شکوک و شبہات وزنی نظر آتے ہیں۔ صورت یہ ہے کہ اس وقت مغربی پاکستان کی مختلف عدالتوں میں آدھ درجن سے زیادہ ایسے مقدمات زیرِ سماعت ہیں جن میں پولیس کے ذمہ دار افسروں پر تشدد اور قانون شکنی کے سنگین الزامات لگائے گئے ہیں۔ سیالکوٹ میں آر۔ ایم۔ ایس کے ملازمین پر پولیس کا مبینہ تشدد، کراچی میں نور محمد میمن کی موت کا مشہور مقدمہ، سابق میجر جنرل مجید کا استغاثہ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس (سی۔ آئی۔ ڈی) کے خلاف، لاہور میں دو پولیس افسروں پر رشوت ستانی کا الزام، بورڈ پولیس کے ملازمین کی کاشتکاروں پر فائرنگ اور کئی اور مقدمات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ پولیس پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور پولیس کے بعض عناصر قانون اور امن کی حفاظت کے بجائے خود قانون شکنی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

کریم بخش کی موت لاہور کے ایک مشہور تھانے میں ہوئی۔ اس سے قبل ایک اور شخص چارلی کی موت بھی بڑے پُراسرار حالات میں ایک مقامی تھانے میں ہوئی۔ گوال منڈی میں ایک بیمار مہاجر کی موت کو ابھی بہت دن نہیں گزرے جس کے بعد تھانے دار شریف کا تبادلہ کیا گیا تھا۔ ایک طرف طاقت اور اختیار کا یہ استعمال ہے دوسری جانب غفلت کا یہ عالم ہے کہ شیخ عبدالمجید قریشی مدیر 'ایمان' قتل کر دیے گئے لیکن قاتل کا سراغ نہ لگ سکا۔ شمس الحق مرحوم غائب ہو گئے اور پولیس ان کے قاتلوں کو گرفتار نہ کر سکی۔ اسی طرح لاہور میں محمد اسحاق کی لاش نہر پر بڑے پُراسرار حالات میں پائی گئی لیکن قاتلوں کا پتہ نہ چلا۔

سوال یہ ہے کہ لوگوں میں جو خوف و ہراس پیدا ہو گیا ہے اسے کیونکر دور کیا جائے اور پولیس پر پبلک کے اعتماد کو کیسے بحال کیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتیں اور اصلاحی انجمنیں مہر بہ لب بیٹھی تماشا دیکھ رہی ہیں۔ ایم۔ ایل۔ اے صاحبان جو دن رات قوم کے درد سے تڑپتے رہتے ہیں اور سابق وزرائے کرام جو قوم کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہو چکے ہیں کہیں دور دور نظر نہیں آتے۔ ان کا فرض تھا کہ لوگوں کی ڈھارس بندھاتے، ان کے حوصلے بڑھاتے، انہیں تشدد اور تکالیف سے بچانے کی کوشش کرتے لیکن الیکشن میں شاید ابھی دیر ہے۔ جہاں تک پولیس پر اعتماد کا تعلق ہے خود محکمہ پولیس کے اعلیٰ افسروں کو اس مسئلے پر بڑی سنجیدگی

سے غور کرنا ہوگا۔ ہمیں ان کی دشواریوں کا پورا پورا احساس ہے۔ ہم انسپکٹر جنرل کی اس شکایت کو بھی درست سمجھتے ہیں کہ پولیس کی تعداد ناکافی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ سوال تعداد میں اضافے کا نہیں بلکہ ذہنیت میں تبدیلی کا ہے۔ جب تک پولیس کے ملازمین کی تعلیم نہیں ہوتی، ان کی تنخواہیں نہیں بڑھائی جاتیں، ان کی ضروریات پورا کرنے کا معقول انتظام نہیں ہوتا اور ان میں خدمت لینے کی بجائے خدمت کرنے کا جذبہ نہیں پیدا کرایا جاتا حالات نہیں سدھر سکتے۔

غنڈہ گردی کی روک تھام کے لیے پولیس نے متعدد مبینہ غنڈوں کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا ہے۔ ہم پبلک سیفٹی کے اصولی طور پر خلاف ہیں کیونکہ اس کالے قانون سے شہری آزادی کے بنیادی حق کی پامالی ہوتی ہے لیکن بفرضِ محال یہ مان لیا جائے کہ پولیس نے اب کے اس قانون کا جائز استعمال کیا ہے تو بھی آپ غنڈوں کو کتنے عرصے نظر بند رکھ سکیں گے۔ کالے قانون کے تحت کسی کو عمر قید کی سزا تو نہیں دی جاسکتی۔ سردار عبدالرب نشتر کے زمانے میں بھی غنڈوں کو نظر بند کیا تھا لیکن کیا اس سے غنڈہ گردی ختم ہوگئی یا غنڈوں نے رہائی کے بعد توبہ کرلی۔ اس قسم کے اقدامات کی نوعیت ہنگامی اور عارضی ہوتی ہے ان سے اصل خرابی کو مستقل طور پر دور نہیں کیا جاسکتا۔

۲۱ اپریل ۱۹۵۷ء

انتخابات کی تیاریاں

راستے کے روڑے

جناب سہروردی نے یومِ استقلال کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے وقت ایک بار پھر اپنے اس عہد کو دہرایا ہے کہ عام انتخابات مارچ ۵۸ء میں ہوں گے۔ ہمارے مقتدر رہنما گزشتہ دس برس میں قوم سے اتنے لاتعداد وعدے کر چکے ہیں اور پھر ان وعدوں سے اتنی بار مکر چکے ہیں کہ وزیرِ اعظم کی پیہم یقین دہانیوں کے باوجود لوگوں کو اعتبار نہیں آتا کہ عام انتخابات موسمِ بہار میں ہوں گے۔ ان کے اس ارشاد سے ہر شخص اتفاق کرے گا کہ جمہوری تقاضوں سے قطعِ نظر جب تک ہماری پارلیمنٹ غیر نمائندہ افراد کا معجونِ مرکب بنی رہے گی اور عوام کو عام انتخابات کے ذریعہ اپنے نمائندے پارلیمنٹ میں بھیجنے کا موقع نہ ملے گا اس وقت تک ملک میں سیاسی استحکام کا فقدان رہے گا اور درباری سازشیں اور جماعتی سودے بازیاں بدستور جاری رہیں گی اور چند شخصیتیں ملک کے مفاد سے کھیلتی رہیں گی اور اصول قربان ہوتے رہیں گے۔

وزیرِ اعظم کے یہ تاثرات خلوص پر مبنی ہیں اور وہ صدقِ دل سے چاہتے ہیں کہ ملک میں عام انتخابات جلد از جلد ہو جائیں۔ اور یہ بات مسٹر سہروردی کے مخالفین کو بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ عوامی لیگ کا مفاد بھی ملک میں عام انتخابات کے جلد از جلد ہونے سے وابستہ ہے کیونکہ مشرقی پاکستان میں اس کے حریف شاید ابھی اتنے طاقت ور اور منظم نہیں ہیں کہ اگر انتخابات مارچ میں ہو جائیں تو وہ عوامی لیگ کو پچھاڑ سکیں۔ مسٹر سہروردی کی ذاتی مقبولیت میں بھی گزشتہ ایک سال

میں بظاہر کوئی خاص کمی نہیں آئی ہے بلکہ بعض مبصرین کا دعویٰ ہے کہ ان کے حالیہ دوروں کے بعد ان کے وقار اور اثر میں اضافہ ہوا ہے۔ ان حالات میں جناب سہروردی کی یہی کوشش ہوگی کہ ہوا کا رخ بدلنے سے پیشتر ہی انتخابات ہوجائیں تو بہتر ہے لیکن کیا نوکر شاہی بھی یہی چاہتی ہے کہ عام انتخابات جلد از جلد ہوجائیں؟

مغربی پاکستان میں رائے دہندگان کی فہرست سازی سے متعلق جو واقعات آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے افسر حضرات الیکشن کے ابتدائی کاموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ فہرست سازی کا کام مغربی پاکستان کے اہم شہروں میں جس بے دلی سے ہو رہا ہے اس سے صوبائی حکومت بخوبی واقف ہوگی۔ چھوٹے قصبوں اور دور افتادہ دیہات کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ بعض ذمہ دار حلقوں کی جانب سے تو انتظامیہ پر یہ سنگین الزام بھی لگایا جارہا ہے کہ ہمارے اعلیٰ عہدے دار الیکشن کے کاموں میں جان بوجھ کر روڑے اٹکا رہے ہیں اور الیکشن کمیشن سے تعاون سے گریز کر رہے ہیں کیونکہ جمہوریت کے فروغ اور سیاسی استحکام سے ان کا اقتدار گھٹ جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک میں راج تو حقیقی معنوں میں انھیں بڑے افسروں کا ہے۔ وزرا آتے جاتے رہتے ہیں پھر دورانِ وزارت میں انہیں توڑ جوڑ سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ نظم و نسق کی نگرانی کرسکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس سال میں نوکر شاہی کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ عام الیکشن ہوئے تو سیاسی ناپائیداری کی پرانی فضا باقی نہ رہے گی۔

فہرست سازی کا کام بے حد غیر تشفی بخش ہے لیکن حیرت ہے کہ ری پبلکن پارٹی کے وزراء اس اہم کام کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ الیکشن کے انتظامات الیکشن کمیشن کی ذمہ داری ہے لیکن الیکشن کمیشن صوبائی حکومت کے تعاون کے بغیر الیکشن کے ابتدائی کام کیسے سرانجام دے سکتا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ری پبلکن پارٹی الیکشن کو اپنے حق میں مفید نہیں سمجھتی اور اسے ٹالنا چاہتی ہے؟

مغربی پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیاں بھی یوں تو الیکشن کی رٹ لگائے رہتی ہیں لیکن الیکشن کی خاطر فضا کو سازگار بنانے کے لیے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے صوبے کے بالغ مردوں اور عورتوں کو تو ووٹروں کی فہرست میں اپنے نام درج کرانے پر بھی آمادہ نہیں کیا ہے۔ نہ کوئی جوش ہے نہ انہماک اور نہ یہ فکر کہ اگر اندراج نامکمل رہے گا تو کیا ہوگا۔

سیاسی جماعتیں کان میں تیل ڈالے بیٹھی ہیں اور گنتی کے چند اہل کار بڑی بے دلی سے فہرستیں تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۱۸گست ۱۹۵۷ء

بنیادی فریضہ

بدنصیب قوم کو آٹھویں وزارت کا مژدۂ جان فزا سناتے ہوئے وزیرِ اعظم فیروز خاں نون نے فرمایا کہ۔ ''حکومتیں آتی رہتی ہیں، حکومتیں جاتی رہتی ہیں لیکن پاکستان کی بنیادی ضرورتوں اور پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔'' موصوف نے قوم کی آگہی میں اضافہ کرنے کی خاطر ہماری چند بنیادی ضرورتوں کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً سامانِ غذا کا مسئلہ، اسمگلنگ، افراطِ زر، اشیائے صرف کی قیمتوں میں تخفیف، سرکاری دفتروں کی بدنظمیاں، بدعنوانیاں اور رشوت ستانیاں اور مہاجروں کی آبادکاری وغیرہ وغیرہ۔ نئے وزیرِ اعظم نے اپنے پیش رو سات وزرائے اعظم کی مانند ان بنیادی مسائل کو حل کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اس تجدیدِ عہد اور تکرارِ وعدہ کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں حالانکہ ہمیں علم ہے کہ حکومتیں آتی رہتی ہے، حکومتیں جاتی رہتی ہیں البتہ ہماری بنیادی ضرورتیں بدستور باقی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی خوش عقیدہ پاکستانی اس حُسنِ ظن میں مبتلا ہے کہ نئی وزارت ہمارے مصائب و مسائل پر ہمدردی سے غور کرے گی اور ''درمانِ دردِ حافظ'' کی تلاش میں مصروف ہو جائے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔ ہمارے ملک میں ''وعدہ برائے وعدہ'' کا رواج ہے ''وعدہ برائے ایفائے وعدہ'' کی ریت، مدت ہوئی ختم ہو چکی ہے۔

ملک فیروز خاں کی وزارت دراصل ایک نگراں وزارت ہے۔ جو حضرات اس وزارت میں شامل ہیں ان کی خوش انتظامیوں اور خدمت گزاریوں سے ملک کا ہر ایک باشندہ واقف ہے لیکن قومی اسمبلی کی غالب اکثریت نے اس وزارت کی تائید ایک واضح مقصد کے تحت کی ہے۔ وہ

یہ کہ ملک میں عام انتخابات مخلوط نیابت کے اصول کے تحت اگلے نومبر تک ضرور ہو جائیں۔ اگر نون وزارت نے یہ بنیادی فرض خوش اسلوبی سے انجام دے دیا تو یہ اس کا بڑا تاریخی کارنامہ ہوگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ملک کے بعض مقتدر اور بارسوخ حلقے عام انتخابات کے مخالف ہیں۔ ان حلقوں کی ریشہ دوانیاں ہی محلاتی سازش اور وزارتی بحران کا اصل سبب ہیں۔ وہ عام انتخابات کو ابھی اور دو چار سال کے لیے ملتوی کرنا چاہتے ہیں۔ نون وزارت کی تشکیل پارلیمانی جمہوریت کی فتح اور عام انتخابات کے مخالفین کی شکست ہے۔ مگر ہمیں اس خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ سازشی حلقوں نے اپنی شکست مان لی ہے۔ اب وہ مزید توڑ جوڑ سے باز آ جائیں گے اور نئے وزارتی بحران پیدا نہ کریں گے۔

البتہ نون وزارت اور اس کے حامی اگر فروعی مسائل میں اُلجھنے کے بجائے عام انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہو جائیں تو اُنھیں ملک کے تمام جمہوریت پسند عناصر کی تائید حاصل ہو گی۔ اور کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔

انتخابی تیاریوں کا کام گزشتہ دو ماہ سے معطل ہے۔ الیکشن کمیشن کے شام و سحر تذبذب کے عالم میں گزر رہے ہیں۔ نون وزارت کو چاہیے کہ الیکشن کمیشن کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرے۔ اس کو ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے اور انتظامیہ کے تمام شعبوں کو الیکشن کمیشن سے عملی تعاون کی ہدایت دی جائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ الیکشن کے متعلق ملک میں جو بے یقینی کی فضا پیدا ہو گئی ہے اسے حکومت اپنے عمل سے دور کرے اور الیکشن کی اٹل تاریخ مقرر کر کے اعلان کر دے کہ خواہ کچھ ہو الیکشن فلاں تاریخ اور فلاں مہینے میں ضرور ہوں گے۔

مغربی پاکستان کے لوگوں کو صوبائی انتخابات کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ ان انتخابات میں یوں کہنے کو تو ہر بالغ مرد اور عورت نے حصہ لیا تھا لیکن برسر اقتدار گروہ کی طرف سے دھونس اور دھاندلی کے وہ مظاہرے ہوئے کہ الیکشن مذاق بن کر رہ گیا۔ یہ غیر جمہوری بے قاعدگیاں ختم ہونی چاہییں۔ ہر سیاسی جماعت کو خواہ وہ حکومت کی حلیف ہو یا حریف، عوام کے روبرو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی پوری پوری آزادی ہونی چاہیے۔ یوں تو عبدالقیوم خان اور مسٹر ایوب کھوڑو بھی کہتے تھے کہ ہم نے سرکاری افسروں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ الیکشن میں غیر جانب دار رہیں لیکن انتظامیہ کی مداخلتوں اور جانب داریوں نے الیکشن میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس سے کون ناواقف ہے۔ اب کے الیکشن کمیشن اور حکومت کو ان بے قاعدگیوں کا بھی سدِ باب کرنا

ہے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نون وزارت گیارہ مہینے رہے گی یا گیارہ ہفتے لیکن اپنی عارضی زندگی میں بھی اگر اس نے اپنی تمام تر توجہ الیکشن کے انتظامات مکمل کرنے اور ملک میں الیکشن کی فضا پیدا کرنے میں صرف کر دی تو پاکستان کے آٹھ کروڑ شہری تا عمر اس کا احسان مانیں گے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو الیکشن کو ہر مرض کی دوا سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عام انتخابات کے بعد بھی سیاسی جماعتوں کے توازن میں کوئی بنیادی فرق شاید نہ آئے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جن ملکوں میں عام انتخابات ہر چار پانچ سال کے بعد منعقد ہوتے ہیں وہاں بھی لوگوں کے سارے مسائل فوراً حل نہیں ہو جاتے لیکن عام انتخابات سے لوگوں کا جمہوری شعور بیدار ہوتا ہے۔ شہری ذمہ داریوں کا احساس بڑھتا ہے، خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور یہ یقین مستحکم ہوتا ہے کہ اگر امیدواروں نے اب کے بدعہدی کی تو اگلے الیکشن میں انہیں ووٹ نہ دیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک جمہوری روایت قائم ہوتی ہے اور پست ہمتی اور مایوسی کی ذہنیت ختم ہو جاتی ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۷ء

ریشہ دوانیاں

ملک فیروز خان نون کے حالیہ اعلانات سے یہ امید بندھتی ہے کہ اگر ان کی وزارت بھی درباری سازشوں کا شکار نہ ہوگئی تو عام انتخابات شاید سالِ رواں کے آخر تک ہو جائیں۔ البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ وزیرِ اعظم کی تمام یقین دہانیوں کے باوجود لوگ سرکاری بیانات پر اعتبار نہیں کرتے اور تذبذب اور شک و شبہہ کی کہر آلود فضا بدستور قائم ہے۔ پبلک کے شبہات کو تقویت دینے میں الیکشن کمیشن کی پُر اسرار خاموشی کو بھی بڑا دخل ہے کیوں کہ پبلک کو علم ہے کہ مسٹر شہید سہروردی عام انتخابات کا تحفہ مارچ میں پیش کرنے کا اعلان فرماتے رہے لیکن الیکشن کمیشن نے اچانک یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ الیکشن نومبر سے پیشتر ممکن نہیں۔ الیکشن کمیشن ایک خودمختار آئینی ادارہ ہے۔ اس کا ہر فیصلہ حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے اس لیے مسٹر سہروردی یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے کہ میں کیا کروں الیکشن کمیشن کہتا ہے کہ الیکشن نومبر سے پہلے نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ملک فیروز خان نون کے وعدوں کا حشر بھی کہیں وہی نہ ہو جو ان کے پیش رو وزیرِ اعظم مسٹر سہروردی کا ہوا تھا۔ اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ الیکشن کمیشن کے صدر عام انتخابات کی تاریخ کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کریں۔ جب تک الیکشن کمیشن کا واضح اعلان نہ ہوگا لوگوں کی بے اعتباریاں ختم نہ ہوں گی۔

الیکشن کمیشن کا اعلان اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ بعض سازشی اور اقتدار پرست عناصر جمہوریت کے نازک پودے کی بیخ کنی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ آئین کی مستقل دفعات کے

نفاذ سے خائف ہیں۔ وہ چاہتے ہی نہیں کہ ملک میں عام انتخابات ہوں اور عوام کے صحیح نمائندے یہاں حکومت کریں۔ چنانچہ کبھی سول نافرمانی کی دھمکی دی جاتی ہے، کبھی انتخابات کو بائیکاٹ کرنے کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ کبھی اصولِ نیابت پر ریفرنڈم (عام رائے شماری) کی تجویز پیش کی جاتی ہے اور کبھی انقلابی کونسل کا سبز باغ دکھایا جاتا ہے مگر ان رنگ برنگی پوشاکوں میں جو شخصیتیں کارفرما ہیں ان کی حب الوطنی اور جمہوریت کی اصل حقیقت سے ہر پاکستانی بخوبی آگاہ ہے اور ان کے اصل محرکات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

چودھری خلیق الزماں نے الیکشن کے بائیکاٹ کا جو نعرہ بلند کیا ہے ذمہ دار لیگی حلقوں نے اب تک اس کی تردید نہیں کی حالانکہ جس وقت مخلوط انتخاب کی تجویز قومی اسمبلی میں منظور ہوئی تھی تو مسلم لیگی لیڈروں نے نہ تو اس تجویز کی کھلم کھلا مخالفت کی تھی اور نہ صدر اور صدر مسلم لیگ یا مسلم لیگ کونسل نے کبھی انتخابات کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی تھی۔ حیرت ہے کہ چودھری خلیق الزماں ایک نہایت غیر ذمہ دار بیان دیتے ہیں اور بہ استثنائے راجہ غضنفر علی خاں کوئی مسلم لیگی لیڈر ان کو ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ چودھری خلیق الزماں فرماتے ہیں کہ الیکشن نہ ہوئے تو آسمان نہیں پھٹ پڑے گا لیکن کوئی ان سے یہ نہیں کہتا کہ اگر الیکشن مخلوط انتخاب کے اصول پر ہوگئے تو کیا قیامت آجائے گی البتہ الیکشن نہ ہوئے تو اس ملک میں جمہوریت کا جنازہ ضرور نکل جائے گا۔ کراچی کے ایک نیم سرکاری اخبار نے ریفرنڈم کا شوشہ چھوڑا ہے۔ اگر یہ محض ایک اخبار کی رائے ہوتی تو ہم اسے دیوانے کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دیتے لیکن اس اخباری پردے کے پیچھے بھی دراصل وہی قوتیں مصروفِ عمل ہیں جن کو الیکشن میں اپنی مطلق العنانیوں کی موت نظر آتی ہے۔

حیرت ہے کہ صدرِ مملکت نے، جو ان انتشار پسند تخریبی عناصر کی ریشہ دوانیوں سے کما حقہ، آگاہ ہیں اپنی تقریروں میں کبھی اس تشویش ناک صورتِ حال کی جانب اشارہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ۲۷ دسمبر کو کراچی کے ''شہریوں'' کی جانب سے صدرِ مملکت کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا جس میں کراچی کے ''شہریوں'' نے اخباری اطلاعات کے مطابق اس بات پر زور دیا تھا کہ ''ہمیں کوئی اپنا مخصوص نظامِ حکومت ایجاد کرنا چاہیے کیونکہ حکومت کا پارلیمانی طریقہ ہمارے ملک میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔'' یہ آواز غالباً اُنھیں عناصر کی ہے جو انقلابی کونسل کے پوسٹر اور اشتہار کراچی کی دیواروں پر چسپاں کرتے رہتے ہیں مگر حیرت ہے کہ صدرِ مملکت نے

اس بڑھتے ہوئے خطرے کو تو درخورِ اعتنا نہ سمجھا البتہ ان لوگوں پر برس پڑے جو "جمہوریت خطرے میں ہے کا فیشن ایبل شور مچاتے رہتے ہیں"۔ جمہوریت خطرے میں ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں البتہ اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ جمہوریت ایک مسلسل عمل ہے اور اپنی بقااور ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جن حقائق کی نشان دہی کی ہے اور جن خطرات کی جانب اشارہ کیا ہے اگر ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو ملک فیروز خان کے تمام وعدوں کے باوجود انتخابات نومبر میں کیا کبھی نہ ہو سکیں گے۔

۵ جنوری ۱۹۵۸ء

حیلے اور بہانے

عام انتخابات ہوں گے بھی یا نہیں اور ہوں گے تو کب؟ ان سوالوں کا تشفی بخش جواب فقط ایوانِ اقتدار سے مل سکتا ہے کیونکہ محلاتی سازشوں اور ہر آن بدلتی ہوئی وزارتوں کی مصلحت اندیشیوں کے اس ماحول میں کوئی شخص بھی پیش گوئی کی جراٴت نہیں کرسکتا لیکن آثار وقرائن بتا رہے ہیں کہ عام انتخابات کے بارے میں ہمارے اندیشے شاید درست نکلیں۔ کبھی افواہ اُڑتی ہے کہ الیکشن کمشنر نے فہرست سازی کا کام رکوا دیا ہے۔ کبھی خبر آتی ہے کہ طریقہ انتخاب میں تبدیلی ہونے والی ہے یعنی مشرقی پاکستان میں انتخابات مخلوط اصول کے مطابق ہوں گے اور مغربی پاکستان میں جداگانہ اصولِ نیابت کی بنیاد پر لیکن ان افواہوں کی حیثیت اب تک غیر سرکاری جماعتوں کے پروپیگنڈے سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اب خود حکومت کے ذمہ دار حلقے الیکشن کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جن سے ہمارے اندیشوں کو تقویت پہنچتی ہے، چنانچہ گزشتہ ہفتے جناب شیخ مسعود صادق وزیرِ بحالیات مغربی پاکستان نے راولپنڈی کے مقام پر قوم کو یہ مُودہ سنایا کہ عام انتخابات نومبر ۱۹۵۸ء کے بجائے اگلے سال مارچ یا اپریل میں ہوں گے۔ وزیرِ باتدبیر نے اس التوا کے لیے عذر یہ پیش کیا کہ شمال مشرقی علاقے کے لوگ نومبر کی سردیوں کی تاب نہ لاسکیں گے اور چونکہ جمہوریت کا تقاضہ ہے کہ ملک کے سب باشندوں کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں لہٰذا عام انتخابات کو تین چار ماہ تک کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔

شیخ مسعود صادق صاحب نے یہ اعلان اگر مرکزی حکومت یا الیکشن کمشنر کی اجازت سے کیا ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں البتہ قیاس یہی ہے کہ موصوف نے یہ بات اپنی طرف سے نہ کی ہوگی لیکن حیرت ہے کہ انہیں اتنی مدت بعد پتہ چلا کہ پاکستان کے شمال مشرقی علاقوں میں نومبر میں سردی پڑتی ہے۔ سہروردی صاحب نے جب اپنے دورِ حکومت میں اعلان کیا کہ الیکشن نومبر میں ہوں گے تو شیخ صاحب خاموش رہے۔ سہروردی صاحب کے جانشین چندریگر صاحب نے بھی نومبر میں الیکشن کرانے کا وعدہ کیا تب بھی شیخ صاحب کچھ نہ بولے اور اب نون صاحب برابر نومبر کا مژدہ سنا رہے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ پرانے سیاست دان ہیں اور شمال مغربی علاقے کے موسم سے بھی بخوبی واقف ہیں مگر ان میں سے کسی نے یہ عذر نہ پیش کیا نہ اس علاقے کے سرکاری افسروں ہی نے حکومت کو موسم کی نامساعدت سے آگاہ کیا۔ اب شیخ مسعود صادق پر راولپنڈی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ شمال مغربی علاقے کے لوگ نومبر کی سردیوں میں الیکشن میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ اوّل تو نومبر میں اتنی سردی پڑتی نہیں اور اگر پڑے بھی تو سردی ایسی چیز نہیں جس سے زندگی کے روزمرّہ کے کام رُک جاتے ہوں۔ سرحد کے لوگ تو اس سے سخت سردیوں کے عادی ہیں۔

دراصل موسم کی بات فقط انتخابات کو ملتوی کروانے کا ایک بہانہ ہے۔

الیکشن اگر بدقسمتی سے ایک بار پھر ملتوی ہو گئے تو اس کی ساری ذمہ داری ملک کی سیاسی جماعتوں پر ہوگی۔ نوکر شاہی کا تو مفاد اسی میں ہے کہ ملک میں جمہوری روایات قائم نہ ہوں۔ ہمارے وہ ملکی رہنما بھی جو نوکر شاہی کی راہ سے اقتدار کی کرسیوں تک پہنچے ہیں ابھی تک دفتری ذہنیت سے نکل نہیں سکے ہیں اس لیے ان سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ وسعتِ نظر سے کام لیں اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد سے ہم آہنگ کرنے کی طرح ڈالیں۔ البتہ رونا تو سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کی ذہنیت پر آتا ہے جو الیکشن کو بھی اپنے جماعتی اقتدار کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری ہر ایک سیاسی جماعت الیکشن کا ورد پڑھتی ہے لیکن دل سے اس کی یہی آرزو ہے کہ کسی طرح اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو جائے تاکہ الیکشن میں سرکاری اثر و رسوخ سے مدد لی جاسکے۔ کراچی میں اِن دنوں جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں ان کی غرض و غایت یہی ہے ورنہ دوسرا ملک ہوتا تو سیاسی جماعتیں وزارتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتیں بلکہ انتخابی تیاریوں میں مصروف ہو جاتیں اور ایسا ملک جس کی حیات دس سالہ میں عام انتخابات سرے سے ہوئے نہ

ہوں وہاں تو یہ سرگرمیاں دو چند ہونی چاہییں تھیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی کسی سیاسی جماعت کو— کم سے کم مغربی پاکستان میں— انتخابی تیاریوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ قومی لیڈر اقتدار کی جبیں سائی کے لیے کراچی کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اقتدار ان کی اس کمزوری سے واقف ہے اس لیے وہ ہر جماعت سے سودا کرتا ہے اور ہر شخص کو سبز باغ دکھاتا ہے۔ اس سے سیاسی جماعتوں کو تو فائدہ نہیں ہوتا البتہ اقتدار کا اقتدار اور بڑھتا ہے۔

اگر ہماری سیاسی جماعتیں چاہتی ہیں کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ ہو تو انہیں اپنی اس غلامانہ ذہنیت میں تبدیلی کرنی ہوگی اور ایوانِ اقتدار کو متنبہ کرنا ہوگا کہ وہ الیکشن میں مزید تاخیر کو برداشت نہ کریں گی۔

۲ فروری ۱۹۵۸ء

حد بندی کے بعد

ہمارے حد بندی کمیشن نے اپنا کام مکمل کرلیا۔ یہ کمیشن قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے آئندہ انتخاب کے لیے حلقہ ہائے نیابت کا تعین کرنے کی غرض سے ۲۵ جون ۱۹۵۶ء کو مقرر ہوا تھا۔ کمیشن نے مشرقی پاکستان میں انتخابی حلقوں کی حد بندی گزشتہ سال جون میں مکمل کر دی تھی اور مغربی پاکستان کے انتخابی حلقوں کا اعلان ستمبر۔ اکتوبر میں کر دیا تھا لیکن ابھی عذرداریوں کا آغاز نہ ہوا تھا کہ مرکزی وزارت بدل گئی اور مسٹر چندریگر کی مسلم لیگی وزارت نے یہ اعلان کیا کہ عام انتخابات جداگانہ نیابت کے اصول پر ہوں گے۔ چنانچہ کمیشن کو اپنے لائحہ عمل میں تبدیلی کرنی پڑی مگر چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ یہ وزارت ٹوٹ گئی اور کمیشن نے اپنے پرانے پروگرام کے مطابق دورہ شروع کر دیا۔

کمیشن نے وزارتی بحران کے علاوہ تاخیر کی دو اور وجہیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ستمبر ۱۹۵۷ء تک قومی اسمبلی اصولِ نمائندگی کا قانون منظور نہیں کر سکی تھی۔ دوئم یہ فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ انتخابات جداگانہ ہوں گے یا مخلوط۔ شکر ہے کہ یہ رکاٹیں دور ہو گئیں اور تاخیر سے سہی کمیشن کی رپورٹ بالآخر مکمل ہو گئی۔

آئین کی رُو سے نئے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد ۳۰۰ ہوگی البتہ ابتدائی دس برس کے لیے اسمبلی میں مزید دس نشستیں عورتوں کے لیے مخصوص ہوں گی۔ مساوی نمائندگی کے اصول کے مطابق مغربی پاکستان سے ۱۵۵ ارکان (پانچ خواتین) قومی اسمبلی کے

لیے براہِ راست منتخب کیے جائیں گے۔ ان میں پندرہ نمائندے ''خاص علاقوں'' کے بھی ہوں گے یعنی مغربی پاکستان میں (بشمول کراچی) قومی اسمبلی کی ۱۳۵ عام نشستیں ہوں گی۔ پندرہ خاص علاقوں کی نشستیں ہوں گی اور پانچ خواتین کی۔ اس طرح مغربی پاکستان میں ۲۳۱۲۱۵ باشندوں پر ایک نمائندہ منتخب ہوگا۔

مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے لیے بھی ۳۱۰ نشستیں مقرر ہیں۔ ان میں ۲۷۰ عام نشستیں ہیں۔ ۲۰ خاص علاقوں کے لیے مخصوص ہیں اور دس عورتوں کے لیے۔ مگر سابق پنجاب سے ۱۵۶۹۰۰ باشندوں پر ایک نمائندہ منتخب ہوگا اور دوسرے علاقوں سے ۸۲۵۷۱ باشندوں پر ایک نمائندہ۔

حد بندی کمیشن کی رپورٹ کا پورا متن تادمِ تحریر اخباروں میں شائع نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ہم اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں البتہ اب کہ حد بندیوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور ووٹروں کی فہرستیں بھی چھپ رہی ہیں امید کی جاتی ہے کہ الیکشن کمیشن عام انتخابات کی تاریخوں کا جلد اعلان کر دے گا۔ مختلف حلقوں سے الیکشن کے بارے میں جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے ان کو رفع کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی تاریخیں جلد متعین کر دی جائیں۔

عام انتخابات جمہوریت کا سنگِ بنیاد ہیں۔ چنانچہ ہم نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ملک میں جمہوریت کی بقا اور فروغ کے لیے ضروری ہے کہ عام انتخابات جلد ہوں لیکن ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو انتخابات کو ہر مرض کی دوا سمجھے بیٹھے ہیں یا جن کا خیال ہے کہ عام انتخابات کے بعد ملک کے تمام مسائل چشم زدن میں حل ہو جائیں گے۔ عام انتخابات جلد ہونے چاہییں کہ جمہوریت کا تقاضا یہی ہے لیکن موجودہ حالات میں اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ انتخابات آزاد اور غیر جانب دار ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ صدرِ محترم اور وزرائے عالی مقام نے ہمیں بار بار یقین دلایا ہے کہ وہ انتظامیہ کو انتخابات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہ دیں گے لیکن اس کا کیا علاج کہ الیکشن کا سارا کاروبار خود انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوگا اور گزشتہ دس بارہ سال میں انتظامیہ کے افسرانِ اعلیٰ میں سیاسی امور میں مداخلت کی جو ذہنیت پیدا ہوگئی یا پیدا کی گئی ہے وہ حکومت کے اعلانوں سے تو نہ بدلے گی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت مغربی پاکستان میں سیاسی طاقت اُن صاحبِ ثروت لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کی ''قوتِ خرید'' کی زد سے بڑے سے بڑا افسر بھی محفوظ نہیں۔ پھر یہ کیوں کر باور کرلیا جائے کہ وہ اقتدار پرست حضرات جن کو

عہدوں کی خاطر اپنا اصول، اپنی جماعت اور اپنا نصب العین تبدیل کرتے ذرہ برابر جھجک نہیں ہوتی الیکشن کے مواقع پر انصاف، ایمان اور دیانت کا جامہ زیب تن کرلیں گے۔ بفرضِ محال اگر یہ مان لیا جائے کہ سرکاری افسر الیکشن میں کسی فرد یا جماعت کی پاسداری نہ کریں گےتو بھی اس کا قوی اندیشہ ہے کہ ہمارے دیہاتی حلقوں سے— اور اکثریت انہیں کی ہے جانی پہچانی شکلیں دوبارہ اسمبلیوں میں واپس آجائیں گی— شہروں میں تو دو چار سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں۔ اخبارات بھی ہیں اور رائے عامہ بھی کسی حد تک سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی ہے مگر دیہات تو خیر سے ہمارے نوابوں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ وہاں انہیں حضرات کا سکہ چلتا ہے۔ مزید برآں وہاں ہنوز برادری، قوم اور خاندانی تعلقات کے نام پر ووٹ مانگا جاتا اور ملتا ہے۔ گزشتہ دس برس میں کسی سیاسی جماعت کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ دیہات کے لوگوں کا سیاسی شعور بیدار کرتی۔

ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ الیکشن ہوتے ہی ملک میں کوئی معاشرتی انقلاب آجائے گا اور وہ عناصر طاقت سے محروم ہو جائیں گے جو پاکستان کی موجودہ زبوں حالی اور پستی کے ذمہ دار ہیں بالکل بے بنیاد ہے۔ البتہ پاکستان کے مخلص اور محبِ وطن عناصر اگر الیکشن کے موقع پر عام باشندوں کا سیاسی شعور بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اسے بھی جمہوریت کی فتح اور ملک کے مستقبل کے لیے نیک شگون تصور کریں گے۔

۱۳اپریل ۱۹۵۸ء

گورنر راج کا مشورہ

اقتدار کے بھوکوں نے ہمارے صدرِ مملکت کو رمضان کے مبارک مہینے میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ پہلے مشرقی پاکستان میں وزارتی بحران پیدا کیا گیا تاکہ عام انتخابات سے پیشتر کشتی انتخابات کی ناخدائی نصیب ہو جائے۔ اس مقصد میں ناکامی ہوئی تو دوبارہ ایوانِ صدر کا رخ کیا گیا چنانچہ ان شکست خوردہ مہروں نے ایک ہفتے تک کراچی میں وہ ادھم مچایا کہ صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم مسٹر چندریگر اور مسٹر سہروردی کی نیندیں حرام ہو گئیں اور مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ کو بھی اپنا قیمتی وقت کراچی میں ضائع کرنا پڑا۔ مگر اندیشہ ہے کہ ان عبادت گزارانِ سیاست کی شب زندہ داریاں شاید رنگ لائیں۔ مرکزی وزارت عوامی لیگ کی ''غلامی'' سے آزاد ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں ایک بار پھر وزارتی بحران آ جائے اور اگر اپنے مطلب کی وزارت نہ بن سکے تو صوبائی اسمبلی اور وزارت دونوں کو توڑ کر وہاں گورنر راج نافذ کر دیا جائے۔ مسٹر عبدالعلیم کو تفریحاً مشرقی پاکستان کا گورنر نہیں مقرر کیا جا رہا ہے۔ وہ واحد ری پبلکن بنگالی ہیں۔ ری پبلکن ہوتے ہوئے جداگانہ انتخاب کے حق میں ہیں اور اس لحاظ سے مسلم لیگ اور کرشک سرامک پارٹی دونوں کے منظورِ نظر ہیں۔ یوں بھی ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کس پوشیدہ ہاتھ کے سہارے کرسیِ اقتدار پر براجمان ہیں۔ ان حالات میں مشرقی پاکستان میں گورنر راج کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اُدھر مشرقی پاکستان میں گورنر راج قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے اِدھر الیکشن کمیشن مرکزی حکومت کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ ملک میں ''آزاد

انتخاب" چاہتے ہو تو صوبائی حکومتوں کو توڑ دو اور دونوں صوبوں میں گورنر راج نافذ کردو۔ یہ تجویز آئینی طور پر جائز ہے یا ناجائز اس پر تو ہم آگے چل کر بحث کریں گے البتہ اس تجویز نے ہمارے صوبائی وزرائے کرام کی آئین پسندی، غیر جانب داری، انصاف پروری اور جمہوریت نوازی کا سارا بھرم کھول دیا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے!

مگر یہ مفروضہ کہ گورنروں کے راج میں انتخابات آزاد اور غیر جانب دار فضا میں ہوسکیں گے اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا یہ دعویٰ کہ ہماری انتظامیہ تمام سیاسی جماعتوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہے۔ یہاں مسلم لیگی حکومت قائم ہو یا نیشنل عوامی پارٹی برسرِ اقتدار آئے، اس کی بلا سے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں پنجاب صوبائی اسمبلی کے انتخابات گورنر راج کے تحت ہوئے تھے اور گورنر بھی کون، سردار عبدالرب نشتر مرحوم جن کی ذاتی دیانت داری پر کوئی شبہہ نہیں کرسکتا۔ مگر کیا کوئی شخص ان انتخابات کو آزاد اور غیر جانب دار کہہ سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ عبدالقیوم خاں اور مسٹر کھوڑو کی مسلم لیگی وزارتوں نے سرحد اور سندھ کے صوبائی انتخابات میں سخت دھاندلی مچائی تھی لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۵۴ء میں جب مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسٹر نورالامین کی وزارت اپنے تمام سرکاری اثر ورسوخ کے باوجود الیکشن ہار گئی۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جہاں تک آزاد اور غیر جانبدار انتخابات کا تعلق ہے گورنر راج کا ریکارڈ وزارتی حکومتوں سے بہتر نہیں ہے۔ قوم دونوں کی زخم خوردہ ہے۔ دونوں کی پیشانیاں ایک جیسی داغدار ہیں۔ البتہ آج جن حالات میں گورنر راج نافذ کرنے کے مشورے دیے جارہے ہیں اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تگ ودو اور سفارشیں ایک خاص مقصد کے تحت ہیں اور اس مقصد کی حصول یابی سے ملک میں جمہوری قدروں اور روایتوں کو فروغ نہ ہوگا بلکہ آمریت کے لیے فضا بدستور سازگار رہے گی۔

"آزاد اور غیر جانب دار" انتخابات کی آڑ لے کر صوبوں میں گورنر راج کا مشورہ دینے والے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ انتخابات فقط صوبائی اسمبلیوں کے نہ ہوں گے، قومی اسمبلی کے بھی ہوں گے۔ صوبائی وزیروں سے مداخلتِ بے جا کا اندیشہ ہے تو مرکزی وزارت کون سی فرشتوں کی جماعت ہے جو خاموشی سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہے گی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مرکزی وزارت توڑی نہیں جاسکتی البتہ صوبائی وزارتیں توڑی جاسکتی ہیں۔

ہم کو الیکشن کمیشن کی نیت پر شبہہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا لیکن موجودہ حالات میں گورنر راج نافذ کرنے کا مشورہ دے کر الیکشن کمیشن نے نہ ملک وقوم کی خدمت کی ہے اور نہ جمہوریت کی۔ ہمیں یہ بھی یقین نہیں کہ الیکشن کمیشن نے اپنے آئینی حدود سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ آزاد انتخابات کو بہانہ بنا کر صوبوں پر گورنری راج نافذ کرنا آئین کے الفاظ اور معنی کی کھلی خلاف ورزی ہوگی۔ اس سے ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑھے گی۔ سیاسی ہیجان وانتشار میں اضافہ ہوگا اور کیا عجب کہ اس ہنگامے میں انتخابات ہی کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو جائیں۔

۲۰ اپریل ۱۹۵۸ء

انتخابی مہم کا آغاز

ضروریاتِ زندگی کی گرانی اور کمیابی کی وجہ سے عام لوگوں کی جو حالت ہو رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خوراک ناقص ہے، پانی ناقص ہے، گھر ناقص ہے اور طبی امداد کا انتظام ناقص ہے۔ چنانچہ لوگوں کی قوتِ مقابلہ اب اتنی گھٹ چکی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بیماری پر قابو پانے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں رکھتے چہ جائیکہ چیچک اور کالرہ جیسے موذی امراض کہ ان کے لیے تو خاص انتظام کی ضرورت پڑتی ہے، مہذب ملکوں میں اگر اتفاق سے ایسی کوئی وبا پھوٹ پڑے تو ہر طرف ہلچل مچ جاتی ہے اور حکومت اپنے دوسرے تمام کام ملتوی کر کے اس آفتِ ناگہانی کا قلع قمع کرنے میں لگ جاتی ہے۔

مگر ہمارے ملک میں وزرائے کرام اور قائدینِ ملت چارہ سازی اور غم گساری کے فرائض سے غافل، اِن دِنوں انتخابی دوروں اور سیاسی سازشوں میں مصروف ہیں۔ تقریروں کے غبار اٹھ رہے ہیں۔ وعدوں کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں لیکن فردوسِ فردا کے یہ پیغامبر امروز کے مصائب کا مداوی شاید ضروری نہیں سمجھتے۔

یوں بھی انتخابی حرارت کا پارہ جوں جوں چڑھتا جاتا ہے ہمارے لیڈروں کے ذاتی اور سیاسی اخلاق کا پارہ اور گرتا جاتا ہے۔ محلاتی سازشوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔ الزام اور اعتراض کی حدیں آہستہ آہستہ اِتّہام و دُشنام سے ملتی جاتی ہیں اور اپنی سابقہ خدمات کو گنوانے کے بجائے حریفوں کی حقیقی اور فرضی برائیوں کو طشت از بام کیا جا رہا ہے۔

خود اقتدار دونوں صوبوں میں یکساں مصروفِ عمل ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی موجودہ حکومت سے مطمئن نہیں اس لیے اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں اگر عوامی لیگ کو شکست ہو جائے یا الیکشن سے قبل وہاں گورنر راج قائم ہو جائے تو جائے حیرت نہیں۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ وزرائے کرام نے انتخابی دورے شروع کر دیے ہیں۔ افسروں کے تبادلے ہو رہے ہیں۔ معتبر اور وفادار امیدواروں کی فہرستیں بن رہی ہیں اور با اثر افراد کے ساتھ سودے کیے جا رہے ہیں۔

مگران انتخابی سرگرمیوں کے باوصف عام لوگوں کو الیکشن کا اب تک یقین نہیں ہے۔ وہ گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہیں: کیا واقعی الیکشن ہونے والے ہیں۔ اقتدار کے علاوہ کوئی شخص اس کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکتا کیونکہ ہنوز ملک میں ایسی کوئی جمہوری تحریک موجود نہیں جو افراد کو ملکی تقاضوں کا احترام کرنے پر مجبور کر سکے۔ اقتدار بھی الیکشن چاہتا ہے مگر اپنی شرطوں پر۔ اگر قوم نے یہ شرطیں مان لیں تو الیکشن ضرور ہوں گے کیونکہ الیکشن ایران اور عراق میں بھی ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ الیکشن آزاد اور منصفانہ نہیں ہوتے مگر اقتدار کو اس سے سروکار نہیں۔ وہ تو فقط یہ ضمانت چاہتا ہے کہ الیکشن ہو تو اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور طاقت کی باگ آئندہ بھی اسی کے ہاتھ میں رہے۔

ابھی تک تو الیکشن کی تاریخیں بھی مقرر نہیں ہوئی ہیں اس لیے الیکشن کے نتائج کے بارے میں پیش قیاسی کرنا بہت قبل از وقت ہوگا مگر وزرائے حکومت نے اپنے حالیہ انتخابی دوروں میں جس احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے وہ آزاد اور منصفانہ انتخاب کے حق میں نیک شگون نہیں کہا جاسکتا۔ وہ نہ صرف سرکاری خرچ پر انتخابی دوروں کا پروگرام بناتے ہیں بلکہ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے سرکاری ملازمین کا عملی تعاون حاصل کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ وزرا کو چاہیے کہ وہ اپنی انتخابی سرگرمیوں کے مصارف خود ادا کریں یا اپنی جماعت سے وصول کریں۔ پبلک کا روپیہ اس لیے نہیں ہے کہ وزیر صاحبان اسے اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد کو فروغ دینے کی خاطر استعمال کریں اور نہ پبلک کے ملازموں کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے وزیروں کے جلسوں میں حاضرین اکٹھا کریں۔

برسرِ اقتدار گروہ کے ذاتی اور سیاسی اخلاق کا یہ ایک دُھندلا سا خاکہ تھا مگر اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد حصولِ اقتدار کی کوشش کرنے والے بھی کسی بہتر اخلاق اور کردار کا نمونہ

نہیں پیش کر رہے ہیں۔ حکومت پر اعتراض کرنا تو بہت آسان ہے لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے اپنے عہدِ اقتدار میں پاکستان کو جنت کا نمونہ کیوں نہ بنایا اور اقتدار سے محروم ہونے کے بعد تم نے قوم کی کیا ٹھوس خدمت کی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کی تقریروں کا بغور مطالعہ کیجیے تو ان کی سرد مہری اور غفلت شعاری پر حیرت ہوتی ہے۔ ملک میں آگ لگ رہی ہے، قیمتیں آسمان سے بات کر رہی ہیں، بلیک مارکیٹ اور اسمگلنگ، رشوت اور نفع خوری، کنبہ پروری اور اقربا نوازی کا بازار گرم ہے، لوگ روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں، جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے مگر ان حضرات کو ہمارے ان روزانہ کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ایک یونٹ کی حمایت اور مخالفت میں مصروف ہیں، وہ مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی بحث میں لگے ہیں، وہ زرعی اصلاح کے حسن و قبح بیان کر رہے ہیں۔ کیا ان کا ضمیر بالکل مردہ ہو چکا ہے۔ کیا ان کے ذہن بالکل دیوالیے ہو چکے ہیں۔ کیا ان کے پاس ہمارے درد کی دوا نہیں۔ آخر وہ ہمیں کب تک کھلونے دے کر بہلاتے رہیں گے۔ آخر ہم کب تک ان کھلونوں سے کھیلتے رہیں گے۔

۱۸ مئی ۱۹۵۸ء

مرکزی بجٹ

ملک کا شاید ہی کوئی اخبار ہو جس نے پاکستان کے نئے بجٹ پر حیرت، تشویش اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا ہو اور پارلیمنٹ میں نئے محصولات پر جو کڑی تنقیدیں ہو رہی ہیں ان سے بھی قومی ردِ عمل کا کسی حد تک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اسی ہمہ گیر اعتراض سے متاثر ہو کر مسٹر امجد علی وزیرِ خزانہ نے ۱۴ فروری کو پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ چائے، سیمنٹ اور غیر ملکی زرِ مبادلہ پر سے محصول ہٹا لیا جائے گا، موٹے سوتی کپڑے پر محصول ایک آنہ فی مربع گز سے گھٹا کر دو پیسہ فی مربع کر دیا جائے گا اور پٹرول پر چار آنے فی گیلن کے بجائے تین آنے فی گیلن محصول لیا جائے گا۔

مسٹر سہروردی کی حکومت نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اور نئے ٹیکس واپس لینے کا فیصلہ کر کے پاکستان کو بہت بڑی تباہی سے بچا لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دس سال میں کسی حکومت نے جسے عام شہریوں کی بہبودی عزیز ہو ایسا بجٹ پیش نہیں کیا تھا۔ چائے، سیمنٹ اور غیر ملکی زرِ مبادلہ پر سے محصول ہٹ گئے بہت اچھا ہوا لیکن سائیکلوں کے ٹائر ٹیوب اور جوٹ کی مصنوعات پر محصولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ ٹائر ٹیوب کو استعمال کرنے والا بھی درمیانہ اور نچلا طبقہ ہے اور اگر حکومت چاہتی تو بڑی آسانی سے ان ٹیکسوں سے بھی درگزر کر سکتی تھی کیونکہ یہ ٹیکس قومی تعمیر کی کسی سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہیں لگائے گئے ہیں بلکہ ان کا مقصد

نظم ونسق کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفالت کرتا تھا۔ ایک طرف وزیرِ خزانہ فرماتے ہیں کہ نظم ونسق کے مصارف میں سو فیصدی اضافہ ہوا ہے اور تخفیف پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے قیام کی تجویز رکھتے ہیں۔ دوسری طرف خود یہی وزیرِ خزانہ نظم ونسق کے اخراجات میں چار کروڑ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایں چہ بوالعجی ست؟ پارلیمنٹ میں بحث کے دوران میں سرکاری حکام کی فضول خرچیوں کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نظم ونسق کے ہر شعبے میں کمی کر کے بجٹ کو متوازن کیا جاسکتا تھا۔

وزیرِ مال نے اپنی محصولاتی پالیسی پر نظرِ ثانی کرتے وقت بجٹ کے دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ہے اونچے طبقے کو مراعات دینے کا پہلو جو نئے بجٹ میں بہت نمایاں ہے۔ بعض صنعتوں کو ابتدائی دور میں انکم ٹیکس کی حد تک چند رعایتیں دی گئی تھیں۔ یہ ضروری تھا لیکن اب کہ یہ صنعتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوچکی ہیں ان مراعات کو بدستور قائم رکھنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر سرمایہ داروں کو یہ رعایتیں نہ دی جاتیں اور اُونچی آمدنیوں پر ٹیکس میں تھوڑا اضافہ کر دیا جاتا تو نئے ٹیکسوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ عجیب بات ہے کہ گھوڑ دوڑ میں شرط لگانے والوں کو ٹیکس سے بری کر دیا گیا ہے اور اس طرح جواریوں کو جُوا کھیلنے کی بالواسطہ ترغیب دی گئی ہے۔ وزیرِ خزانہ اگر تمام نئے محصولات کو واپس کر لیتے تو بھی بجٹ کے اصل کردار میں کوئی فرق نہ آتا۔ اگر بجٹ کا مقصد یہی ہے کہ آمدنی اور خرچ کو برابر کر دیا جائے تو یہ کام بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے لیکن ہمیں نئی حکومت سے یہ توقع تھی کہ وہ بجٹ کے روایتی تصور سے ہٹ کر، جرأت، اعتماد اور دور اندیشی سے کام لے گی اور ایسا بجٹ پیش کرے گی جس کا تعلق قوم کی ضرورتوں اور آرزوؤں سے ہو جس سے قوم کے پیدا آور عناصر میں کام کرنے کی اُمنگ پیدا ہو اور ملک میں نیا جوش اور ابھار آئے لیکن اس دفتری بجٹ سے تو حوصلے اُبھرنے سے رہے۔

مشکل یہ ہے کہ مسٹر امجد علی ہوں یا کوئی دوسرے وزیرِ خزانہ، جب تک بجٹ کا موجودہ کردار اور موجودہ ڈھانچہ نہیں بدلا جاتا ایسے ہی بجٹ ہر سال پیش ہوتے رہیں گے۔ ایک آدھ نئے محصول لگ جائیں گے، ایک آدھ پرانے محصول منسوخ کر دیے جائیں گے، کسی ایک محکمے کو دس بیس لاکھ زیادہ مل جائیں گے، کسی دوسرے محکمے سے دس بیس لاکھ لے لیے جائیں گے۔ وزیرِ خزانہ کے پاس کوئی طلسمی چھڑی تو ہے نہیں جسے ہلاتے ہی تمام مشکلیں دور ہوجائیں۔ ہماری کُل آمدنی ایک ارب ۳۹ کروڑ ہے اس میں سے ۸۱ کروڑ محکمہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے۔ ۳۲ کروڑ نظم

ونسق کے دوسرے شعبوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ۱۱ کروڑ قرضوں کے سُود کی ادائیگی میں چلے جاتے ہیں۔ باقی کیا رہا جس کا غم کیا جائے۔

۱۷ فروری ۱۹۵۷ء

مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

''یوم آئین (۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء) کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو صدر جمہوریہ ایک قومی معاشی کونسل کو تشکیل دیں گے۔ یہ کونسل مشتمل ہوگی وفاقی حکومت کے چار وزیروں اور ہر دو صوبائی حکومتوں کے تین وزیروں پر، وزیرِ اعظم اس کونسل کے صدر ہوں گے۔ کونسل ملک کی معاشی پوزیشن کا جائزہ لے گی اور مالی، تجارتی اور معاشی حکمت عملی کے متعلق منصوبے تیار کرے گی۔ کونسل وقتِ ضرورت ماہرین کی کمیٹیاں بھی مقرر کرے گی۔''

یہ خلاصہ ہے آئین کی دفعہ ۱۹۹ کا جس کے احکام پر حکومت نے پورے ایک سال کے بعد اب عمل کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس ایک سال کے عرصے میں ملک کی معاشی حالت اس سرعت سے خراب ہوئی ہے کہ وہ حلقے بھی جو کل تک ''سب خیریت ہے'' کا بگل بجاتے تھے ''گہری'' تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ خود صدرِ مملکت نے قومی معاشی کونسل کے نام اپنے پیغام میں ارشاد فرمایا ہے اور درست فرمایا ہے کہ ''معاشی استحکام کے معنی سیاسی استحکام کے ہوں گے اور معاشی ابتری سیاسی ابتری کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے'' اور جناب شہید سہروردی صاحب نے بھی ملک کی دس سالہ صنعتی ترقی کا تذکرہ کرنے کے بعد غذائی پیداوار میں کمی کی جانب اشارہ کیا ہے اور زرعی ترقی کے لیے مناسب فیصلے کرنے پر زور دیا ہے۔

ملک کا ہر بہی خواہ قومی معاشی کونسل کی تشکیل اور اس کے حالیہ اجلاس کا خیر مقدم کرے گا لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قومی معاشی کونسل کا اجلاس اب تک کیوں نہیں بلایا گیا اور

پھر بنیادی مسائل کا تصفیہ کیے بغیر دو دن کے بعد اپریل تک کے لیے ملتوی کیوں کر دیا گیا حالانکہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ دوسرے تمام مشاغل کو پسِ پشت ڈال کر ملک کی معاشی اور زراعتی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے مضبوط لائحہ عمل تیار کیا جاتا۔ کونسل کے ممبر مرکز اور صوبوں کے وزیر صاحبان ہیں جن کا زیادہ وقت — مغربی پاکستان کی حد تک — کراچی ہی میں گزرتا ہے، پھر وہ کون سی مصلحتیں تھیں جن کی بنا پر ملک کی زیست و بقا کے مسائل کو اپریل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

قومی معاشی کونسل کے اجلاس کے اختتام پر جو سرکاری اعلان شائع ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کونسل خوراک کی قلت کے مسئلے کو دوسرے تمام مسائل پر ترجیح دیتی ہے۔ خوراک کی قلت پر قابو پانے کے لیے کونسل کیا تدابیر اختیار کرے گی ہمیں نہیں معلوم کیونکہ تادمِ تحریر کونسل کی زرعی پالیسی کا اعلان نہیں ہوا ہے لیکن مسٹر سہروردی کی افتتاحی تقریر اور پنج سالہ منصوبے کے بارے میں کونسل کے فیصلے سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ قومی معاشی کونسل بھی زرعی اصلاح کی ضرورت کو نظر انداز کر دے گی۔ حالانکہ ہمارے امریکی ماہر اور مشیر بھی اب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ملک کے نظامِ آراضی میں بنیادی تبدیلی کیے بغیر اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوسکتا۔ پارلیمنٹ میں جو تقریریں ہوئی ہیں ان میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے اور خود مسٹر امجد علی نے تسلیم کیا ہے کہ زرعی اصلاح وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود حکومت کے سرکاری اعلانات اچھی کھاد، اچھے بیج اور آب پاشی کی سہولتوں کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن زمین کو کاشت کاروں کی ملکیت بنانے کے مسئلے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی معاشی کونسل کے افراد اس اہم مسئلے پر مخصوص طبقاتی مفاد کے بجائے خالص قومی نقطۂ نظر سے غور کریں، جرأت سے کام لیں اور زرعی اصلاح کی جانب فوری توجہ دیں۔ اگر انہوں نے اس قومی فریضے سے پہلوتہی کی تو آنے والی نسلیں ان پر یہ الزام لگانے میں حق بجانب ہوں گی کہ وہ سرکاری ادارہ جس کے سپرد قوم کی معاشی بہبود کا کام تھا اُس نے قوم کی بہبودی کو ایک خاص گروہ کی بہبودی پر قربان کر دیا۔

۲۴ فروری ۱۹۵۷ء

گرانی اور اس کا انسداد

شکر ہے کہ ہمارے سرکاری حلقوں کو بھی اشیا کی گرانی کا احساس ہو رہا ہے۔ چند ہفتے گزرے کراچی کے حکام نے گراں فروشی اور بلیک مارکیٹ کا سدِ باب کرنے کی غرض سے شہر کے بڑے بازاروں میں عدالتیں قائم کی تھیں تا کہ سماج کے ان دشمنوں کو سزائیں دی جائیں جو ضرورت مندوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر چیزوں کے نرخ بڑھا دیتے ہیں۔ اب لاہور کے کمشنر صاحب نے بھی اس طرف توجہ فرمائی ہے اور شہریوں کو گراں فروشی کے عذاب سے نجات دلانے کی خاطر کچھ کمیٹیاں مقرر کی ہیں۔ حکومتِ مغربی پاکستان کی جانب سے یہ اعلان بھی ہوا ہے کہ پاکستانی فیکٹریوں کی مصنوعات کی قیمتیں مقرر کی جائیں گی تا کہ مل مالک صارفین سے ناواجب دام وصول نہ کر سکیں۔ اس کام کے لیے غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔

پچھلے آٹھ نو سال سے ملک کی اکثر سیاسی جماعتیں، قومی ادارے اور اخبارات حکومت سے مسلسل درخواست کر رہے ہیں کہ خدارا ملک کے اس سب سے اہم مسئلے کو حل کرنے کی فکر کیجیے لیکن افسوس ہے کہ اربابِ بست و کشاد کی آنکھ اب کھلی ہے جب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ اس درمیان میں ہمارے سربراہوں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ کسی ایوانِ تجارت کے جلسے یا ضیافت کے موقع پر تاجروں سے خطاب کرتے وقت رسمی طور پر یہ کہہ دیا کہ نفع خوری بڑی معیوب بات ہے اور اگر تجارت پیشہ طبقے نے یہ عادت ترک نہ کی تو حکومت بڑی سخت کارروائی کرے گی لیکن نہ تاجر اپنی معیوب حرکتوں سے کبھی باز آئے نہ حکومت نے اپنی خالی خولی دھمکیوں کو عملی جامہ

پہنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نفع خوری اور بلیک مارکیٹ کرنے والے اور شیر ہوگئے اور اب ہر مہینے دو مہینے کے بعد پہلے مصنوعی قحط پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اس ہنگامی صورتِ حال کی آڑ لے کر اشیائے ضرورت کے نرخ بڑھا دیے جاتے ہیں اور پھر یہ نرخ ''ہنگامی حالات'' کے رفع ہو جانے کے بعد بھی پھر کبھی نہیں گرتے۔ لطف یہ ہے کہ پچھلے نو سال میں اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں تو برابر اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن چھوٹے ملازمین کی تنخواہوں اور مہنگائی الاؤنس اور مزدوروں کی اُجرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کی مالی پریشانیاں برابر بڑھتی گئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے تنگ آ کر بھوک ہڑتالیں کی ہیں یا دوسرے احتجاجی قدم اُٹھائے ہیں تو حکومت نے ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے اُلٹا انہیں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ بہت ہوا تو کسی چھابڑی والے پر دس بیس روپیہ جرمانہ کر دیا گیا، کسی چھوٹے سے پرچون فروش کو سزا دے دی گئی اور حکام اپنی اس کارگزاری پر مطمئن ہوگئے۔

پچھلے آٹھ سال میں ہمارے ملک کو کروڑوں روپیہ کی امداد بیرونی ملکوں سے مل چکی ہے— کولمبو پلان کے تحت امداد، اقوامِ متحدہ کے تحت امداد، امریکہ کے چہار نکاتی منصوبے کے تحت امداد، پاکستان اور امریکہ کے درمیان معاہدوں کے تحت امداد اور نہ جانے کن کن منصوبوں کے تحت امداد، عام پاکستانیوں کا یہ خیال تھا کہ اس امداد سے ان کا اپنا بھلا ہوگا۔ اشیائے ضرورت کی فراوانی ہوگی اور دام گھٹیں گے مگر حالات اور بدتر ہوتے گئے۔ اسی طرح جب کارخانے لگے، سُوتی کپڑوں کی ریل پیل ہوئی، شکر کی پیداوار بڑھی اور دوسری مصنوعات ملک میں بننے لگیں تو لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ اب چیزوں کے دام ضرور گھٹیں گے لیکن ان کی قسمت نہ پلٹنا تھی نہ پلٹی۔ موجِ سراب موجِ آب نہ بنی۔

اب اگر فیکٹریوں میں تیار ہونے والے مال کی قیمت مقرر بھی ہوگئی تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سارا مال کھلے بازار سے اٹھ کر چور بازار میں نہ چلا جائے گا۔ رہا لاہور میں اشیائے ضرورت کی قیمتوں کو کم کروانے کا سوال، سو پہلی بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ چند سرکاری کمیٹیوں سے حل نہیں ہوسکتا اور اگر حل ہو بھی جائے اور لاہور میں چیزوں کے دام گر جائیں تو بھی لاہور پاکستان تو نہیں۔ اور گرانی کا مسئلہ پاکستان گیر مسئلہ ہے ایک شہر کا مسئلہ نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں سب سے پہلے اس مسئلے کی اہمیت کو پورے طور سے محسوس کریں اور اس کو حل کرنے کے لیے کوئی ملک گیر منصوبہ بنائیں اور ملک کی

تمام سیاسی جماعتوں کے مشورے اور تعاون سے اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ گراں فروشی اور نفع خوری کے اسباب و محرکات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امپورٹ کی ناقص پالیسی، لائسنس اور پرمٹ کی تقسیم میں رشوت، سفارش اور سیاسی سودے بازیاں، نفع خوری اور بلیک کرنے والے بڑے تاجروں اور مل مالکوں کا وزرا اور حکام میں بڑھا ہوا اثر و رسوخ، اہلِ ثروت افراد کی اسمگلنگ کرنے والوں سے ملی بھگت اور اوپری طبقے کے لوگوں میں ہر جائز و ناجائز طور سے اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خواہش، یہ ہیں گرانی کے بنیادی محرکات و اسباب۔ اگر حکومت خلوصِ دل سے گراں فروشی اور چور بازاری کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے تو اسے سرکاری دفتروں سے باہر نکل کر اُن لوگوں کو حرکت میں لانا ہوگا اور اُن لوگوں کا عملی تعاون حاصل کرنا ہوگا جو گراں فروشی اور چور بازاری کے ہاتھوں سب سے زیادہ تنگ ہیں۔

۱۹ مئی ۱۹۵۷ء

محتاجی اور دست نگری

''ہمیں امید نہ تھی کہ ہم امریکہ کے اتنے دست نگر ہو جائیں گے۔ ہماری یہ معاشی محتاجی خلافِ توقع بہت بڑھ گئی ہے اور ہماری اور ہمارے ملک کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ آخر پابندیوں کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

یہ تاثرات کسی ''تخریب پسند'' اور غدارِ وطن'' کے نہیں ہیں بلکہ جناب سید امجد علی وزیرِ خزانہ کے ہیں۔ موصوف نے ۲۱ مئی کو پشاور میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے ملک کی غذائی صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا اور اعداد و شمار کے حوالے سے بتایا کہ ہم کس طرح آہستہ آہستہ امریکہ کے محتاج ہوتے جا رہے ہیں۔ وزیرِ مال کے تاثرات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ ہمارے اربابِ حل و عقد کسی بیرونی طاقت کی اس حد تک دست نگری سے چنداں خوش نہیں ہیں اور ان کی تمنا ہے کہ یہ صورتِ حال جلد از جلد ختم ہو اور ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

اگر حکومت کے نقطۂ نظر میں یہ خوشگوار تبدیلی کسی تلخ تجربے کے باعث پیدا ہو رہی ہے تو ہمیں اربابِ اقتدار سے دلی ہمدردی ہے لیکن بہتر ہوتا کہ وزیرِ مال ابنائے وطن کو اُن ''پابندیوں'' Commitments کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیتے جن کی جانب انہوں نے ایک معنی خیز اشارہ کیا ہے۔

امداد خواہ مغرب سے ملے یا مشرق سے فی زمانہ معیوب نہیں سمجھی جاتی حالانکہ قومی غیرت کا

تقاضہ یہی ہے کہ ہم کسی بیرونی امداد کے بغیر اپنے ملکی وسائل و ذرائع ہی کی مدد سے خودکفیل ہونے کی کوشش کریں لیکن جب بیرونی امداد سے ملکی ترقی کی اسکیم پروان نہ چڑھتی ہو بلکہ فقط پیٹ کی آگ بجھائی جاتی ہو تو پھر اس امداد میں اور بھیک میں زیادہ فرق نہیں۔ اس قسم کی امداد حاصل کرنے کے بعد امریکہ سے ہمارے تعلقات مساویانہ نہیں رہ سکتے بلکہ ہم امریکہ کے اُن مطالبات کو بھی آسانی سے رد نہیں کرسکیں گے جو ہمیں نامنظور ہوں گے۔ امریکہ کی جانب سے عاید کردہ جن ''پابندیوں'' پر وزیرِ خزانہ نے بیزاری کا اظہار کیا ہے وہ دراصل نتیجہ ہیں ہماری اسی معاشی محتاجی اور دست نگری کا۔ اس تلخ حقیقت کو صدر آئزن ہاور کے گشتی سفیر مسٹر رچرڈسن نے اپنے ایک حالیہ بیان میں اچھی طرح واضح کردیا ہے۔ موصوف حال ہی میں پاکستان، عراق، ترکی اور ایران وغیرہ کا دورہ کر کے امریکہ واپس گئے ہیں۔ ان کے دورے کا مقصد یہ تھا کہ مشرقِ قریب کے ملکوں کو نئی امریکی امداد کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا جائے۔ اپنے اس دورے کی کامیابی پر فخر کرتے ہوئے اور ایشیا کے دست نگر ملکوں پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے جو کچھ فرمایا اس سے جتنا بھی سبق لیا جائے کم ہے۔ انہوں کہا کہ ''ڈالر میں ایسی قیامت کی کشش ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچ آتے ہیں۔''

۲۶ مئی ۱۹۵۷ء

فضول خرچیاں

مرکزی حکومت کی جانب سے ایک تحقیقاتی کمیٹی ان دنوں سرکاری محکموں کی فضول خرچیوں کی جانچ پڑتال کر رہی ہے۔ اس کمیٹی کا مقصد مختلف شعبہ ہائے ریاست کے روز افزوں مصارف میں تخفیف کی تجاویز پیش کرنا ہے۔ صرفِ بے جا کی جو مثالیں وقتاً فوقتاً اخباروں کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں ان سے تو یہی اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرض بہت عام ہو چکا ہے اور اگر اس کو روکنے کے لیے کوئی فوری اور موثر قدم نہ اٹھایا گیا تو ہماری قومی ترقی کے تمام منصوبے دھرے رہ جائیں گے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان دنوں ہر وہ شخص جس کا دامن ریاست کے نظم و نسق سے وابستہ ہے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں مبتلا ہے۔ سرکاری خرچ پر تفریح و تعیش کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں، سیر و سیاحت کے لیے جواز پیدا کیا جاتا ہے اور کسی قسم کی رعایت حاصل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ہمارے اکثر وزیروں، سفیروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں ستاتا کہ قومی خزانہ قوم کی امانت ہے جسے بے دردی اور لاپروائی سے خرچ کرنا شرعاً اور اخلاقاً بہت بڑا گناہ ہے۔ جن قومی رہنماؤں کو سادگی اور کفایت شعاری کی اعلیٰ روایت قائم کرنی چاہیے تھی تاکہ دوسرے ان کی تقلید کریں وہ خود اسی رَو میں بہہ گئے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عوام میں ان کی عزت اور مقبولیت ان کی ظاہرا شان و شوکت کے سبب ہے۔ بڑی بڑی تنخواہیں ہیں، نئی نئی کاریں ہیں، جدید ترین فرنیچر سے

آراستہ عالی شان کوٹھیاں ہیں، قیمتی سے قیمتی لباس ہیں غرض وہ سب کچھ ہے جس سے نفس موٹا ہوتا ہے اور خدمتِ خلق کا جذبہ کمزور ہوتا ہے۔ کاش کوئی ان کرسی نشینوں کو بتا سکتا کہ ان تن آسانیوں کا قوم کے ذہن و کردار پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے اربابِ بست و کشاد پیٹ پر پتھر باندھ لیں، پیدل چلیں اور جھونپڑیوں میں سکونت اختیار کریں — بلاشبہ ان کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہونی چاہییں جن کے بغیر ان کی کارکردگی کو نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن ضروریاتِ زندگی اور تعیشاتِ زندگی میں تمیز کرنا اتنا مشکل تو نہیں ایک ایسے ملک میں جس کے عام باشندوں کا معیارِ زندگی حد درجہ پست ہو۔ قوم اور قوم کے نمائندوں کی طرزِ بُود و باش میں اتنا تفاوت جتنا ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے ہر لحاظ سے نامناسب ہے۔

مغربی ملکوں کی مثال ممکن ہے قابلِ قبول نہ ہو لیکن ہمسایہ ملک ہندوستان میں اِن دِنوں حکومت کے مصارف میں تخفیف کی جو مہم چل رہی ہے وہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود قابلِ غور ہے۔ وہاں صدرِ ریاست اور وزرائے حکومت نے اپنی تنخواہوں میں از خود تخفیف کرکے دوسروں کے لیے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ وہاں صدرِ ریاست کی تنخواہ ابتدا میں دس ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔ اس میں چار ہزار روپیہ ماہانہ کی تخفیف ڈاکٹر راجندر پرشاد نے صدر منتخب ہوتے ہی کر دی اور اب مزید ایک ہزار روپیہ کی کمی کا اعلان ہوا ہے۔ اسی طرح وزیروں نے اپنی تنخواہوں میں دس فیصد کی تخفیف منظور کی ہے۔ صوبہ کیرالا کے وزیر تو فقط ساڑھے تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں اور معمولی مکانوں میں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں آج تک کسی وزیر نے کسی قسم کی قربانی کی زحمت نہیں کی۔ چند سال ہوئے پارلیمنٹ میں وزیروں کی تنخواہوں میں تخفیف کا سوال اٹھا تھا تو وزیرِ خزانہ چودھری محمد علی نے حساب لگا کر فرمایا تھا کہ اس سے فقط دس بارہ لاکھ کی بچت ہوگی جو فضول ہے لیکن چودھری صاحب یہ بھول گئے کہ دس بارہ لاکھ سے اور کچھ نہیں تو دس بارہ نئے اسکول کھل سکتے تھے، دس بارہ درجن مہاجر خاندانوں کو آباد کیا جاسکتا تھا مگر اصل سوال دس لاکھ یا دس کروڑ کی بچت کا نہیں بلکہ اُس ذہنیت کا ہے جو وزیروں اور افسروں کی تنخواہوں میں کوئی تخفیف گوارا نہیں کرسکتی۔ ظاہر ہے دس پندرہ لاکھ کی بچت سے ملک کے تمام مسائل حل نہیں ہوجاتے لیکن سرکاری افسروں کے لیے ایک عمدہ مثال تو قائم ہوجاتی، ایک نیا رجحان تو بنتا۔ اگر وزرائے حکومت کفایت شعاری اور سادگی کی روایت قائم نہیں کریں گے تو پھر وہ سرکاری

افسروں سے کفایت شعاری کی توقع کیوں کر کر سکتے ہیں۔

بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وزرا اور افسرانِ مملکت اپنے ذاتی خرچ کا بار بھی سرکاری خزانے پر ڈال دیتے ہیں۔ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنی ہے تو اس علاقے کا دورہ رکھ لیا، کسی شہر میں پارٹی کے جلسے میں تقریر کرنی ہے تو اس شہر کا دورہ مقرر کر لیا اور مغربی پاکستان کے سابق وزرا کا زیادہ وقت تو اپنے آبائی علاقے ہی میں گزرتا تھا۔ وزیروں کی دیکھا دیکھی سرکاری افسر بھی اپنے دوروں کے پروگرام خانگی ضرورتوں کے لحاظ سے بناتے ہیں اور گرمیوں میں تو اکثر بڑے افسروں کے دوروں کا رخ کوئٹہ، نتھیا گلی، ایبٹ آباد، مری اور دوسرے پہاڑی مقامات کی طرف ہوتا ہے۔

وزیروں اور اعلیٰ افسروں کی ظاہری شان وشوکت کا اثر پوری قوم کے مزاج اور کردار پر پڑ رہا ہے۔ سیاسی کارکن ہوں یا کالج کے طلبا و طالبات، دفتر کے کلرک ہوں یا دین و دانش کے محافظ، خواتین ہوں یا کمسن بچے، سب کے سب اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرنے ہی میں بڑائی سمجھتے ہیں کیونکہ لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ عزت، شہرت اور ترقی کے لیے ذاتی لیاقت، قومی خدمت، ایمانداری اور دردمندی کی ضرورت نہیں بلکہ ٹھاٹھ باٹھ اور اثر ورسوخ کی ضرورت ہے۔ یہ نہایت خطرناک ذہنیت ہے جو ہماری قدیم اخلاقی، معاشرتی اور انسانی قدروں کو پامال کر دے گی۔

قومی دولت کو قوم کی امانت سمجھنا، اسے فقط قومی مقاصد کے لیے خرچ کرنا، مصارف پر کڑی نگرانی رکھنا، فضول خرچیوں کے تمام دروازوں کو بند کرنا، فضول خرچ اور بددیانت افسروں کو سخت سے سخت سزائیں دینا، سادہ زندگی گزارنا اور ملک میں سادگی اور کفایت شعاری کے حق میں مسلسل مہم چلانا، یہ ہیں ہمارے رہنماؤں کے فرائضِ منصبی اور یہ بڑی آسانی سے سرانجام پا سکتے ہیں لیکن یہ کام پند و نصائح اور رپورٹوں اور تقریروں سے نہیں بلکہ ٹھوس عمل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس عمل کے لیے ہمیں اور ہمارے رہنماؤں کو اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی اور اپنی معاشرتی قدروں کو بدلنا ہوگا۔

۲۳ جون ۱۹۵۷ء

آٹھ کروڑ پاکستانیوں کا بجٹ

جس وقت یہ سطریں آپ کی نظر سے گزریں گی وزیرِ خزانہ قومی اسمبلی میں پاکستان کا سالانہ بجٹ پیش کر چکے ہوں گے۔ ابنائے وطن جو نا امیدیوں سے امید لگائے، اشیائے صرف کی ہوش رُبا گرانیوں، افراطِ زر کی فتنہ سامانیوں اور بالواسطہ اور بلاواسطہ سرکاری ٹیکسوں کی فراوانیوں میں تخفیف کا مژدہ سننے کے منتظر بیٹھے تھے یاس وحرماں کی لذتوں سے آشنا ہو چکے ہوں گے۔ مسٹر امجد علی نے دستور کے مطابق اپنی افتتاحی تقریر میں ملکی معیشت کا جائزہ لیا ہوگا، صورتِ حال کی تشویش ناکی پر تردّد کا اظہار کیا ہوگا، حکومت کے کارہائے نمایاں پر اپنے رفقا کو — اور شاید اپنے آپ کو بھی — مبارک باد دی ہوگی، قومی تعمیر وترقی کے منصوبوں اور تجویزوں کی تفصیل بیان کی ہوگی، بجٹ کے محاسن پر روشنی ڈالی ہوگی اور چلتے چلتے قوم کو صبر وتحمل کی تلقین بھی کر گئے ہوں گے۔

قومی بجٹ کی تفصیلات کے بارے میں کوئی پیش قیاسی کرنا قبل از وقت ہے مگر جو لوگ ملکی معیشت کی موجودہ رفتار سے واقف ہیں — اور کون ہے جس کو اس کی کج رفتاری کا ذاتی تجربہ نہیں — یا جنہوں نے سابقہ بجٹوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بڑے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جمعرات کی شام کو جو بجٹ قومی اسمبلی میں پیش ہوگا اس میں اور ہمارے پچھلے بجٹوں میں اعداد کا فرق ہو تو ہو اصول اور پالیسی کا کوئی فرق نہ ہوگا اور نہ کوئی ایسی تبدیلی ہوگی جس سے قومی معیشت کی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے۔

اگر بجٹ نام ہے آمدنی اور خرچ میں توازن پیدا کرنے کا تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے

ہیں کہ وزیرِ خزانہ اعداد و شمار کی مدد سے اپنی کارگزاریوں کا جواز — کم از کم کاغذ پر — پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ وہ شاید بجٹ میں ایک آدھ کروڑ کی بچت بھی دکھا دیں یا خسارہ ناگزیر ہو تو اس کے لیے معقول عذر پیش کر دیں۔ اگر بجٹ نام ہے آمدنی کو مختلف محکموں میں تقسیم کرنے کا تو مسٹر امجد علی کو اس میں بھی دشواری نہ ہوگی کیونکہ یہ تقسیم بہرصورت پوری کابینہ کے ایما سے ہوتی ہے مثلاً ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ امسال بھی ہماری ملکی آمدنی کا بیشتر حصہ قومی دفاع کی نذر ہوگا، ایک بڑی رقم امن اور تحفظ کے نام پر وزارتِ داخلہ کے حوالے کی جائے گی۔ پھر نظم و نسق کے مصارف ہیں جو ہر سال بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ جو رقم ان مدوں سے بچ رہے گی وہ قومی تعمیر پر صرف ہوگی۔

آمدنی اور خرچ میں توازن پیدا کرنا اور خرچ کی مدوں کو مناسب طور پر مختلف محکموں میں تقسیم کر دینا بجٹ بنانے والوں کے فرائض میں داخل ہے لیکن کیا یہ فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں؟ کیا فضول خرچیوں میں تخفیف کرنا اور مصارف میں کفایت شعاری سے کام لینا ہمارے فرائض میں داخل نہیں۔ کہنے کو تو ہم ایک پس ماندہ غریب ملک ہیں لیکن ہماری ظاہری شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم پس ماندہ ہیں؟ ہماری فضول خرچیوں کی رقم کروڑوں تک پہنچتی ہے اور حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہیں جس کے اربابِ اختیار قومی دولت کو قومی امانت کے طور پر خرچ کرتے ہوں۔ تحقیقاتی کمیٹیاں بنتی ہیں لیکن خود وہی حضرات ان کمیٹیوں سے تعاون نہیں کرتے جنھوں نے کمیٹیاں بنوائی ہیں۔ وزیروں اور بڑے افسروں کے صرفِ بے جا کے بارے میں اخباروں میں آئے دن عجیب و غریب انکشافات ہوتے رہتے ہیں لیکن غریب قوم کے امیر خادموں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ایک کی جگہ دس خرچ کرنا ہماری قومی عادت بن چکی ہے۔

کفایت شعاری کے علاوہ قومی پیداوار میں اضافے کی تدابیر اختیار کرنا اور اشیائے صرف کی قیمتوں کو گرا کر افراطِ زر پر قابو پانا بجٹ کو متوازن کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ فراہمیِ غذا پر ہم ہر سال پچاس ساٹھ کروڑ کا قیمتی زرِ مبادلہ ضائع کر رہے ہیں لیکن لاکھوں ایکڑ قابلِ زراعت سرکاری زمینیں ہنوز مزارعوں اور چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم نہیں ہو پائی ہیں اور نہ ذخیرہ اندوزی کا انسداد ہو سکا ہے۔ رہا افراطِ زر کا مسئلہ سو خود وزیرِ اعظم نے اعتراف کیا ہے کہ ہماری حکومت ہر سال چالیس کروڑ کے نوٹ چھاپتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قیمتیں چڑھ

گئی ہیں اور روپے کی قیمت گرگئی ہے۔ وزیرِاعظم نے اعلان فرمایا ہے کہ آئندہ ''ایک نوٹ بھی نہ چھاپا جائے گا۔'' خدا کرے ان کا یہ اعلان جلد عملی جامہ پہنے لیکن کیا وہ اپنے وزیرِ خزانہ سے دریافت کریں گے کہ گزشتہ کئی سال سے جان بوجھ کر افراطِ زر میں یہ اضافہ کیوں کیا گیا ہے۔

غرضیکہ موجودہ حکومت کے رُوبرو متوازن بجٹ پیش کرنے سے بڑا مسئلہ آٹھ کروڑ پاکستانیوں کے بجٹ کو متوازن کرنے کا ہے۔ اس کے لیے بڑی اخلاقی جرأت اور قومی درد چاہیے۔ ذاتی اور طبقاتی مفاد سے بلند ہو کر قوم کی خوش حالی اور ترقی کے تقاضوں کو اپنائے بغیر نہ تو بجٹ کی روایتی پالیسی میں تبدیلی ممکن ہے اور نہ اُن مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے جو مستقل مرض کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۵۸ء

گرانی

سفینۂ غمِ دل ان دنوں گرانی کے گرداب میں کچھ اس طرح پھنس گیا ہے کہ ساحلِ مراد کا افق بھی آنکھوں سے پوشیدہ ہوتا جاتا ہے اور بھنور کے حلقے تنگ ہو رہے ہیں اور مسافر تشویش کے عالم میں کبھی ایک دوسرے کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں اور کبھی سوئے ہوئے ناخدا کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر ہوس کی بے شرمیاں ہیں کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اشیائے صرف کی قیمتیں ہیں کہ ہر دو ماہ کے بعد دس پندرہ فی صدی بڑھ جاتی ہے۔ نہ کوئی تھوک فروشوں سے باز پُرس کرنے والا ہے نہ اجارہ داروں کو ٹوکنے والا۔ جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور جتنے دام چاہتا ہے وصول کرتا ہے۔ عام لوگ تو خیر کس شمار قطار میں ہیں۔ اب تو وہ سفید پوش طبقہ بھی چیخنے لگا ہے جس کی ماہانہ آمدنی پانچ سو روپے سے زیادہ ہے۔ اس بڑھتی ہوئی گرانی کے اسباب اور اس پر قابو پانے کے طریقوں پر اخباروں میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اگر ہمارے دلوں میں قوم کے لیے تھوڑا سا درد بھی ہوتا تو ہم مہنگائی کی اس لعنت سے کب کے آزاد ہو چکے ہوتے لیکن خدا بھلا کرے ہماری خود غرضیوں کا جو ہر ہر قدم پر ہمیں نیکی کی طرف بڑھنے سے روکتی رہتی ہیں۔

اشیائے صرف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے ملک میں پیدا ہوتی ہیں مثلاً گندم، گوشت، چاول، دال، گھی، انڈہ، سبزی، سوتی کپڑے، سگریٹ، صابن، بلب، جوتے وغیرہ، دوسرے وہ جو دساور سے آتی ہیں۔ ان میں مصنوعات بھی شامل ہیں اور وہ خام اشیا بھی جو ہماری

ملکی صنعت کی پیداوار میں کام آتی ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری خالص ملکی چیزیں بھی اسی رفتار سے مہنگی ہو رہی ہیں جس رفتار سے درآمد کی ہوئی چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ فروری میں جب کنٹرول اٹھا تو یاروں نے قیمتیں بڑھا دیں۔ دو ماہ بعد جب بجٹ پیش ہوا تو قیمتوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اور اب تیسری بار پھر دام بڑھ رہے ہیں۔ چھوٹے دکانداروں سے شکایت کرو تو وہ تھوک فروشوں اور امپورٹروں کو الزام دیتے ہیں، تھوک فروشوں اور امپورٹروں سے پوچھو تو وہ لائسنس اور پرمٹ کا رونا رونے لگتے ہیں اور حکومت کی درآمدی پالیسی کو کوستے ہیں، حکومت سے سوال کرو تو وہ تجارت پیشہ لوگوں کی نفع خوریوں اور چور بازاریوں کی داستان چھیڑ دیتی ہے۔ غرض اس مہنگائی کی ذمہ داری نہ حکومت قبول کرتی ہے نہ اجارہ دار اور امپورٹر اور نہ چھوٹے دکان دار۔ جیب کتروں کی نشان دہی کوئی نہیں کر پاتا حالانکہ ہماری جیب دن دہاڑے سر بازار روزانہ کٹتی رہتی ہے۔

مغربی پاکستان کی حکومت کئی ہفتے سے کنٹرول کی دھمکی دے رہے تھی چنانچہ گزشتہ ہفتے ''ضروری اشیا'' پر کنٹرول کا ایک آرڈیننس نافذ بھی ہو چکا ہے۔ اس آرڈیننس پر کوئی رائے ظاہر کرنا ابھی قبل از وقت ہے لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ حکومت نے کنٹرول کا آغاز اُن چیزوں کی ''پیداوار اور تقسیم'' سے کیا ہے جن کو روزانہ کی ضروریات میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً سیمنٹ، فولاد، کوئلہ، اخبار کا کاغذ اور موٹر اور موٹر سائیکلیں وغیرہ اور جن پر اس وقت بھی بڑی حد تک کنٹرول ہے اور اُن چیزوں پر کنٹرول ضروری نہیں سمجھا گیا جو ہر شخص کے استعمال میں آتی ہیں۔ مثلاً گھی، تیل، گوشت، سبزیاں وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر طبقہ حکومت پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ یہ کنٹرول الیکشن اسٹنٹ ہے۔ یعنی سیمنٹ، فولاد، کاغذ اور موٹر وغیرہ کی تقسیم پر کنٹرول اس لیے لگایا ہے کہ بااثر لوگوں کو پرمٹ دے کر ان کے ووٹ خریدے جاسکیں۔ ہم موجودہ نظامِ معیشت میں کنٹرول کو بشرطیکہ اس پر ایمان داری سے عمل ہو سکے ضروری سمجھتے ہیں لیکن اب تک لائسنس، پرمٹ اور کوٹہ کی تقسیم میں تجارت کے تمام اصولوں کو توڑ کر جس اقربا نوازی اور خویش پروری کا ثبوت دیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ بدگمانی بے بنیاد نظر نہیں آتی۔

اشیائے صرف کی چیزوں پر کنٹرول بہت ضروری ہے خواہ یہ چیزیں پاکستان کے اندر بنتی اور پیدا ہوتی ہوں یا دساور سے منگوائی جاتی ہوں لیکن یہ کنٹرول اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب اُن درمیانی کڑیوں کو کمزور کیا جائے جو فیکٹریوں اور کھیتوں کی پیداوار کو براہِ راست صارفین تک

نہیں پہنچنے دیتیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تجارت پیشہ لوگوں کا قلع قمع کیا جائے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ہر شہر اور قصبے میں احتیاج کے مطابق کوآپریٹو سٹورز کھولنے والوں کی مدد کرے — ان کوآپریٹو سٹورز کی نگرانی مشکل نہ ہوگی — یہاں ہر مال مقررہ قیمت پر فقط صارفین کو ملے۔ کوآپریٹو سٹورز کی موجودگی میں دوکان داروں کے لیے اونچے بھاؤ پر خرید وفروخت کرنا مشکل ہوگا اور انہیں بھی اپنے دام کم کرنے ہوں گے۔ یہ اسکیم ناممکن العمل نہیں ہے بشرطیکہ خلوص اور دیانت داری سے اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔

۱۴ اگست ۱۹۵۸ء

مسیحائی

صدرِ مملکت نے اب کے ۱۴ اگست کو جو پیغام نشر کیا ہے وہ اگر حسبِ دستور رسمی ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا کہ ایسے موقعوں پر اربابِ اختیار کا یہی شیوہ رہا ہے لیکن جناب اسکندر مرزا نے اپنے پیغام میں بعض ایسے سوال اٹھائے ہیں جن پر غور کرنا از بس ضروری ہے۔ انہوں نے ہمیں ایک بار پھر عام انتخابات کا مژدہ سنایا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ انتظامیہ کو جانب داری یا مداخلت نہ کرنے دیں گے۔ یہ ہفت خواں کس طرح فتح ہوگا اس کی تفصیلات کا علم تو فقط صدرِ مملکت کو ہوگا البتہ گزشتہ دس گیارہ سال کا تجربہ اگر کوئی معنی رکھتا ہے اور لائسنس، پرمٹ، الاٹ منٹ، کوٹا اور سیاسی رشوت میں اگر کوئی وزن ہے تو جمہوری روایتوں اور قدروں کے اس قحط میں آزاد اور غیر جانب دار الیکشن کا وعدہ کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ خدا کرے صدرِ مملکت ایفائے عہد میں کامیاب ہوں، الیکشن ہوں اور آزاد اور غیر جانب دار ہوں۔

مگر صدرِ مملکت نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ قوم کو خوش حالی اور فارغ البالی کا ایک ایسا نسخہ بتایا ہے جس سے اب تک نہ علمائے معاشیات واقف تھے نہ غیر ملکی مشیرانِ باصفا اور نہ ہمارے سیاست دان حضرات۔ انہوں نے ہماری سب سے مہلک قومی بیماری کی تشخیص فرماتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہماری آئندہ خوش حالی اور بقا کا انحصار سامانِ غذا میں خودکفیل ہونے پر ہے یعنی اس بات پر ہے کہ ہماری اناج کی پیداوار ہماری ضرورت سے زیادہ ہو — لیکن اناج کی پیداوار بڑھائی کیسے جائے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے صدرِ محترم نے ارشاد فرمایا کہ۔ ''ہم

زرعی اصلاحات کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتے رہے ہیں لیکن جس انداز میں ان اصلاحات کی تبلیغ کی جاتی ہے اس سے اناج کی پیداوار میں اضافہ نہ ہوگا۔" لہٰذا صدرِ مملکت کی رائے میں "امدادِ باہمی کی بنیاد پر بڑے بڑے فارم ہی اس مسئلے کا فوری حل ہیں۔"

صدرِ مملکت کے پیغام سے یہ نکتہ واضح نہ ہوسکا کہ زرعی اصلاحات کی مخالفت اور بڑے بڑے فارموں کی حمایت میں موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ان کی ذاتی رائے ہے یا ملک فیروز خاں نون کی مخلوط وزارت بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکی ہے۔ جن ملکوں میں پارلیمانی جمہوریت قائم ہے وہاں تو صدرِ ریاست حکومت کا ترجمان ہوتا ہے اور سیاسی اور معاشی مسئلے پر وہ اپنی کابینہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی رائے ظاہر ہی نہیں کرسکتا لیکن ہمارے ملک میں جو نئی روایتیں قائم ہورہی ہیں ان کے پیشِ نظر ممکن ہے کہ صدرِ مملکت مرکزی حکومت کی پالیسی کی ترجمانی نہ کر رہے ہوں بلکہ اپنے ذاتی خیالات کا اظہار فرما رہے ہوں۔

یہ سوال اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ مرکزی کابینہ زرعی اصلاحات کے بارے میں اب تک کوئی واضح فیصلہ نہیں کرسکی ہے۔ ملک فیروز خاں نون علانیہ بڑی زمینداریوں اور مروّجہ نظامِ اراضی کے حق میں تقریریں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس میاں جعفر شاہ وزیرِ زراعت و خوراک نے (جو اپنے آپ کو لینن کا ہم رتبہ سمجھتے ہیں) اعلان کیا ہے کہ وہ عنقریب زرعی اصلاحات کی ایک تجویز پیش کرنے والے ہیں اور مخلوط وزارت میں شریک ہونے والی مشرقی پاکستان کی دونوں جماعتیں عوامی لیگ اور کرشک پرجا پارٹی بڑی زمینداریوں کی تنسیخ کے حق میں ہیں۔ مختصر یہ کہ اس اہم مسئلے پر خود مرکزی حکومت کے اندر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ صدرِ مملکت نے زرعی اصلاحات کی مخالفت کرکے دراصل اُن عناصر کو تقویت پہنچائی ہے جو بڑی زمینداریوں کے حق میں ہیں اور خود بھی بڑے زمیندار ہیں۔ مسٹر ایوب کھوڑو، میر غلام علی تالپور، ملک فیروز خاں نون، نواب مظفر علی قزلباش، نواب ہوتی اور مرکز اور مغربی پاکستان کے بیشتر وزرا بڑے زمیندار ہی تو ہیں۔

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مستقبل امدادِ باہمی کی بنیاد پر بڑے فارموں ہی کا ہے۔ ٹریکٹر اور زراعت کے دوسرے جدید آلات بڑے فارموں ہی میں کارآمد ہوسکتے ہیں اور پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ بھی اُسی وقت ممکن ہے جب زراعت سائنسی اصول پر کی جائے مگر زراعت کی اس اعلیٰ سطح پر پہنچنے سے پیشتر ہمیں راستے کے روڑے ہٹانے پڑیں گے۔ بڑے فارم فقط اس

وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب فارم میں استعمال ہونے والے ٹریکٹر اور دوسرے آلاتِ زراعت ملک کے اندر تیار ہوں اور مشینی صنعت خاص ترقی کر چکی ہو کیونکہ فیکٹریوں کے لیے مشینیں تو درآمد کی جا سکتی ہیں لیکن ہزاروں لاکھوں ٹریکٹر اور دوسرے آلاتِ زراعت روز درآمد نہیں کیے جا سکتے اور درآمد کر لیے جائیں تو بھی ان کی مرمت کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ دراصل فارمنگ بجائے خود ایک بڑی صنعت ہے اور فقط صنعتی ملکوں ہی میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ ایک پس ماندہ اور زرعی ملک میں فارمنگ کی باتیں کرنا طفلِ تسلی ہے۔

اگر صدرِ مملکت واقعی بڑے پیمانے پر فارمنگ کے حق میں ہیں تو انہیں سب سے پہلے یہ تجربہ سرکاری زمینوں پر کرنا چاہیے۔ ریاست کے پاس اس وقت بھی لاکھوں ایکڑ زمینِ غیر مزروعہ موجود ہے۔ پھر کیوں نہ اس زمین پر امدادِ باہمی کے اصول پر بڑے بڑے فارم بنائے جائیں تاکہ اناج کی پیداوار میں اضافہ ہو اور دوسرے لوگ اس کامیاب تجربہ سے سبق سیکھیں۔ ابھی تو یہ شکایت عام ہے کہ سرکاری زمینیں بھی بڑے زمینداروں کے ہاتھ نیلام کی جا رہی ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو ٹریکٹر کے مقابلے میں ہاری اور مزارع کے ذریعہ کاشت کروانے کو زیادہ منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ صدرِ مملکت کے ارشاد کے باوجود ہماری ناقص رائے بھی یہی ہے کہ اناج کی پیداوار بڑھانے کا آزمودہ اور آسان طریقہ یہی ہے کہ نہ صرف بڑے زمینداروں ہی کی زمینیں مزارعوں اور ہاریوں میں تقسیم کر دی جائیں بلکہ غیر مزروعہ زمینیں بھی فقط اُن لوگوں کو دی جائیں جو خود کاشت پر آمادہ ہوں۔ امدادِ باہمی کی بنیاد پر بڑے فارم قائم کرنے کا دور اس کے بعد آئے گا۔ وہ سب ملک جہاں آج بڑے بڑے کوآپریٹو فارم چل رہے ہیں اسی دور سے گزر چکے ہیں کیونکہ ہر ملک کو ارتقا کے اسی تاریخی دور سے گزرنا ہوتا ہے۔ جو ملک بجلی کا بلب بھی نہ بنا سکے اسے مصنوعی سیّارہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے ورنہ وہ بجلی کا بلب بھی نہ بنا سکے گا۔

۱۷ اگست ۱۹۵۸ء

اُلٹی منطق

ہمارا ایوانِ اقتدار شعبدوں اور نمائشوں کی کارگاہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بازی گروں کی یہ محفل خوشی کے شادیانوں سے گونجتی رہتی تھی۔ وہاں خوش حالی اور فارغ البالی کے ایسے جانفزا مژدے سنائے جاتے تھے، منصوبوں کے ایسے ایسے رنگین مرقعے پیش کیے جاتے تھے اور کامیابیوں کے ایسے ایسے دلکش نظارے دکھائے جاتے تھے کہ چشم فلک حیران و ششدر رہ جاتی تھی اور ہم خاک نشینوں کو وطنِ عزیز پر بہشت بریں کا گمان ہونے لگتا تھا۔ مگر جب ان شعبدہ بازیوں کا طلسم ٹوٹنے لگا تو راگ بدلے گئے، ساز بدلے گئے اور نیا تماشا شروع ہوا۔ اب ایوانِ اقتدار میں ماتمی نوحے سنائے جاتے ہیں، بھیانک تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور زندگی کے ایسے ہولناک اور پریشان کن نقشے پیش کیے جاتے ہیں کہ وطنِ عزیز پر جہنم کا گمان ہونے لگتا ہے۔

یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یقین نہ آئے تو سابق وزیرِ خزانہ سید امجد علی اور موجودہ وزیرِ خزانہ سید امجد علی کی اُن تقریروں کا موازنہ کر لیجیے جو موصوف وقتاً فوقتاً قومی اسمبلی میں کرتے رہے ہیں۔ بہر حال جو گزر گئی اس کا شکوہ عبث ہے البتہ جو گزر رہی ہے اور جو گزرے گی اس پر اگر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا اور جس تباہی کی طرف ہمارے قدم بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اگر اس سے بچنے کی تدابیر بروقت نہ اختیار کی گئیں تو ہمارا انجام شاید وہی ہو جو محمد شاہ رنگیلے کی ناعاقبت اندیشیوں کے باعث ہندوستان کا ہوا تھا۔

وزیرِ خزانہ سید امجد علی نے اب کے قومی اسمبلی میں پاکستان کی مالی اور معاشی حالت کا

بڑا بھیانک نقشہ پیش کیا۔ (یاد رہے کہ اب سے چھ ماہ پیشتر بجٹ پیش کرتے وقت بھی انہوں نے حالات کی ایسی ہی ڈراؤنی تصویر دکھائی تھی اور قوم کو یہ یقین دلایا تھا کہ ٹیکسوں کی نئی تجاویز اگر منظور کر لی گئیں تو حالات سدھر جائیں گے) انہوں نے بتایا کہ زرِ مبادلہ کی محفوظ رقم جو ۱۹۵۶ء میں ۲۰۳ کروڑ ۸۲ لاکھ تھی اب گھٹ کر ۵۰ کروڑ رہ گئی ہے۔ اس درمیان میں بیرونی قرضے کی رقم ۲۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی ہے (تقریباً ۱۳ ارب روپیہ) اور اس کے سُود کی ادائیگی پر پاکستان کے مجموعی زرِ مبادلہ کا آٹھ فیصدی خرچ ہو جاتا ہے۔ کپاس کی برآمد سے ہمیں ۱۹۵۱ء میں ۱۰۹ کروڑ کا نفع ہوا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں یہ رقم گھٹ کر ۲۹ کروڑ رہ گئی کیونکہ وزیرِاعظم ملک نون کے الفاظ میں ''ہم اپنی کپاس اب مغربی یورپ میں فروخت نہیں کر سکتے کیونکہ امریکہ ان ملکوں کو قرضہ دے رہا ہے تاکہ وہ اس رقم سے امریکی کپاس خریدیں''!۔ سوتی کپڑے کی برآمد بھی بہت گھٹ گئی ہے مثلاً ۱۹۵۷ء میں ہم نے سات کروڑ کا سوتی کپڑا دساور بھیجا لیکن اس سال ہم بمشکل ایک کروڑ کا کپڑا برآمد کر سکیں گے۔ صنعتی پیداوار میں بھی کمی ہو رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۵۵ء میں صنعتی پیداوار میں ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہوا لیکن ۱۹۵۷ء میں فقط سات فیصدی کا۔ وزیرِ خزانہ نے یہ بھی بتایا کہ اناج درآمد کرنے پر ہم نے گزشتہ دو سال میں ۵۳ کروڑ کا زرِ مبادلہ خرچ کیا اور اب کے بھی یہ روایت دہرائی جائے گی۔

لگے ہاتھوں ذرا غیر ملکی امداد کی کہانی بھی سن لیجیے۔ جس وقت اس غیر ملکی امداد کا آغاز ہوا تھا تو کارفرمایانِ مملکت نے اس کی ثنا و صفت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ ہر سمت اس امداد کی مسیحا نفسی کے چرچے تھے اور ہر سُو اس کا غلبہ تھا لیکن اب وزیرِ خزانہ اس سے سخت مایوس اور بدظن ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ اب تک ہمیں ۸۳ کروڑ ۹۰ لاکھ ڈالر کی بیرونی امداد مل چکی ہے لیکن اس زرِ کثیر میں سے تعمیری کاموں پر فقط ۱۸ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے ہیں!

وزیرِ خزانہ نے اعداد و شمار کی مدد سے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری مالی اور اقتصادی حالت بہت خراب ہے حالانکہ ہمارے تجربے مدت سے اس تلخ حقیقت پر گواہی دے رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت نے ان ناگفتہ بہ حالات پر قابو پانے کے لیے اب تک کیا تدابیر اختیار کیں۔ اگر کیں تو پھر حالات بہتر کیوں نہیں ہوئے۔ اگر نہیں کیں تو کیوں؟ مگر افسوس ہے کہ وزیرِ خزانہ یا کسی دوسرے وزیرِ باتدبیر کی تقریر میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈے سے بھی

نہیں ملتا۔ البتہ آئندہ کے لیے وزیرِ خزانہ نے قوم کو یہ مشورہ دیا ہے کہ صنعتی ترقی کا خیال ترک کر دو اور پوری توجہ زراعت پر مرکوز کر دو کیوں کہ ہم خوراک کی حد تک خودکفیل نہیں ہوئے تو غیر ملکی امداد بھی بند ہو جائے گی، زرِمبادلہ بھی ختم ہو جائے گا اور رہی سہی صنعت بھی بیٹھ جائے گی۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمیں خوراک کی حد تک خودکفیل ہونا چاہیے اور زرعی ترقی کی طرف توجہ دینی چاہیے لیکن صنعت کو قربان کر کے زراعت کو فروغ دینے کی منطق ہماری فہم سے بالاتر ہوتی اگر ہم اس حقیقت سے واقف نہ ہوتے کہ برطانیہ ہمارے ملک میں سو سال تک اسی پالیسی پر عمل کرتا رہا اور ہمارے امریکی دوست ان دنوں ہر پس ماندہ ملک کو یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ صنعتی پیداوار کا کام ترقی یافتہ ملکوں پر چھوڑ دو، تم بس کھیتی باڑی کیے جاؤ تاکہ ہم بدستور انہیں کچا مال سپلائی کرتے رہیں اور ان کی مصنوعات منہ مانگے داموں ہمارے بازاروں میں بکتی رہیں۔

آج اگر ہمیں اناج امپورٹ کرنے پر اپنا قیمتی زرِمبادلہ ضائع کرنا پڑ رہا ہے تو اس میں ہماری صنعتوں کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ قصور ہے ہماری زرعی پالیسی اور زرعی نظام کا۔ لاکھوں ایکڑ زمین ملک کے بڑے زمینداروں کے پاس غیر مزروعہ پڑی ہے اور اس کو زیرِ کاشت لانے کے لیے کوئی قانون نہیں بنتا۔ لاکھوں ایکڑ زمین جو نئے براجوں سے سیراب ہو سکتی ہے ہنوز آباد نہیں ہو سکی ہے کیوں کہ حکومت اس کو غریب کاشت کاروں میں تقسیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ بڑے بڑے زمیندار جو صوبائی اور مرکزی حکومتوں پر قابض ہیں اپنے مزارعوں کو حقِ ملکیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اناج کی فراہمی کے احکام کی اعلانیہ خلاف ورزی کرتے ہیں اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ سمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ لاکھوں ایکڑ زمین سیم اور تھور کی نذر ہو جاتی ہے اور جو بچ رہتی ہے اسے ہر سال سیلاب تباہ کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک کام کے لیے بھی زرِمبادلہ درکار نہیں البتہ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو زرِمبادلہ بچایا جا سکتا ہے۔ مگر ہماری حکومت بھی عجیب ہے کہ ایک طرف زرِمبادلہ کا رونا روتی ہے دوسری طرف وہ تدابیر اختیار کرنے پر رضامند نہیں ہوتی جس سے زرِمبادلہ بچ سکے۔ میاں جعفر شاہ نے اس بات پر اظہارِ مسرت کیا ہے کہ حکومت نے زرعی آلات کی امپورٹ کے لیے ڈیڑھ کروڑ کا زرِمبادلہ منظور کیا ہے لیکن ہمارے ملک میں اگر لوہے کے کارخانے ہوتے تو ہمیں زرعی آلات امپورٹ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ ہمارا زرِمبادلہ

ان پر ضائع ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ بڑے پیانے پر زرعی فارمنگ کے لیے بھی صنعت کو مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے نہ کہ صنعتی ترقی کو روکنے کی۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملک صنعت و زراعت کی ترقی کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے کیوں کہ صنعت پر زراعت کو ترجیح دینا اس پرانے فیوڈل نظام کو دوبارہ اپنے اوپر مسلط کرنا ہے جس سے ہم ابھی تک آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے نہ زرِمبادلہ درکار ہے اور نہ صنعتی ترقی کی قربانی۔ اس کے لیے ضرورت ہے زرعی نظام میں بنیادی اصلاح کی۔ اسی طرح اناج کی پیداوار ''اناج زیادہ اُگاؤ'' کی سکیموں سے نہیں بڑھ سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بڑے زمینداروں اور سمگلروں اور ذخیرہ اندوزوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو، براج کی زمینیں کاشت کاروں میں تقسیم کی جائیں، غیر مزروعہ زمینوں کو مزارعوں کے حوالے کیا جائے، سیم اور تھور اور سیلاب کی روک تھام کو اپنا فرضِ اوّلین تصور کیا جائے اور بھاری صنعتوں کو فروغ دیا جائے تا کہ زرعی آلات اور مصنوعی کھاد وغیرہ کے امپورٹ پر زرِمبادلہ ضائع نہ ہو۔

۱۴ ستمبر ۱۹۵۸ء

خوش حالی کی راہ

ترقی یافتہ ملکوں اور پسماندہ ملکوں کے درمیان وہی فرق ہے جو ایک آسودہ حال خاندان اور ایک مفلوک الحال گھرانے میں ہوتا ہے۔ دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کی سوچ بچار، ان کی بود و باش، ان کی تفریحوں کے دائرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن فرق کی اس خلیج اور اختلافات کے اس دائرے کو کم نہ کیا جائے تو یہی خلیج بڑھ کر بحرِ بلا خیز اور یہی دائرے پھیل کر سیلابِ فنا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن سے نہ آسودہ حال قومیں بچ سکتی ہیں اور نہ مفلوک الحال قومیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے متعدد ادارے ان دنوں اس کوشش میں ہیں کہ پسماندہ ملکوں کا معیارِ زندگی بلند ہو اور لوگ آرام چین سے رہ سکیں۔ عالمی بینک ایسا ہی ایک ادارہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا۔ آج کل عالمی بینک کے گورنروں کی جو سالانہ کانفرنس دہلی میں ہو رہی ہے اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ایشیا میں عالمی بینک کا یہ پہلا اجلاس ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ایشیا کی خوش حالی اور ایشیائی ملکوں کے معاشی استحکام کو دنیا کی خوش حالی اور امنِ عالم کے لیے کتنا ضروری سمجھتے ہیں۔

عالمی بینک کا مقصد، ممبر ملکوں کے تعمیری منصوبوں کی امداد کرنا ہے چنانچہ عالمی بینک اب تک پسماندہ ملکوں کو ۳ ارب ڈالر قرض دے چکا ہے لیکن پس ماندہ ملکوں کی مالی اور معاشی حالت اتنی نازک ہے، ان کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں ان کا معیارِ زندگی اتنا کم ہے کہ ابھی عالمی بینک کو ان ملکوں کے لیے نہ جانے کتنے ارب ڈالر اور درکار

ہوں گے۔ عالمی بینک کو اپنی کم مائیگی اور حاجت مندوں کی ضرورتوں کا پورا پورا احساس ہے لیکن اس کا مالی سرمایہ ہنوز بہت محدود ہے۔ وہ اگر چاہے بھی تو ہر ترقیاتی منصوبے کی کفالت نہیں کرسکتا اور نہ ہر ملک کو بوقتِ ضرورت قرضہ دے سکتا ہے۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور نے عالمی بینک کی اسی دشواری کے پیشِ نظر یہ مشورہ دیا ہے کہ بینک کے ذرائع میں اضافہ کیا جائے تاکہ کسی پسماندہ ملک کو سرمائے اور سامان کی کمی کا شکوہ نہ رہے۔ عالمی بینک کے گورنر بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور غالباً دہلی کانفرنس میں سرمایہ بڑھانے کا فیصلہ کرلیا جائے گا۔

لیکن عالمی بینک کے مسائل یہیں ختم نہیں ہوجاتے۔ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ پسماندہ ملکوں کا معاشی ڈھانچہ مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم رہے اور وہ اقتصادی بحران اور کساد بازاری کا شکار نہ ہونے پائیں ورنہ مالی امداد کا اصل مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ پاکستان کے نمائندے نے اپنی تقریر میں اسی خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس نے عالمی بینک کو بتایا کہ خام اشیا کی قیمتوں اور برآمد کی مقدار میں جو کمی اس سال ہوئی ہے اس کا اثر پسماندہ ملکوں کی پوری معیشت پر پڑا ہے مثلاً پاکستان کپاس اور جوٹ بڑی مقدار میں برآمد کرتا تھا اور اس تجارت سے کافی زرِ مبادلہ کماتا تھا لیکن عالمی بازار میں کپاس اور جوٹ کی قیمتیں اب کے بہت گرگئیں اور مانگ بھی بہت گھٹ گئی۔ جوٹ کی قیمت تیس روپے فی گانٹھ گھٹ گئی اور اب ۱۵۰ روپے کے حساب سے بک رہی ہے۔ کپاس سے ہم نے ۱۹۵۳ء میں چھ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ زرِ مبادلہ کمایا تھا مگر ۱۹۵۷ء میں فقط سوا دو کروڑ کما سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں جو بیرونی امداد ملی اس کا تین چوتھائی، نقصان کی تلافی ہی پر خرچ ہوگیا اور ترقیاتی منصوبوں کا کام مدھم پڑ گیا۔ پسماندہ ملکوں کے لیے یہ صورتِ حال نہایت تشویشناک ہے۔ جب تک خام مال کا بھاؤ اونچا نہیں ہوتا اور ان کی مانگ نہیں بڑھتی پسماندہ ملکوں کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ پاکستان کے نمائندے نے عالمی بینک سے اپیل کی ہے کہ وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرے۔

پسماندہ ملکوں کا دوسرا اہم مسئلہ جس کی جانب ہمارے نمائندے نے اشارہ کیا مصنوعات کی برآمد ہے۔ دس بارہ سال کی کوشش کے بعد اب کئی پسماندہ ملک مصنوعات کی درآمد کے قابل ہوئے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں سوتی کپڑا اب اتنی مقدار میں بنتا ہے کہ ہم اسے آسانی سے باہر بھیج سکتے ہیں۔ ایسی ہی اور بھی کئی مصنوعات ہیں لیکن ہمیں دنیا کے ہر چھوٹے بڑے بازار میں ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کی مصنوعات ہم سے لامحالہ اچھی یا سستی ہوتی ہیں۔ ایسی

حالت میں ہم مقابلہ کریں تو کیسے اور زرِمبادلہ کمائیں تو کیونکر نتیجہ یہ ہے کہ ہماری صنعت وتجارت کو فروغ نہیں ہوتا اور ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے۔

ہمیں امید ہے کہ عالمی بینک پسماندہ ملکوں کے ان بنیادی مسائل پر ہمدردی سے غور کرے گا اور ترقی یافتہ ملکوں کے تعاون سے کوئی ایسی راہ نکالے گا جو ہمیں خوش حالی کی طرف لے جائے تاکہ خود کفیل ہو کر ایک دن ہم بھی دوسروں کی امداد کے قابل ہو جائیں۔

۱۲اکتوبر ۱۹۵۸ء

پاک بھارت تعلقات

نہری پانی کا تنازعہ

کشمیر کی مانند نہری پانی کا سوال بھی پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے کیونکہ مغربی پاکستان کی پوری معیشت اور معاشرت کا انحصار دریائے سندھ اور اس کے معاون پانچ دریاؤں اور ان سے نکلنے والی نہروں پر ہے۔ (دریائے سندھ کے طاس میں زیرِ کاشت اراضی کا رقبہ ۲ کروڑ ۵۷ لاکھ ایکڑ ہے۔ اس میں ہر سال تقریباً ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ایکڑ کی آب پاشی انھیں دریاؤں سے ہوتی ہے)۔ دراصل لن دریاؤں سے سیراب ہونے والا ساڑھے تین لاکھ مربع میل کا علاقہ ایک معاشی اور قدرتی وحدت ہے لیکن انگریزوں کی عیاری کی داد دینی پڑتی ہے کہ جاتے جاتے انہوں نے اس معاشی وحدت کو اس طرح پارہ پارہ کیا کہ دو لاکھ چار ہزار مربع میل تو پاکستان میں رہا بقیہ ہندوستان کے حصے میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نو سال گزر جانے کے بعد بھی نہری پانی کا مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان نزاعی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مغربی پاکستان کا نظامِ آبپاشی معرضِ خطر میں ہے بلکہ دو ہمسایہ ملکوں کے تعلقات تلخ سے تلخ تر ہوتے جاتے ہیں اور یہ گتھی ہے کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

اِن دِنوں لاہور اور دہلی میں عالمی بینک کے نمائندے کی وساطت سے نہری پانی کے بارے میں جو مذاکرات ہو رہے ہیں ان پر قیاس آرائی کرنا قبل از وقت ہے لیکن یہ بات چیت گزشتہ چار پانچ برس سے جاری ہے اور ابھی نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ۱۹۵۴ء میں عالمی

بینک نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ دریائے سندھ کے طاس میں بہنے والے مغربی دریاؤں — جہلم، چناب اور سندھ — کا پانی بلاشرکتِ غیرے پاکستان کو ملے اور مشرقی دریاؤں — ستلج، بیاس، راوی کا پانی بلاشرکتِ غیرے ہندوستان کو ملے البتہ عبوری دور میں ہندوستان مشرقی دریاؤں کا پانی بند نہ کرے گا اور چناب کو راوی سے ملانے کے لیے پاکستان جو نہر بنائے گا اس کے مصارف کا ایک حصہ ہندوستان ادا کرے گا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے عالمی بینک کے فیصلے کو اصولی طور پر تسلیم کرلیا تھا لیکن پاکستان کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی تھی کہ پہلے اس بات کی تحقیق ہو جائے کہ تینوں مغربی دریاؤں میں پانی کا بہاؤ پاکستان کی ضرورت کے مطابق ہے یا نہیں۔ پاکستان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان الحاقی نہر کے پورے مصارف ادا کرے جن کا تخمینہ ایک ارب روپیہ کے لگ بھگ تھا لیکن ہندوستان ۴۰ کروڑ روپیہ سے زائد ادا کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اب ہندوستان کا مطالبہ ہے کہ پہلے پاکستان ۵۴ء کے فیصلے کو تسلیم کرے اور فروعی اختلافات کے لیے ثالثی بورڈ کی تشکیل پر رضامندی کا اظہار کرے تب تفصیلات پر گفتگو ہو سکے گی۔

عالمی بینک کے نمائندے مسٹر ایلیف نے لاہور میں اعتراف کیا کہ وہ اپنے ہمراہ کوئی نئی تجویز نہیں لائے ہیں۔ ان کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی بینک ۵۴ء کے فیصلے ہی کو گفت و شنید کی اساس قرار دیتا ہے۔ پاکستان کی طرف سے وزیرِاعظم جناب سہروردی اور وزیر مال سید امجد علی صاحب نے جو تجاویز عالمی بینک کے سامنے رکھیں وہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ پاکستانی نمائندے کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کریں گے اور نہ کوئی ایسی تجویز منظور کریں گے جس سے مغربی پاکستان کے نظامِ آبپاشی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

آخر میں ہم اربابِ اقتدار سے گزارش کریں گے کہ وہ عالمی بینک کے وعدوں، تجویزوں اور فیصلوں کو قبول کرنے سے پیشتر انہیں اچھی طرح جانچ لیں۔ عالمی بینک کوئی آزاد اور غیر جانب دار ادارہ نہیں بلکہ اس کا مقصد مغربی طاقتوں کے مفاد کی حفاظت کرنا ہے۔ یہی ادارہ تو تھا جس نے اسوان بند کی تعمیر کے لیے پہلے مصر کو قرضہ دینے کا وعدہ کیا لیکن جب برطانیہ اور امریکہ کے تیور بدلے دیکھے تو وعدے سے منحرف ہوگیا۔ اس لیے عالمی بینک پر بھروسہ کرکے صورتِ حال سے مطمئن ہو جانا نامناسب ہوگا۔ ہمیں ابھی سے یہ سوچ لینا چاہیے کہ اگر ہندوستان نے ضد سے کام لے کر مشرقی دریاؤں کا پانی بند کر دیا تو ہم کیا کریں گے۔

۱۶ جون ۱۹۵۷ء

دار ورسن کی آزمائش

شیخ عبداللہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ شیرِ کشمیر کی یہ گرفتاری نہ حیرت انگیز ہے اور نہ خلافِ توقع۔ اب سے ساڑھے تین ماہ قبل جب حکومتِ ہند نے کشمیر کے اس محبوب رہنما کو عالمی رائے عامہ کے پیہم اصرار پر رہا کیا تھا تو پنڈت نہرو نے شاید یہ سوچا تھا کہ چار سال کی قیدِ تنہائی کے بعد شیخ عبداللہ کے خیالات وعقائد میں کوئی تبدیلی آ گئی ہوگی اور وہ دوبارہ گرفتاری کے خوف سے خاموشی اختیار کر لیں گے لیکن جنونِ شوق کے انداز زنجیر وسلاسل کے پابند نہیں ہوتے اور نہ مردانِ حر کی حق آ گاہیاں اسیری کے اندیشوں کو خاطر میں لاتی ہیں۔ چنانچہ شیخ عبداللہ کی پیشانی پر نہ پشیمانی کے قطرے ابھرے اور نہ ان کے قدموں نے اپنی رہ نوردیوں کا رخ بدلا۔ جس جرأت و بے باکی سے اُنہوں نے اب سے چار سال پیشتر کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا نعرہ بلند کیا تھا رہائی کے بعد انہوں نے اسی جرأت و بے باکی سے نام نہاد ''الحاق'' کے خلاف آواز اٹھائی اور آزاد استصوابِ رائے کا مطالبہ کیا۔ حکومت ہند آزاد استصوابِ رائے کے لیے آمادہ نہ تھی اور نہ وہ شیخ عبداللہ کو تبلیغِ حق کی اجازت دے سکتی تھی۔ ایسی حالت میں شیخ صاحب کی دوبارہ گرفتاری اٹل تھی۔ دار ورسن کی کہانی کتنی سادہ اور آسان ہے!

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ کیا چالیس لاکھ کشمیری اپنے حق خود ارادیت سے دست بردار ہو جائیں گے اور آزاد استصوابِ رائے کا مطالبہ ترک کر دیں گے۔ خود ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ شاہد ہے کہ محبانِ وطن پر جتنی سختی کی

گئی ملک پر انگریزوں کی گرفت اتنی ہی کمزور ہوئی۔ تشدد کا وہ کون سا حربہ تھا جو انگریزوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں استعمال نہ کیا مگر ہندوستانیوں کا ''ذوقِ گناہ'' ہر سزا کے بعد اور تیز ہوا۔ حیرت ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کے ہم نواؤں نے تاریخ اور ذاتی تجربے کے یہ سبق بہت جلد بھلا دیے۔ حق کی آواز اگر نظر بندیوں کے قانون اور زباں بندیوں کے احکام سے دبائی جا سکتی تو آج دنیا والوں کے کان حق کے نام سے بھی نا آشنا ہوتے۔ حق و باطل کی رزم گاہ میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری پہلا اور آخری سانحہ تو نہیں۔

شیخ عبداللہ کی نظر بندی دراصل اعترافِ شکست ہے استبدادی طاقت کا تاریخ کے تقاضوں کے روبرو — فرار ہے ہوسِ اقتدار کا حقیقت کی تلخیوں سے — لیکن حکومتِ ہند کشمیر کے بارے میں اپنے آپ کو کب تک دھوکا دیتی رہے گی۔ گزشتہ دو ڈھائی ماہ میں ہندوستانی اخباروں نے ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شیرِ کشمیر کی شہرت اور مقبولیت کا سورج مدت ہوئی ڈوب چکا ہے۔ اب ان کی آواز میں نہ وہ پہلا سا اثر باقی ہے نہ ان کی شخصیت میں پہلی سی کشش رہ گئی ہے بلکہ کشمیر کے چالیس لاکھ عوام اب شیخ صاحب کے بجائے بخشی صاحب کے شیدا و گرویدہ ہیں۔ مگر شیخ عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری نے ان دروغ بافیوں کا پردہ چاک کر دیا۔ حقیقت یہ کہ حکومتِ ہند نے شیخ عبداللہ کی بے پناہ مقبولیت ہی کے خوف سے انہیں گرفتار کیا ہے۔ ورنہ اُتری کمان سے کون ڈرتا ہے۔

اسے تدبر کا عجز کہو یا طاقت کا گھمنڈ، حکومتِ ہند نے شیخ عبداللہ کو ایسے وقت گرفتار کیا ہے جب ڈاکٹر گراہم کی رپورٹ سیکورٹی کونسل کے سامنے پیش ہونے والی ہے۔ ہمیں سیکورٹی کونسل کی جانب سے کوئی خوش فہمی نہیں مگر شیخ عبداللہ کو گرفتار کر کے پنڈت نہرو نے سیکورٹی کونسل اور عالمی رائے عامہ کو یقین دلا دیا ہے کہ باشندگانِ کشمیر کے مطالبات اور خواہشات کی ترجمانی شیخ عبداللہ کرتے ہیں نہ کہ بخشی حکومت۔ اور کشمیر کے سلسلے میں ہندوستان نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر پنڈت نہرو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ شیرِ کشمیر کی گرفتاری سے آزاد کشمیر کی تحریک دب جائے گی تو یہ ان کی بھول ہے۔ شیخ صاحب چار سال قید رہے تو کیا آزاد کشمیر کی تحریک دب گئی۔ کیا کشمیر کا مسئلہ حل ہو گیا۔ شیخ کی گرفتاری سے تو کشمیر میں پیچیدگیاں اور بڑھ جائیں گی کیونکہ کشمیر کا مسئلہ اب فقط ایک محدود علاقے کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے جنوب مشرقی ایشیا کے امن کا مسئلہ ہے۔

حکومتِ ہند کو جلد یا بدیر شیخ عبداللہ کو رہا کرنا پڑے گا۔ نہ صرف رہا کرنا پڑے گا بلکہ ان کے مطالبات ماننے ہوں گے کیونکہ ان کے مطالبات ایک فرد کے مطالبات نہیں پوری کشمیری قوم کے مطالبات ہیں۔ اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی قومی آزادی کے مطالبات کو زیادہ عرصہ تک ٹھکرا نہیں سکتی۔

۴ مئی ۱۹۵۸ء

پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات

پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات گزشتہ دس گیارہ سال میں اتنے خراب کبھی نہیں ہوئے جتنے آج کل ہیں۔ خیال تھا کہ وقت کے ساتھ کدورتوں کے غبار چھٹتے جائیں گے۔ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی مانند غموں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے، ایک دوسرے کے کام آئیں گے اور اس برِ صغیر کی روایتی صلح پسندی کی زندہ مثال پیش کریں گے لیکن افسوس ہے کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی بلکہ حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بات بات پر تلوار کھنچتی ہے اور تباہی کے سامان پیدا کیے جاتے ہیں۔ آسام کی سرحد پر ہندوستانی فوجوں کی زیادتیاں، ہندوستان جانے والے پاکستانیوں کے لیے ویزا کی دشواریاں، کشمیر میں شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی گرفتاریاں، استصواب رائے کے تسلیم شدہ اصول سے ہندوستانی حکومت کا انکار اور پھر نہری پانی کا قضیہ ایسے معاندانہ اقدام ہیں جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی حکومت پاکستان کو نقصان پہنچانے پر تلی ہوئی ہے اور گیارہ برس گزر جانے کے بعد بھی اس کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان نزاع کی بنیاد قضیہٴ کشمیر ہے۔ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر نہیں ہوسکتے لیکن کیا حکومتِ ہند کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جھوٹے وقار کی فرضی بلندیوں سے نیچے اتر آئے اور ان فروعی مسائل کو حل کرنے میں فراخ دلی اور دور اندیشی کا ثبوت دے جن کا کوئی تعلق کشمیر

سے نہیں ہے۔ مثلاً سلہٹ کی سرحد پر ایک چھوٹے سے دریائی جزیرے کی ملکیت ایسی چیز تو نہیں جس کے لیے ہمسایہ ملک سے تعلقات خراب کر لیے جائیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتے ہیں کہ چند سو مربع گز کا یہ جزیرہ ہندوستان کی ملکیت ہے اور پاکستان اس پر ناجائز طور سے قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر کیا اس جزیرے میں (جو بالکل عارضی ہے اور دریا کے بہاؤ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے) ہیرے اور سونے کی کانیں پوشیدہ ہیں جو ہندوستان اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مشرقی بنگال میں سرحدی دریاؤں کے ذریعے بڑے پیمانے پر اسمگلنگ ہوتی ہے۔ ہندوستان اسمگلنگ کے اس کاروبار کو نہ صرف ہوا دیتا ہے بلکہ جزیروں کی ملکیت کا سوال اٹھا کر دریاؤں کی نگرانی کے کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ یہ فروعی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ تو نہیں۔ دوسرا مسئلہ ویزوں کا ہے۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ہزاروں خاندان بھی تقسیم ہو گئے ہیں چنانچہ پاکستانی مسلمان اگر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ دلی کی سیر کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا مقصد اپنے اعزا و اقربا سے ملنا ہوتا ہے لیکن ہندوستان نے ویزا کی راہ میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں کہ اب پاکستانیوں کا ہندوستان جانا قریب قریب محال ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اس طرزِ عمل سے ہمارے دلوں میں وہاں کی حکومت کے لیے محبت اور موانست کے جذبات نہیں ابھریں گے حالانکہ تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ اہلِ پاکستان کو سفر کی تمام سہولتیں بہم پہنچائی جاتیں تاکہ دونوں ملکوں کے باشندے ایک دوسرے سے زیادہ قریب آتے۔

لیکن اس موسم میں نہری پانی بند کر کے ہندوستان نے عداوت اور دشمنی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جس کی مثال گزشتہ دس سال کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ہندوستان نے نہروں میں پانی کی سپلائی روک کر نہ صرف بین الاقوامی قانون اور ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے جو وقتاً فوقتاً پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہوتے رہے ہیں بلکہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں اب ہندوستان سے کسی قسم کے تعاون اور مفاہمت کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ صورتِ ماجرا انتہائی المناک ہے۔ رہا آزادی کشمیر کا مسئلہ، سو اس کے بارے میں حکومتِ ہند کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں کے جذبات سے بھی واقف ہے اور آٹھ کروڑ پاکستانیوں کے موقف سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ جلد یا بدیر اسے کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اب پنڈت نہرو کو اختیار ہے خواہ وہ اس گتھی کو خوش اسلوبی سے سلجھائیں خواہ بدمزگیوں کو بڑھا کر اُس وقت

سپر ڈالیں جب سپر بے کار ہو چکی ہو۔ یہاں اُن سُورماؤں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو ہندوستان پر حملہ کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ مانا کہ الیکشن کی آمد آمد ہے اور ہمارے اکثر لیڈروں کو عوام کا ووٹ حاصل کرنا ہے لیکن خدمت اور قربانی کے جذبے سے عاری ہونے کے یہ معنی تو نہیں کہ خود غرضی کی دُھن میں پاکستان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا جائے۔ لطف یہ ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا نعرہ وہ لوگ لگا رہے ہیں جو دس سال تک حکومت پر قابض رہ چکے ہیں۔ نہ جانے انہیں اپنے دورِ وزارت میں یہ نعرہ کیوں یاد نہ آیا اور پھر یہ وہ لوگ ہیں جن کو آزادیِ وطن کی جنگ میں کبھی ایک لاٹھی بھی نہ لگی، ایک خراش بھی نہ آئی۔ آج یہ حضرات بڑی ڈھٹائی سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ جنگ چھڑ جائے تو یہ سُورما لڑنے والوں کی آخری صف میں بھی نہیں بلکہ بھاگنے والوں کی پہلی صف میں ہوں گے۔ حملے اور جنگ کی یہ اشتعال انگیز باتیں انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ ان سے پاکستان کے موقف کو نقصان پہنچتا ہے اور ہماری اخلاقی پوزیشن دنیا کے رو برو کمزور ہوتی ہے۔ ہماری حکومت بار بار اعلان کر چکی ہے کہ ہم اپنے تمام نزاعی مسائل (بشمول مسئلہ کشمیر) کو پُر امن طریقہ پر گفت وشنید کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم حکومتِ ہند کی ہٹ دھرمیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے مشتعل ہو کر ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جس سے ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے، ہمارے قومی مفاد کو نقصان پہنچے اور عالمی رائے عامہ ہماری مخالف ہو جائے۔

آخر میں ہم پنڈت جواہر لال نہرو سے درخواست کریں گے کہ وہ حالات کی نزاکت پر سنجیدگی سے غور کریں اور تدبر سے کام لیں۔ پاکستان بہر صورت ان کا ہمسایہ ہے اور جب تک دنیا قائم ہے ہمسایہ رہے گا۔ دونوں ملکوں کے باشندوں میں ہزاروں چیزیں مشترک ہیں اور دونوں کے دلوں میں آج بھی خیر سگالی اور محبت کا بے پناہ جذبہ پوشیدہ ہے۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ پنڈت نہرو پاکستان کی جائز شکایتوں کو دور کرنے کی پُر خلوص کوشش کریں تاکہ نزاعی مسائل خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں اور دونوں ملک آپس میں لڑنے کے بجائے اپنی تمام ذہنی اور مادی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں لگا سکیں۔

۱۵ جون ۱۹۵۸ء

تدبر کا امتحان

قضیہء کشمیر پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جاتا ہے۔ رونے کے لیے مقبوضہ کشمیر کے آلام و مصائب ہی کیا کم تھے جو آزاد کشمیر اور مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں لاٹھی چارج اور گرفتاریوں کی شکل میں ایک نئے المیے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف کشمیر کے محبانِ وطن ہیں جو گیارہ سال سے استصوابِ رائے کا انتظار کرتے کرتے تھک چکے ہیں اور تنگ آ کر خطِ متارکہ جنگ کو عبور کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ دوسری جانب ہماری حکومت ہے جس کے وزیرِاعظم اپنے عجز کا اعلانیہ اعتراف کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں۔ غالباً انہیں ابھی تک سیکورٹی کونسل سے انصاف کی امید باقی ہے اور وہ اس حسنِ ظن میں مبتلا ہیں کہ آزاد کشمیر میں سب خیریت ہے اور وہاں کے لوگ سردار ابراہیم کی نام نہاد حکومت کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ آزادیِ کشمیر کی جو پُرامن اور غیر مسلح تحریک مقبوضہ کشمیر کے آقاؤں کے خلاف شروع کی گئی تھی ہماری حکومت کی بے تدبیریوں کے باعث اس نے اب ایسا رخ اختیار کیا ہے جس سے پاکستان کے موقف اور وقار کو شدید صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

اربابِ اختیار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاکار اور منافق سیاست دانوں کی قلعی کھولیں اور ان کے سیاہ کارناموں کو بے نقاب کریں لیکن خود کشمیری محبانِ وطن نے کیا قصور کیا ہے جو تشدد کی مشینری ان کے خلاف حرکت میں آ گئی ہے۔ یہ لوگ گیارہ سال سے ہمارے وعدوں پر جی رہے ہیں۔ ان کا قصور اگر ہے تو یہ کہ انہوں نے اپنے ضمیر کو دشمنوں کے ہاتھ فروخت کرنے سے انکار

کر دیا اور وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کیا۔ ان کی پاکستان دوستی اور خلوص کا اعتراف تو حکومت کو بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی دل جوئی کرنے اور ان کو اپنا ہم خیال بنانے کے بجائے ان کی دل شکنی کی جاتی ہے۔

خدا بھلا کرے ہمارے موقع پرست اور خودغرض سیاست دانوں کا جو ہمارے مقدس سے مقدس جذبے کو بھی اپنے ذاتی، تجارتی اور جماعتی مفاد کی خاطر استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ نون وزارت کی بے تدبیریاں مسلم لیکن کوئی ان لیڈروں سے پوچھے کہ اپنے عہدِ اقتدار میں تم نے مسئلۂ کشمیر کو حل کرنے کی خاطر کیا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے عبدالقیوم خاں اور میاں ممتاز دولتانہ ہوں یا نظامِ اسلام پارٹی کے چودھری محمد علی، کشمیر کے مسئلے کو ہر صاحبِ اقتدار نے اپنی ذاتی مقبولیت کی خاطر استعمال کیا۔ خلوص سے انھوں نے نہ اپنے عہدِ وزارت میں کشمیریوں کی چارہ گری کی اور نہ آج ان کے دلوں میں کشمیر کے لیے کوئی درد موجود ہے۔ انتخابات قریب ہیں — ظاہر ہے کہ خدمت کا تاج پہن کر عوام کے سامنے جانے کی جرأت ان میں سے کسی میں نہیں — یہی وجہ ہے کہ جنگ اور جہاد کے انقلابی نعرے لگائے جا رہے ہیں اور آزادیٔ کشمیر کا مقدس نام لے کر عوام کے جذبات ابھارے جا رہے ہیں۔ یہ ساری شعبدہ بازیاں الیکشن تک ہیں۔ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد یہ حضرات وہی کریں گے جو اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔

وزیرِ اعظم نون شکر ہے کہ سردار ابراہیم کی مانند آزادی کشمیر کی تحریک کو سیاسی اسٹنٹ نہیں سمجھتے لیکن ان کو اصرار ہے کہ جب تک یہ تحریک روکی نہیں جاتی اور رضا کار حدِ متارکۂ جنگ کو عبور کرنے کے ارادے کو ترک نہیں کرتے ان کے ساتھ کوئی گفت وشنید نہیں کی جا سکتی۔ یہ جھوٹے وقار کی باتیں ہیں۔ اس قسم کی شرطیں فقط دشمن کے روبرو پیش کی جاتی ہیں۔ پاکستان اور اہلِ کشمیر کا رشتہ فیکٹری کے مالک اور مزدوروں کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بھائی بھائی کا رشتہ ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوئے ہیں وہ پاکستان کے دوست اور بہی خواہ ہیں ہندوستان کے ایجنٹ نہیں۔ ان کے ساتھ یہ معاندانہ طرزِ عمل مناسب نہیں۔ ان کو اگر ڈرا دھمکا کر تحریک کو ختم کر دینے پر آمادہ بھی کر لیا گیا تو اس سے پاکستان کے وقار میں کیا اضافہ ہوگا۔ اُلٹے دنیا ہم پر ہنسے گی۔ اور شاید ہنس رہی ہے کہ دشمن کو تو سپر ڈالنے پر مجبور نہ کر سکے البتہ اپنے نہتے بھائیوں پر طاقت آزمائی ہو رہی ہے۔

حکومت کی اس غلط روش سے سب سے زیادہ نقصان خود حکومت کو پہنچ رہا ہے۔ وہ نہ صرف کشمیری محبانِ وطن کی محبت سے محروم ہوتی جا رہی ہے بلکہ ان موقع پرست عناصر کی مقبولیت میں بھی اضافہ کا باعث بن رہی ہے جو تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ حکومت تدبر سے کام لے۔ چوہدری غلام عباس اور دوسرے محبانِ کشمیر کو فوراً رہا کریں اور تمام سیاسی جماعتوں اور کشمیر کے حقیقی نمائندوں کی ایک کانفرنس طلب کرے تاکہ غور و فکر کے بعد قضیۂ کشمیر کا کوئی متفقہ حل دریافت کیا جا سکے، آزاد کشمیر کے نظم و نسق کا جائزہ لیا جائے اور وہاں آئینی اور معاشی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ مقبوضہ کشمیر محکوم اور لاچار سہی مگر آزاد کشمیر کے باشندوں کو ان کے پیدائشی حق سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۸ء

وہ الٹی میٹم یاد کیجیے

اور جب یہودیوں نے پتھروں کی بارش شروع کی تو حضرت مسیح نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور کہا۔ ''خداوندا! تو انہیں معاف کردے کیونکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔'' نادانی اور ناسمجھی میں جرم سرزد ہوجائے تو عفوِ تقصیر کے لیے جواز کی صورت نکلتی ہے لیکن جرم اگر بہ ثباتِ عقل و ہوش سرزد ہو اور اس سے فقط ایک فرد یا گروہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو بلکہ پوری قوم کی زندگی متاثر ہوتی ہو تو آپ ہی بتائیے ایسے جرم کی سزا کیا ہوگی۔

اب سے نو سال پیشتر دولتِ مشترکہ کی ایک کانفرنس میں شرکت سے پہلے نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم نے چڑ کر کہا تھا کہ انگریز ہمیں گھڑے کی مچھلی یا مٹی کا مادھو سمجھتے ہیں۔ قوم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اب ہماری حکومت کوئی آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرے گی اور دوسرے ملکوں سے تعلقات استوار کرتے وقت پاکستان اور دنیائے اسلام کے مفاد کو دوسرے تمام مقتضیات پر ترجیح دی جائے گی۔ مرحوم نے امریکہ کا دورہ کرتے وقت اپنی تقریروں میں بار بار اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ حکومتِ پاکستان کا نصب العین ملک میں اسلامی سوشلزم قائم کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ اسلامی سوشلزم اور آزاد خارجہ پالیسی کے دشمنوں نے قائدِ ملت کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اپنی ان آرزوؤں کو عملی جامہ پہناتے۔ قائدِ ملت کے بعد ان کے جانشینوں نے جو کچھ کیا اس پر تبصرہ بے سود ہے البتہ مارچ ۱۹۵۸ء میں جب ملک فیروز خاں نون نے قومی اسمبلی میں ایک آزاد خارجہ پالیسی کا مژدہ سنایا اور امریکہ اور برطانیہ پر سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی تو یہ

خیال پیدا ہوا تھا کہ ہمارے اربابِ اختیار کو دس سال کے تلخ تجربے کے بعد شاید اب ہوش آ گیا ہے۔ ملک نون نے مغربی حکومتوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر اپریل تک کشمیر کے مسئلے کے حل کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تو پاکستان مغربی ممالک سے اپنے تعلقات اور خارجہ پالیسی پر نظرِ ثانی کرے گا۔''

اس الٹی میٹم کی میعاد مدت ہوئی گزر گئی اور کشمیر کا مسئلہ جہاں مارچ میں تھا وہیں آج بھی ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خارجہ پالیسی اور مغربی ممالک سے تعلقات پر نظرِ ثانی کرنا تو خیر بڑی بات ہے ہم اب مغرب کی جی حضوری میں جنوبی کوریا، فلپائن اور فارموسا پر بھی سبقت لے جا رہے ہیں۔ ہمارے صدرِ مملکت مرکزی کابینہ سے مشورہ کیے بغیر لبنان میں فوجی مداخلت پر حکومتِ امریکہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں حالانکہ ہماری حکومت اس سے پیشتر اعلان کر چکی تھی کہ لبنان کی خانہ جنگی میں ہم بالکل غیر جانب دار ہیں۔ ہمارے امورِ خارجہ کے سیکریٹری جمہوریۂ مصر کے صدر کو ''کمیونسٹوں کا ایجنٹ'' کہنے میں باک محسوس نہیں کرتے حالانکہ خود امریکہ کے کسی ذمہ دار افسر نے آج تک جنرل ناصر کو کمیونسٹوں کا ایجنٹ نہیں کہا اور نہ مصر کے کسی ذمہ دار عہدہ دار نے کبھی ہمارے صدر کو کسی غیر ملکی طاقت کا ایجنٹ کہا۔ عراق میں فوجی بغاوت ہوتی ہے اور شاہِ عراق قتل ہو جاتے ہیں تو ہماری حکومت سوگ منانے بیٹھ جاتی ہے حالانکہ عراق کی خانہ جنگی عراقیوں کا داخلی مسئلہ تھا اور اب تک کسی مغربی طاقت نے بھی یہ نہیں کہا کہ عراق کی بغاوت غیر ملکی طاقتوں کے اشارے پر ہوئی ہے۔ ہم عراق کی نئی جمہوریت کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہے ہیں حالانکہ ایشیا اور افریقہ کے اکثر مسلم ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔

یہ واقعات آپ اپنی تشریح ہیں۔ ہماری حکومت کے اس طرزِ عمل سے اسلامی دنیا میں پاکستان کے وقار کو جو شدید نقصان پہنچ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بغداد پیکٹ میں شریک ہو کر ہم نے عربوں کو اپنا دشمن بنایا اور اتحادِ اسلام کی راہ میں روڑے اٹکائے اس لیے کہ ہمیں اپنے مغربی حلیفوں کی خوشنودی عزیز تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سیٹو میں شریک ہو کر ہم نے انڈونیشیا، برما، چین اور ملایا سے تعلقات خراب کیے اس لیے کہ ہمیں اپنے مغربی حلیفوں کی خوشنودی عزیز تھی۔ اب ایران اور پاکستان کے وفاق کے منصوبے بن رہے ہیں۔ جمہوریت کے کندھوں پر ملوکیت کا بوجھ لادا جانے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آٹھ کروڑ مسلمانوں نے قائدِ اعظم کی رہبری میں پاکستان اسی دن کے لیے بنایا تھا۔ اسی دن کے لیے قربانیاں دی تھیں کہ

ملوکیت کے فرسودہ نظام کو جو اسلامی تعلیمات کی نفی کرتا ہے سہارا دیں اور مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے والے امیروں، نوابوں اور شیخوں کی ہر جگہ پشت پناہی کریں۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

کہا جاتا ہے کہ کشمیر ہماری خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد ہے۔ جو ملک کشمیر کے مسئلے پر ہمارا ساتھ نہیں دیتے ہم ان کے دوست نہیں ہوسکتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کبھی ہماری خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد نہیں بنا اور یہ اچھا ہوا کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے تعلقات اُن ملکوں سے بھی کشیدہ ہوتے جن کی دوستی ہمیں بے حد عزیز ہے۔ کشمیر اگر ہماری خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد ہوتا تو دولتِ مشترکہ کی کانفرنسوں میں کوئی طاقت ہمیں کشمیر کا سوال اٹھانے سے باز نہ رکھ سکتی۔ کم سے کم ہم معاہدۂ بغداد کی کانفرنسوں میں تو کشمیر کا مسئلہ ضرور پیش کرتے مگر کیا گزشتہ تین چار سال میں بغداد کانفرنسوں میں کشمیر کے مسئلے پر ایک بار بھی بحث ہوئی۔ ہم جنرل ناصر سے خفا ہیں کہ اس نے کشمیر کے مسئلے پر ہماری حمایت نہیں کی مگر کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ صدر آئزن ہاور اور وزیرِاعظم میک ملن نے کتنی بار کشمیر کے مسئلے پر ہماری حمایت کی ہے۔ یہی وجہ تو تھی کہ ہمارے وزیرِاعظم نے مغربی ملکوں کو الٹی میٹم دیا تھا مگر افسوس ہے کہ یہ الٹی میٹم بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوا اور مغربی طاقتوں نے اس پر غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اگر کشمیر واقعی ہماری خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد ہوتا تو آج مغربی ممالک سے ہمارے تعلقات کچھ اور ہوتے۔

بہرحال وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی خارجی پالیسی کی افسوسناک ناکامیوں اور ان ناکامیوں کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کریں اور اب تو وہ سیاسی رہنما اور اخبارات بھی ہماری خارجہ پالیسی سے خفا ہیں جن کے عہدِ اقتدار میں یہ مہلک پالیسی وجود میں آئی تھی۔ دس سال کے تلخ تجربوں کے بعد اگر ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوجائے تو اس کا اعتراف معیوب بات نہیں بشرطیکہ ہم آئندہ ان غلطیوں سے بچنے کا عہد کرلیں۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ قومی اسمبلی کا ایک اجلاس فوراً طلب کیا جائے جہاں حکومت اپنی خارجہ پالیسی پر واقعی نظرِ ثانی کرے، بین الاقوامی مسائل بالخصوص اسلامی ملکوں کے بارے میں اپنا موقف بدلے، جو خفیہ مذاکرات وقتاً فوقتاً انقرہ، لندن، تہران اور واشنگٹن میں ہوتے رہتے ہیں ان سے قوم کو آگاہ کرے اور اس الٹی میٹم پر بھی غور کرے جو مارچ ۱۹۵۸ء میں وزیرِاعظم نے قومی اسمبلی ہی کے اجلاس میں مغربی طاقتوں کو دیا تھا۔

۲۷ جولائی ۱۹۵۸ء

خارجہ امور۔۔۔ امریکہ، پاکستان اور عالمِ اسلام

معاہدۂ بغداد

معاہدۂ بغداد کی وزارتی کونسل کا تیسرا اجلاس جو ۳ جون سے کراچی میں ہو رہا تھا ۶ جون کو بخیر وخوبی ختم ہوگیا۔ اس اجلاس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ معاہدۂ بغداد کی معاشی، فوجی اور تخریب کش کمیٹیوں کے خفیہ مذاکرات کراچی میں قریب قریب ایک ماہ سے ہو رہے تھے، ان کمیٹیوں نے وزارتی کونسل کے روبرو جو خفیہ رپورٹیں پیش کیں اور وزارتی کونسل نے خفیہ اجلاس میں ان رپورٹوں پر جو خفیہ فیصلے کیے ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ امریکہ کی شرکت اور عملی تعاون کے باعث معاہدۂ بغداد کی سرگرمیاں اور شدت اختیار کر جائیں گی۔ البتہ اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا کہ آیا یہ سرگرمیاں معاہدۂ بغداد کے مبینہ مقاصد کے لیے مفید ہوں گی یا مضر۔

معاہدۂ بغداد، وزیراعظم ترکی کے الفاظ میں نیٹو کا طفلِ نوزائیدہ ہے۔ اس کی داغ بیل اپریل ۱۹۵۴ء میں پاکستان اور ترکی کے درمیان فوجی معاہدے سے پڑی۔ پھر عراق کو شامل کیا گیا اور آخر کار ۱۹۵۵ء کے موسم بہار میں برطانیہ کی سرپرستی میں پاکستان، ایران، عراق، ترکی اور برطانیہ نے معاہدۂ بغداد پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کا مقصد مشرقِ قریب میں امن کی حفاظت کرنا، اس علاقے کو بیرونی حملوں سے بچانا اور بیرونی حملے کی صورت میں مظلوم ملک کی حمایت کرنا ہے لیکن ابھی اس فوجی معاہدے کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ مشرقِ قریب کے امن

اور آزادی کے ان محافظین میں سے ایک نے مصر پر حملہ کر کے مشرقِ قریب کے امن کو تہ و بالا کر دیا۔ برطانیہ کے اس اچانک حملے سے لوگوں کی بدگمانیوں میں اور اضافہ ہوگیا اور ان کو یقین ہوگیا کہ مشرقِ قریب کی حفاظت سے انگریزوں اور ان کے حلیفوں کی مراد تیل کے چشموں کی حفاظت ہے جن پر امریکہ اور برطانیہ قابض ہیں، فوجی اور ہوائی اڈوں کی حفاظت ہے اور مطلق العنان بادشاہوں کی حفاظت ہے جنہوں نے اپنے مسلمان باشندوں کو تمام جمہوری اور شہری حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

مشرقِ قریب کے عام باشندوں کی یہ بدگمانیاں حقیقت پر مبنی ہیں یا نہیں اس کا تصفیہ تو معاہدۂ بغداد کے رہنماؤں کا آئندہ عمل کرے گا لیکن اس علاقے کے لوگوں کے تلخ تجربات اور حالیہ جذبات کی تھوڑی بہت ترجمانی خود ایک رکنِ معاہدہ کی افتتاحی تقریر میں نظر آتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ عراق کے وزیرِاعظم جنرل نوری سعید گزشتہ تیس پینتیس برس سے نہایت وفاداری سے انگریزوں کی خدمت کر رہے ہیں لیکن انہیں بھی عرب رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر بعض ایسی تلخ حقیقتوں کی جانب اشارہ کرنا پڑا جو برطانوی وزیرِ خارجہ اور امریکی نمائندے دونوں کو ناگوار گزریں۔ جنرل نوری سعید نے کہا کہ ''میری حکومت کا ابتدا ہی سے یہ نقطۂ نظر رہا ہے اور اب بھی ہے کہ مشرقِ قریب کے امن اور استقامت کو سب سے بڑا خطرہ اسرائیل سے ہے''۔ نوری سعید نے اپنی تقریر میں الجزائر، کشمیر اور قبرص کا تذکرہ بھی کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ ان مسائل کو اگر جلد حل نہ کیا گیا تو مشرقِ قریب کے امن کو مزید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ تعصب برطرف معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی نوری سعید کے ان تاثرات سے اتفاق کرے گا کہ مشرقِ قریب کا امن اگر خطرے میں ہے تو اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کے سبب سے، فرانس کی انسان کش سفاکیوں کے سبب سے، قبرص میں انگریزوں کی ہٹ دھرمیوں کے سبب سے اور کشمیر میں ہندوستان کی ناانصافیوں کے سبب سے۔ لطف یہ ہے کہ مشرقِ قریب کا ایک ملک جب ان نمایاں خطرات کی جانب اشارہ کرتا ہے تو برطانوی وزیرِ خارجہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ''علاقائی'' مسائل ہیں اور ان پر غور کرنا معاہدۂ بغداد کی حدود سے باہر ہے۔ اب مسٹر سلوین لائیڈ کو کون سمجھائے کہ جناب یہ معاہدہ تو خود ایک ''علاقائی'' معاہدہ ہے جس کا مقصد ایک مخصوص علاقے میں امن اور آزادی کی حفاظت کرنا ہے۔

برطانیہ اور امریکہ کی مشکل یہ ہے کہ اگر وہ مشرقِ قریب کے بنیادی مسائل پر حقائق کی

روشنی میں غور کریں تو الجزائر میں انہیں فرانس کی مخالفت کرنی ہوگی۔ حالانکہ یہی فرانس نیٹو میں ان کا حلیف ہے، قبرص میں برطانوی تسلط کو خیر باد کہنا ہوگا حالانکہ قبرص مشرقی بحرِ روم میں برطانیہ کا سب سے مضبوط جنگی مرکز ہے، اسرائیل کی دوستی ترک کرنی ہوگی حالانکہ اسرائیل انھیں کا آوردہ اور پروردہ ہے اور انھیں کے چشم و ابرو کے اشارے پر چلتا ہے اور کشمیر کے منصفانہ حل کے سلسلے میں ہندوستان کو ناراض کرنا ہوگا حالانکہ اس کے لیے نہ امریکہ آمادہ ہے نہ برطانیہ۔

معاہدۂ بغداد کا بنیادی تضاد یہی ہے کہ مشرقِ قریب میں آباد قومیں تو یہ چاہتی ہیں کہ ان کی دوستی کا دم بھرنے والی مغربی طاقتیں اُن مسائل کو حل کریں جن سے مشرقِ قریب کے امن کو واقعی خطرہ ہے لیکن برطانیہ اور امریکہ کا مفاد کہتا ہے کہ ان تلخ حقیقتوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کرو اور کمیونزم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ خواہ اس سے دنیا اور اس کا امن کیوں نہ خاک میں مل جائے۔

۹ جون ۱۹۵۷ء

یہ چشم پوشی کیوں؟

اِن دِنوں عالمی سیاست کا مرکزِ ثقل واشنگٹن اور ماسکو سے لندن منتقل ہوگیا ہے جہاں ایک طرف تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس ہو رہی ہے اور دوسری طرف برطانوی دولتِ مشترکہ کے چھ وزرائے اعظم اور تین قائم مقام وزرائے اعظم مسائلِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں لیکن اس کانفرنس میں اُن امور پر غور نہیں کیا جائے گا جو ارکانِ دولتِ مشترکہ کے درمیان اختلاف ونزاع کا باعث بنے ہوئے ہیں!

دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی جو کانفرنس اس ہفتے لندن میں ہو رہی ہے وہ اپنی پیش روچھ کانفرنسوں سے کسی اعتبار سے مختلف نہیں ہے۔ کانفرنس کی پہلے دن کی کارروائی کی جو رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ برطانیہ تخفیفِ اسلحہ کے مسئلے کو دوسرے تمام مسائل پر ترجیح دیتا ہے اور غالباً دوسرے ارکان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ قیامِ امن وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کانفرنس میں اُن علاقوں کے مسائل پر تبصرہ کیا جائے گا جہاں نظریاتی یا سیاسی اختلافات کے باعث فوجی تصادم کا خطرہ موجود ہے مثلاً مشرقِ قریب اور نہرِ سویز کا مسئلہ اور چین اور بحر الکاہل کا مسئلہ۔ خوش قسمتی سے اس کانفرنس میں مسٹر حسین شہید سہروردی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مسٹر سہروردی شرکائے کانفرنس کو اپنے حالیہ دورۂ چین و جاپان کے تاثرات سے آگاہ کریں گے اور مشرقِ بعید کے نزاعی مسائل اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات پر روشنی ڈالیں گے۔

مسٹر سہروردی مشرقِ قریب کے بارے میں اُن اسلامی ملکوں کا نقطۂ نظر بھی پیش کرسکتے ہیں جو معاہدۂ بغداد سے وابستہ ہیں اسی طرح پنڈت نہرو کانفرنس کو مصر اور شام کے موقف سے آگاہ کرسکتے ہیں کیونکہ وہ اور مسٹر ایڈن لندن جانے سے قبل ان دونوں ملکوں کے سربراہوں سے مل چکے ہیں مگر یہ امید رکھنا کہ ان مذاکرات کے بعد برطانوی حکومت مشرقِ قریب کے اندرونی مسائل میں مداخلت سے باز آجائے گی یا ان علاقوں میں حریت پسند اور جمہوری عناصر کو فروغ کا موقع دے گی اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

• ہم ہر اُس اجتماع کا خیرمقدم کرتے ہیں جس میں مختلف ممالک اور مختلف سیاسی عقیدوں کے نمائندوں کو نزاعی مسائل کے بارے میں اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملتا ہو کیونکہ اس قسم کے مذاکرات سے باہمی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کا زاویۂ نگاہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب نزاعی امور سے جان بوجھ کر گریز کیا جائے اور حل طلب مسائل سے راہِ فرار اختیار کی جانے لگے تو پھر ایسے اجتماع کی افادیت بہت گھٹ جاتی ہے۔

لطف یہ ہے کہ آزاد ملکوں کے اس خاندانی اجتماع میں دنیا بھر کے مسائل زیرِ بحث آئیں گے لیکن خاندان کے اندرونی جھگڑوں سے چشم پوشی کی جائے گی۔ اب تک ہم یہی سنتے آئے تھے کہ خاندان کے ارکان کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے اختلافات دور کریں لیکن دولتِ مشترکہ نرالا ''خاندان'' ہے جس کے سربراہوں کی نگاہیں بیرونِ در کے واقعات و حادثات پر جمی رہتی ہیں۔ اندرونِ خانہ خواہ آگ لگے یا خون بہے ان کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ جنوبی افریقہ میں خاندان کا ایک رکن اپنے کالے باشندوں کے لیے زندگی اجیرن کردے خاندان کی کانفرنس میں اس پر غور نہیں ہوسکتا کہ مبادا گورے میاں کے جذبات مجروح ہوجائیں۔ کشمیر اور نہری پانی کی نزاع کے باعث پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات اتنے خراب ہوجائیں کہ عالمی امن خطرے میں پڑ جائے لیکن دولتِ مشترکہ کی کانفرنس میں ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان نزاعی مسائل کا تصفیہ اقوامِ متحدہ کی ذمہ داری ہے۔ برطانیہ اس کے لیے تو تیار ہوجاتا ہے کہ کوریا اور ویت نام کا مسئلہ اقوامِ متحدہ سے باہر جنیوا میں مذاکرات کے ذریعے طے پاجائے لیکن خاندان کے دو ارکان کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کا سوال اٹھے تو اقوامِ متحدہ کی آڑ لی جاتی ہے۔

ہم وزیرِاعظم مسٹر سہروردی سے گزارش کریں گے کہ وہ دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم

کے اجلاس میں اس بات پر زور دیں کہ خاندان کے اس نجی اجتماع میں بین الاقوامی مسائل کے پہلو بہ پہلو اُن نزاعی مسائل پر بھی آزادی سے تبادلہ خیال کیا جائے جن کا تعلق دولتِ مشترکہ کے ارکان کے باہمی تعلقات سے ہے۔ دراصل دولتِ مشترکہ کا مقصد ہی یہ ہونا چاہیے۔ خاندان کے اندرونی اختلافات ان کانفرنسوں کے ذریعے دور کیے جائیں اور بیرونی مسائل اقوامِ متحدہ کے ذریعے حل ہوں۔

۳۰ جون ۱۹۵۷ء

دوستی کی قیمت

پاکستان اور امریکہ کے دوستانہ تعلقات خوش گوار سے خوش گوار تر ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ہم نے خارجی امور اور داخلی مسائل میں امریکہ کی غیر مشروط رہنمائی قبول کر لی ہے اور دن رات اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو امریکہ کی ناراضگی کا باعث بنے۔ ہمارے وزیرِاعظم کے حالیہ دورۂ امریکہ نے اس حقیقت کو اور واضح کر دیا ہے۔ ہائیڈروجن بم کے تجربوں کو روکنے کا مسئلہ ہو یا تخفیفِ اسلحہ کا، مشرقِ قریب میں امن اور آزادی کی بحالی کی بات ہو یا کمیونزم کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی، آج ہمارا موقف سو فیصدی وہی ہے جو امریکی حکومت کا ہے چنانچہ وزیرِاعظم سہروردی نے اسی صورتِ حال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ امریکہ اگر ہمیں امداد دینا بند کر دے تو بھی ہم اس کے حلیف اور ہم نوا رہیں گے۔

جناب سہروردی ہمارے تیسرے وزیرِاعظم ہیں جو صدر آئزن ہاور کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم نے جس وقت امریکہ کا سفر کیا تھا اس وقت تک ہماری خارجہ پالیسی کے نقوش پوری طرح ابھرے نہ تھے اور ہماری حکومت کا رویہ کسی حد تک آزاد اور غیر جانب دارانہ تھا۔ چنانچہ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے امریکہ میں جتنی تقریریں کی تھیں ان میں ''اسلامی سوشلزم'' پر بڑا زور دیا تھا اور اسلامی سوشلزم کو پاکستان کا سنگِ بنیاد تسلیم کرتے ہوئے کمیونزم اور سرمایہ داری دونوں کو پاکستان کے لیے مضر قرار دیا تھا۔ چونکہ نظریۂ پاکستان کا ارتقا بھی کم و بیش اسی اساس پر ہوا تھا اس لیے ابنائے وطن کی اکثریت نے

قائدِ ملت کے ان فرمودات کو خوب خوب سراہا تھا لیکن گزشتہ پانچ چھ برس میں ملک میں اتنی تبدیلیاں آچکی ہیں کہ قائدِ ملت مرحوم کا یہ موقف اب ایک بھولا ہوا خواب بن گیا ہے۔

مسٹر سہروردی بڑے لائق وکیل اور مدبر سیاست دان ہیں چنانچہ وہ اپنی تقریروں اور پریس کانفرنسوں میں کشمیر اور نہری پانی کے مسئلے کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کر رہے ہیں اور امریکی پبلک کے روبرو پاکستانی نقطۂ نظر کی بہت کامیاب وکالت کر رہے ہیں لیکن وزیرِ اعظم سہروردی اور صدر آئزن ہاور کی ملاقاتوں کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ واشنگٹن سے شائع ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر سہروردی امریکی حکومت کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم نے تو امریکی حکومت کے نقطۂ نظر کو تمام و کمال تسلیم کر لیا لیکن افسوس ہے کہ امریکی حکومت نے ہمارے نقطۂ نظر کو بالکل تسلیم نہیں کیا۔ جذبۂ دوستی کے اس اظہار میں ہمارے وزیرِ اعظم کو کسی حد تک اپنا موقف بدلنا پڑا۔ اس کے باوجود وہ پاکستانی مسائل کی حد تک امریکہ کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ مثلاً اب تک یہ کہا جاتا تھا کہ سیٹو اور بغداد پیکٹ میں ہم اس لیے شریک ہوئے ہیں کہ بیرونی حملے کی صورت میں سیٹو اور بغداد پیکٹ کے شرکا ہماری مدد کریں گے خواہ یہ حملہ کمیونسٹ ملکوں کی جانب سے ہو یا غیر کمیونسٹ ملکوں کی جانب سے۔ امریکہ اور پاکستان کے فوجی معاہدے کے بارے میں بھی یہی صفائی دی جاتی تھی لیکن ۱۳ جولائی کے اعلامیہ سے ہماری خوش فہمیاں کافی مجروح ہوئی ہیں اور اب یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ہمیں امریکہ کی فوجی امداد فقط کمیونسٹ حملے کے موقع پر حاصل ہوگی۔ اعلامیے میں کشمیر اور نہری پانی کی نزاع کا تذکرہ جن لفظوں میں کیا گیا ہے وہ بھی غور طلب ہیں۔ مثلاً صدر آئزن ہاور کی رائے میں یہ نزاعی مسائل ''علاقائی'' ہیں۔ حالانکہ معمولی عقل و فہم کا انسان بھی تسلیم کرے گا کہ یہ مسائل ''علاقائی'' نہیں ہیں بلکہ ان کا رشتہ دنیا کے امن سے وابستہ ہے۔ صدر امریکہ نے یہ امید تو ظاہر کر دی کہ یہ ''علاقائی نزاعیں اقوامِ متحدہ کے اصولوں کے مطابق'' حل ہو جائیں گی لیکن بیان کا یہ رسمی انداز ان مسائل کو حل کرنے میں کیونکر مددگار ثابت ہوگا۔

اعلامیہ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ہمارے کسی اہم مسئلے کے بارے میں کوئی ٹھوس بات نہیں کہی گئی ہے۔ کشمیر، نہری پانی، اناج کسی مسئلے پر بھی امریکی موقف واضح نہیں ہوتا۔ اعلامیہ کا یہی ابہام ہے جس نے امریکہ کے دوستوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے چنانچہ کراچی کے ایک انگریزی روزنامہ نے جس کی امریکہ پرستی شک و شبہ سے بالا ہے نہ صرف اس

اعلامیہ کو ''کھوکھلا'' اور انتہائی ''مایوس کن'' کہا ہے بلکہ پاکستان اور امریکہ کے دوستانہ تعلقات کی نوعیت پر بھی اعتراض کیا ہے کہ ''پاکستان اور امریکہ کا اتحاد ایک ایسے غیر مساوی اشتراک کی نمائندگی کرتا ہے جس میں فریقین کی ذمہ داریاں بھی مساوی نہیں ہیں۔ ہم پر تو یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ سیٹو میں رہ کر امریکہ کی جانب سے کمیونزم کا مقابلہ کریں لیکن امریکہ اس کے لیے مجبور نہیں کہ ہمارے ہمسایہ کی طرف سے حملے کے وقت ہمارا ساتھ دے''۔ یہ تو مستقبل بتائے گا کہ یہ شکوک و شبہات حقیقت پر مبنی ہیں یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس اعلامیہ سے امریکی طرزِ عمل کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء

تلخ تجربہ

نواب لیاقت علی خاں مرحوم نے ایک بار فرمایا تھا کہ برطانیہ اور امریکہ ہمیں مٹی کا مادھو اور گھڑے کی مچھلی سمجھتے ہیں۔ ہمارے پہلے وزیرِ اعظم کو یہ شکایت تھی کہ دوستی اور رفاقت کے تمام دعوؤں کے باوصف ہمارے مغربی حلیف ہماری ضرورتوں اور خواہشوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ہم موقع و بے موقع ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں لیکن ہمیں اس جانب داری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو ملک مغربی سیاست کی مخالفت کرتے ہیں عنایت و کرم کی بارش انھیں پر ہوتی ہے۔ یہ بات آٹھ نو سال پیشتر کی ہے۔ اُس وقت نہ معاہدۂ بغداد وجود میں آیا تھا نہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی معاہدہ ہوا تھا اور نہ جنوب مشرقی ایشیا کے دفاع (سیٹو) کی خاطر کوئی ادارہ قائم ہوا تھا لیکن حیرت ہے کہ نو دس سال گزر جانے کے بعد بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ وزیرِ اعظم ملک فیروز خاں نون کو انقرہ کانفرنس میں ایک بار پھر یہی شکایت کرنی پڑی کہ امریکہ اور برطانیہ اپنے سچے رفیقوں اور غیر جانب دار ملکوں میں تمیز نہیں کرتے۔ ملک نون سے پیشتر ترکی کے وزیرِ اعظم نے بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ملک فیروز خاں نون کی صاف گوئی اور تلخ نوائی بجا و درست لیکن انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہر ملک دوسرے ملکوں سے اتحاد و یگانگت کا رشتہ مضبوط کرتے وقت اپنے ملکی مفاد اور سیاسی تقاضوں کو سب پر مقدم رکھتا ہے اس لیے برطانیہ یا کسی دوسرے ملک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمارے لیے اپنے ملکی مفاد کو مجروح کرے گا اوّل درجے کی نادانی ہوگی۔ دس سال کا تجربہ بہت

کافی ہوتا ہے۔ اگر ہم بین الاقوامی سیاست کے اُتار چڑھاؤ سے دس سال میں بھی آگاہ نہ ہوسکیں اور مٹی کا مادھو اور گھڑے کی مچھلی بننے پر اصرار کریں تو قصور کس کا ہے۔

برطانوی وزیراعظم سوویت روس کے ساتھ ترکِ حرب کا معاہدہ کرنے کے خواہش مند ہیں کیونکہ برطانوی رائے عامہ تیسری عالمگیر جنگ کے خیال سے کانپ رہی ہے۔ انگریز جانتا ہے کہ پورے جزیرے کو خاکستر کرنے کے لیے فقط چھ ہائیڈروجن بم درکار ہوں گے۔ مغربی یورپ کی حکومتیں سربراہوں کی کانفرنس کے حق میں اعلان کر رہی ہیں اور خود امریکہ چاہتا ہے کہ مشرق و مغرب کی کشمکش ختم ہو۔ دنیا کی بڑی طاقتیں آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہی ہیں کہ سرد جنگ لاحاصل چیز ہے چنانچہ مشرق و مغرب کے درمیان جلد مصالحت کا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ، برطانیہ یا روس آپس میں سمجھوتہ کرتے وقت گھڑے کی مچھلیوں سے مشورہ نہ کریں گے۔ اس وقت گھڑے کی مچھلیوں کا کیا حشر ہوگا؟ آج ہمارے محترم وزیراعظم غیر جانب داری کو سب سے بڑا خطرہ خیال کرتے ہیں اور جوشِ خطابت میں یہ بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمارے بعض دوست اور ہمسائے افغانستان، انڈونیشیا، سری لنکا اور برما بھی غیر جانب داری کے اصول پر عمل پیرا ہیں لیکن کل اگر غیر جانب داری کی ریت عام ہوئی تو ہماری پوزیشن کتنی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ کبھی اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

وزیراعظم نون نے انقرہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ''جدید ترین اسلحہ جات'' طلب کیے تھے۔ سیاسی مبصرین نے جدید ترین اسلحہ جات سے ایٹمی اسلحہ جات مراد لیے تھے۔ شکر ہے کہ وزارتِ خارجہ نے اپنے توضیحی اعلان میں یہ غلط فہمی دور کر دی اور صاف لفظوں میں بتا دیا کہ پاکستان اپنی سرزمین پر ایٹمی اڈے قائم کرنے کی اجازت نہ دے گا کیونکہ ایٹم بم آئے گا تو ایٹم بم کی نگرانی کے لیے غیر ملکی فوجیں بھی آئیں گی اور پاکستان کو یہ ہرگز منظور نہیں۔

پاکستان ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہے۔ دوسرے ملکوں سے اتحاد کے رشتے قائم کرتے وقت ہمیں ذاتی پسندیدگی یا جذباتی تعلقات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے ملکی اور قومی مفاد کو تمام دوسرے تقاضوں پر فوقیت دینی چاہیے اور ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تدبر اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے دوستوں کی تعداد میں اضافہ کریں اور دشمنوں کی تعداد کو گھٹائیں۔

۹ فروری ۱۹۵۸ء

دنیائے اسلام کی بیداری

دنیائے اسلام ان دِنوں عالمی سیاست کا مرکز ومحور بنی ہوئی ہے۔ اس کا باعث خواہ جغرافیائی محلِ وقوع ہو یا تیل کے چشمے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے دیرینہ دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ان دنوں اسی علاقے میں سمٹ آئی ہیں اور بڑی طاقتوں کی نگاہیں مسلمانوں کی خفیف سے خفیف جنبش کا مطالعہ بڑے غور سے کر رہی ہیں۔ دنیائے اسلام کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج عالمی امن کا انحصار بڑی حد تک عالم اسلام کے مستقبل پر ہے۔

یہ درست ہے کہ مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں نئی چیز نہیں ہیں لیکن اب سے پیشتر مسلمانوں کی حیثیت شطرنج کے مہروں کی سی تھی۔ بساطِ سیاست کے جس شاطر کا داؤ لگتا وہ ان مہروں کو اپنی مرضی سے حرکت میں لاتا مگر یہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اب مسلمان شطرنج کے مہروں کی مانند مجبور و بے بس نہیں بلکہ اپنے آپ میں مقابلے کی طاقت محسوس کر رہا ہے۔ یہ احساس ایک دن میں نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ حاصل ہے برسوں کی سرفروشیوں اور قربانیوں کا۔ آج دنیائے اسلام میں جو ہیجان واضطراب پایا جاتا ہے وہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ روحِ عصر کا تقاضا یہی ہے کہ مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا یہ وسیع وعریض علاقہ دوسروں کی خیمہ برداری کے بجائے صحیح معنی میں آزاد وخودمختار ہو۔ اسلامی دنیا میں آئے دن جو ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں، جو آویزشیں ہوتی رہتی ہیں ان کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ایک طرف وہ عناصر ہیں جن کا مفاد اسی

میں ہے کہ مسلم ملکوں کے اندر سیاسی نظم ونسق کا جو ڈھانچہ بن گیا ہے اس میں کوئی اصلاح وترمیم نہ ہو اور جو معاشی نظام مغربی آقاؤں نے قائم کر دیا ہے وہ بدلا نہ جائے۔ دوسری طرف وہ عناصر ہیں جو روحِ عصر کے مزاج داں ہیں، جو قومی آزادی کی بقا وتحفظ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ عام لوگوں کو معاشی آزادی بھی نصیب ہو اور چونکہ اسلامی دنیا کی غالب اکثریت زراعت پیشہ ہے اس لیے معاشی آزادی کے معنی زرعی اصلاحات کے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے بغیر نہ اُن عناصر کا اقتدار ختم ہوسکتا ہے جنھوں نے اپنا رشتہ اتحاد غیر ملکی طاقتوں سے باندھ رکھا ہے اور نہ عالمِ اسلام کے تعلیمی، صنعتی اور ثقافتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

ایک زمانے میں اسلامی ممالک ترکوں کی جنگ آزادی میں اپنے مستقبل کے نقوش دیکھتے تھے اور کمال اتاترک کی ذات، حریت پسندی اور فتح مندی کی علامت بن گئی تھی۔ مگر کمال اتاترک کی رحلت کے بعد نہ وہ عالمی سیاست کا پرانا نقشہ باقی رہا اور نہ کمال اتاترک کے جانشینوں نے محکوم اور نیم محکوم مسلم ملکوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی لی۔ البتہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد قائدِاعظم کی شخصیت ایسی تھی جو دنیائے اسلام کی قیادت کرسکتی تھی مگر افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ان کے جانشین ایسے کم نظر اور کوتاہ بیں نکلے کہ ان سے اپنے وطن کا بارِ قیادت نہ اُٹھ سکا وہ دنیائے اسلام کی قیادت کیا کرتے۔

قیادت کی گم کردہ راہیوں کے باوجود پاکستان کے مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے مسائل سے ہمیشہ گہری ہمدردی رہی ہے۔ انڈونیشیا میں بغاوت ہو یا لبنان میں خانہ جنگی، نہرِ سوئز پر حملہ ہو یا الجزائر میں قتل و غارت گری، پاکستانی مسلمان ہر کشمکش کو اپنی کشمکش تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک کے گوشے گوشے میں حکومتِ پاکستان کی خارجی پالیسی کی مذمت ہو رہی ہے اور مذمت کرنے والوں میں وہ گروہ بھی شامل ہوگیا ہے جس کی غلط سیاست کی بدولت پاکستان پوری اسلامی دنیا میں رسوا اور بدنام ہے۔

اسلامی دنیا اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے کیونکہ اس خطۂ ارض کی جنگِ آزادی اب آخری مرحلے میں ہے۔ آزادی کے دشمن اور دوست دونوں اس بات کو جانتے ہیں۔ چنانچہ اس جنگ نے ہر جگہ بڑی شدت اختیار کر لی ہے البتہ وہ لوگ جن کو تاریخ کے قانونِ ارتقا کا علم ہے اس جنگ کے نتیجے سے بخوبی آگاہ ہیں اور یہ پیش قیاسی کر سکتے ہیں کہ آج نہیں تو کل یہ سارا علاقہ آزاد ہو کر رہے گا۔ سیاسی طور پر بھی اور معاشی طور پر بھی مسلمانوں کے زوال وپستی کا

دور گزر گیا، آہ و زاری کا دور گزر گیا، نالہ وشیون کا دور گزر گیا۔ اب تو عروج و ترقی، شادمانی و کامرانی کا زمانہ آرہا ہے اور مبارک ہیں وہ ہستیاں جنہوں نے مسلمانوں میں حریت اور قومی خود داری کی روح پھونکی اور نبرد آزمائی اور سرفروشی کا جذبہ بیدار کیا کہ عروج و کامرانی کا خواب اس جذبے کے بغیر ہمیشہ شرمندۂ تعبیر رہتا۔

۶ جولائی ۱۹۵۸ء

اندھیر

لبنان میں امریکہ کی فوجی مداخلت نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے کیونکہ جب سے اقوام متحدہ کا ادارہ قائم ہوا ہے امریکہ نے پہلی بار اقوامِ متحدہ کی اجازت کے بغیر اپنی فوجیں کسی دوسرے ملک میں اتاری ہیں۔ لبنان میں فوجی مداخلت کی تیاریاں یوں تو کئی ہفتے سے جاری تھیں چنانچہ امریکہ کا چھٹا جنگی بیڑہ لبنانی ساحل کے قریب ہی گشت لگا رہا تھا لیکن لبنان کے صدر شمعون کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ امریکی حکومت کے پیہم اصرار کے باوجود فوجی امداد کی درخواست کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوجی مداخلت کا یہ خطرناک اقدام عراق میں فوجی انقلاب سے ڈر کر کیا گیا ہے۔ صدر آئزن ہاور نے لبنان میں فوجی مداخلت کر کے اقوامِ متحدہ کے منشور ہی کی خلاف ورزی نہیں کی ہے بلکہ اقوام متحدہ کے مبصروں اور سیکریٹری جنرل کے اس اعلان کی بھی توہین کی ہے کہ لبنان کی خانہ جنگی لبنانیوں کا داخلی مسئلہ ہے اور کوئی بیرونی طاقت اس میں مداخلت نہیں کر رہی ہے۔ صدر آئزن ہاور نے فوجی مداخلت کر کے بین الاقوامی سیاست میں ایک نئی روایت کی طرح ڈالی ہے۔

صدر آئزن ہاور نے اس فوجی مداخلت کی توجیہہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ امریکی فوجیں لبنان میں مقیم امریکی باشندوں کی حفاظت اور لبنان کی آزادی اور سالمیت کو بالواسطہ جارحیت اور داخلی فساد سے بچانے کی غرض سے لبنان میں اتری ہیں۔ انہوں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جوں ہی اقوامِ متحدہ اس ذمہ داری کو سنبھال لے گی امریکی فوجیں لبنان کو خالی کر دیں گی۔ ہم مانتے ہیں

کہ امریکی باشندوں کی حفاظت امریکی حکومت کے فرائض میں شامل ہے لیکن لبنان میں دو ڈھائی ماہ سے خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ اگر امریکی حکومت یہ محسوس کرتی تھی کہ امریکیوں کا جان و مال خطرے میں ہے تو انہیں لبنان سے چلے جانے کا حکم کیوں نہ دیا گیا۔ اس خانہ جنگی میں اب تک تو کسی امریکی کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا ہے۔ لطف یہ کہ جس دن صدر آئزن ہاور کا اعلان شائع ہوا اسی دن امریکی خاندانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ تم فوراً لبنان خالی کر دو۔ چنانچہ آدھے سے زیادہ امریکی لبنان سے جا چکے ہیں اور بقیہ ۲۵۔۳۰ خاندان روانہ ہونے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ درحقیقت امریکی باشندوں کی حفاظت کا عذر بالکل لغو اور بے بنیاد تھا۔

اب رہا لبنان کی آزادی اور سالمیت کا مسئلہ سو امریکی حکومت کو اصرار ہے کہ لبنان کی خانہ جنگی دراصل کسی بیرونی طاقت کی شرارت ہے لیکن حیرت ہے کہ جس وقت صدر شمعون نے سیکورٹی کونسل سے فریاد کی اور مصر و شام پر مداخلت کا الزام لگایا تو امریکہ نے صدر شمعون کے اس الزام کی تائید نہیں کی بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ سیکورٹی کونسل اپنے غیر جانب دار مبصر اس الزام کی تحقیقات کے لیے لبنان روانہ کرے۔ سیکورٹی کونسل نے جس کی اکثریت امریکہ کی حلیف ہے ایک تحقیقاتی کمیشن لبنان بھیجا۔ مزید احتیاط کے طور پر اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل خود لبنان گئے اور بلآخر انہوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اس خانہ جنگی کے پیچھے کوئی بیرونی طاقت نہیں ہے بلکہ یہ لبنانیوں کا اندرونی جھگڑا ہے۔ سیکریٹری جنرل نے یہ بھی کہا کہ ان کے مبصر سرحد کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ اگر اس رپورٹ کو غلط سمجھتا تھا تو اس نے یہ اعلان کیوں نہ کیا کہ یو، این کے سیکریٹری جنرل اور ان کے مبصرین جھوٹ بول رہے ہیں اور صدر شمعون کا الزام درست ہے۔ اس وقت صدر شمعون اور امریکہ دونوں نے لاجواب ہو کر چپ کیوں سادھ لی۔

امریکہ کہتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ کی رُو سے اسے دوسری حکومتوں کی امداد کا حق حاصل ہے لیکن یہ دفعہ صاف طور پر ''مسلح بیرونی حملے'' سے متعلق ہے یعنی اگر کسی پر بیرونی حملہ ہو تو اس کو امداد مانگنے اور دوسرے ملکوں کو اس کی فوجی مدد کرنے کا حق پہنچتا ہے اس لیے اس دفعہ کی آڑ نہیں لی جا سکتی۔ جب اقوامِ متحدہ کا سیکریٹری جنرل اور سیکورٹی کونسل کے نامزد کردہ مبصر یہ کہتے ہیں کہ لبنان پر بیرونی حملہ نہیں ہوا تو اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ کی آڑ لینا بہت بڑی عیاری اور مکاری ہے۔

امریکہ نے مشرقِ قریب کے اندرونی معاملات میں جس گہری دلچسپی کا عملی ثبوت دیا ہے

اس کا مقابلہ اگر انڈونیشیا اور الجزائر میں امریکی طرزِ عمل سے کیا جائے تو امریکہ کے اغراض و مقاصد بالکل عریاں ہوجاتے ہیں۔ انڈونیشیا میں ساترا کے فوجی افسروں نے جب صدر سوئیکارنو کی حکومت کے خلاف بغاوت کی تو امریکہ اور مغرب نے نہ صرف ان باغیوں کی در پردہ امداد کی بلکہ انڈونیشی حکومت کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ انڈونیشی حکومت کو امریکہ میں اسلحہ خریدنے تک کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب صدر سوئیکارنو نے امریکی حکومت سے اپنی پولیس کے لیے رائفل وغیرہ بطور امداد مانگے تو اس درخواست پر غور تک نہ کیا گیا۔ عذر یہ کیا گیا کہ امریکی حکومت اس خانہ جنگی میں غیر جانبدار ہے لیکن اس غیر جانبداری کا پول اس وقت کھلا جب امریکی ہوا باز اور ان کے طیارے انڈونیشیا پر بمباری کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ امریکہ کی یہی ''غیر جانبدار'' پالیسی الجزائر میں بھی کارفرما ہے۔ ایشیائی ملکوں نے جب کبھی الجزائر کا سوال اُٹھایا تو امریکہ نے فرانس کی حمایت کرتے ہوئے یہی عذر پیش کیا کہ یہ فرانس کا اندرونی معاملہ ہے امریکہ اس میں دخل نہیں دے سکتا۔ امریکہ کے اس متضاد طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسے نہ تو کسی قانونی حکومت کی حفاظت سے دلچسپی ہے اور نہ باغیوں کی بغاوت سے سروکار۔ اگر قانونی حکومت انڈونیشیا کی قانونی حکومت کے مانند امریکہ کی حلیف نہیں ہے تو وہ اس کی حمایت کرنے کے بجائے باغیوں کی حمایت کرے گا اور اگر قانونی حکومت لبنان کی قانونی حکومت کی مانند امریکہ کی حلیف ہے تو وہ باغیوں کی حمایت کرنے کے بجائے حکومت کی حمایت کرے گا۔ نہ بین الاقوامی قانون کے احترام کا سوال ہے اور نہ اقوامِ متحدہ کے منشور کا، اصل مقصد سامراجی مفاد کا تحفظ ہے خواہ یہ مقصد قانونی حکومتوں کی حمایت سے پورا ہو یا باغیوں کی حمایت سے۔

ہم نہ لبنان کی خانہ جنگی پر خوش ہیں اور نہ عراق کی فوجی بغاوت پر شاداں۔ اگر عراق میں مملکت کے سربراہ اور وزرا کو بلا مقدمہ چلائے اور عدالت کا فیصلہ حاصل کیے قتل کر دیا گیا تو ہم اسے ایک مذموم حرکت سمجھتے ہیں لیکن عراق کے اس افسوسناک حادثے پر اظہارِ تاسف کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مقتولین کی گردنوں پر سینکڑوں عراقی محبانِ وطن کا خون ہے۔ انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں ہزاروں بے گناہوں کو برباد کیا ہے اور ان کے مظالم کے سبب عراق کا بچہ بچہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ اس فوجی بغاوت کی اصل وجہ یہی ہے کہ اربابِ اقتدار نے حکومت میں تبدیلی کے تمام آئینی اور جمہوری طریقے مدت سے مسدود کر رکھے تھے اور لوگوں کے لیے اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ اُلٹ دیں۔ بہر حال یہ فوجی بغاوت بھی لبنان کی خانہ جنگی کے مانند عراقیوں کا داخلی معاملہ ہے۔

خانہ جنگی اور فوجی بغاوت کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ امریکہ نے انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت ہی کے ذریعے اپنے ملک کو آزاد کیا تھا، فرانس نے بادشاہ لوئی کا سر قلم کر کے اپنے ملک میں جمہوریت کی داغ بیل ڈالی تھی، برطانیہ میں بھی پارلیمانی جمہوریت کی خاطر بادشاہ چارلس کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا، امریکہ میں بھی کئی سال تک خانہ جنگی کر کے ہی ریاست کی سالمیت کو بچایا گیا تھا۔ پھر اگر برطانیہ فرانس اور امریکہ اپنے ان کارناموں پر آج فخر کر سکتے ہیں، امریکہ ۴ جولائی کو یومِ آزادی منا سکتا ہے اور فرانس ۱۴ جولائی کو یومِ جمہوریہ کا جشن منعقد کر سکتا ہے تو عراقیوں اور لبنانیوں کو اس کی اجازت کیوں نہیں دی جا سکتی کہ وہ بھی جس قسم کی حکومت چاہیں قائم کریں اور بیرونی طاقتیں ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ عراقیوں اور لبنانیوں نے تو ان کی خانہ جنگیوں اور فوجی بغاوتوں میں کبھی مداخلت نہیں کی تھی۔

لبنان کے لوگ امریکی مداخلت کے جواب میں کیا قدم اٹھائیں گے اور فوجی طاقت کے اس عریاں مظاہرے کا ردِّعمل اسلامی دنیا پر کیا ہوگا اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ امریکہ اور دوسری مغربی طاقتیں اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اسلامی ملکوں کی عوامی تحریکوں کو توپوں اور ٹینکوں سے دبا سکیں گی تو یہ ان کی بھول ہے۔ یہ چراغ اب پھونکوں سے نہیں بجھ سکتا۔

یہ اندیشہ بھی بے بنیاد نہیں کہ لبنان میں فوجی مداخلت دراصل ایک تمہید ہے اور وہ دن دور نہیں جب اینگلو امریکی فوجیں اردن، عراق اور شام پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ اگر امریکی افواج نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو عالمی جنگ کے خطرات بہت بڑھ جائیں گے اور دنیا کی تباہی اور بربادی کی ساری ذمہ داری امریکہ کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں پر ہوگی جو انسان کے خون کو تیل سے بھی ارزاں خیال کرتے ہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۸ء

فیڈریشن کا شوشہ

ہمارے اربابِ اقتدار ولایت سے واپسی پر عجیب عجیب شوشے چھوڑتے رہتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ایک شوشہ ملک فیروز خان نون نے ۲۱ اگست کو کراچی میں تقریر کرتے ہوئے چھوڑا۔ موصوف نے عرب نیشنلزم کی حمایت کرنے کے بعد فرمایا کہ۔''ایران ،افغانستان ہمارے بھائی ہیں اور اگر وہ چاہیں تو میں ان کے ساتھ کسی قسم کے فیڈریشن کا خیر مقدم کروں گا۔ اگر وہ سرحدی محصولات اور پاسپورٹ کی پابندیاں منسوخ کرنا چاہیں اور پاکستان کے ساتھ مشترکہ دفاع پر آمادہ ہوں تو پاکستان اس کا بھی خیر مقدم کرے گا۔''

یوں تو ہمارے وزیرِاعظم بلا سوچے سمجھے تقریریں کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں لیکن افغانستان اور ایران سے وفاقی رشتہ قائم کرنے کی یہ تجویز ملک صاحب کے ذہن کی اضطراری تخلیق نہیں معلوم ہوتی۔ عراق کے انقلاب اور معاہدۂ بغداد کی ناکامی و رسوائی کے بعد قیاس یہی کہتا ہے کہ فیڈریشن کی یہ تجویز کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیش کی گئی ہے اور ملک صاحب کے دماغ کی پیداوار نہیں چنانچہ ان کی تقریر سے ایک ماہ پانچ روز پہلے لندن ٹائمز کے نامہ نگار نے تہران سے اطلاع دی تھی کہ'' مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ عراق کے انقلاب کی وجہ سے پاکستان اور ایران کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے میں ضم ہوں گے اور یہ تجویز دونوں ریاستوں میں زیرِ غور ہے'' (ڈان مورخہ ۲۵اگست) یاد رہے کہ پاکستان کے صدر جنرل اسکندر مرزا انھیں دِنوں دوبارہ تہران تشریف لے گئے تھے۔

مقامِ مسرت ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کی جانب سے یہ اعلان ہوا ہے کہ انہوں نے

ایران سے وفاق کی کوئی گفتگو نہیں کی۔ ایران کے وزیرِاعظم منوچہر اقبال نے بھی کہا ہے کہ ایران ''مستقبلِ قریب میں پاکستان اور افغانستان کے ساتھ وفاق میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا'' اور ملک فیروز خاں نون نے لاہور پریس کانفرنس میں اپنی سابقہ تقریر کی تشریح کرتے ہوئے وفاق کا تذکرہ نہیں کیا لیکن مقامِ حیرت ہے کہ صدرِ مملکت یا دفترِ خارجہ نے لندن ٹائمز جیسے اہم اخبار میں شائع ہونے والی ایک اہم خبر کی تردید ضروری نہ سمجھی۔ صدرِ مملکت اور وزیرِاعظم کے اس طرزِ عمل سے اس بدگمانی کو تقویت پہنچتی ہے کہ اخباروں میں وفاق کی تجویز کی شدت سے مخالفت ہوئی تو اربابِ اقتدار اور ان کے مشیرانِ خاص نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیں۔

ملک فیروز خاں نون نے اپنے تشریحی بیان میں مراکش سے انڈونیشیا تک ایک مسلم بلاک کو پاکستان کا نصب العین قرار دیا ہے اور اتحادِ اسلام پر زور دیا ہے اور پاسپورٹ، سرحدی محصولات، مشترکہ دفاع اور ابدی امن کی باتیں کی ہیں۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ معاہدۂ بغداد کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ حملہ کی صورت میں ارکان معاہدہ ایک دوسرے کی فوجی امداد کریں حالانکہ معاہدۂ بغداد کی ثنا و صفت میں اب تک یہی کہا جاتا رہا ہے کہ حملے کی صورت میں ہمیں چار ملکوں کی فوجی حمایت حاصل ہوگی۔

مسلم بلاک کا تصور یقیناً بہت خوش آئند ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اتحاد بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر مسلم ملکوں کے درمیان سے پاسپورٹ اور سرحدی محصولات کی پابندیاں اٹھ جائیں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں اور مشترکہ دفاع بھی بشرطیکہ اس سے دفاع کے مصارف واقعی کم ہوتے ہوں اور اس کا مقصد جارحانہ اقدام نہ ہو مناسب تجویز ہے لیکن ملک فیروز خاں نون کا یہ کہنا کہ فیڈریشن سے میری مراد یہی تھی چنداں اطمینان بخش نہیں۔ ملک نون بڑے تجربہ کار سیاست دان ہیں۔ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ پاسپورٹ اور سرحدی محصولات کی تنسیخ یا مشترکہ دفاع اور مسلم بلاک کے قیام اور فیڈریشن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فیڈریشن میں شرکت کرنے والی ریاستوں کو اپنے اقتدارِ اعلیٰ کی قربانی دینی ہوتی ہے۔ رہا ایران اور افغانستان کے ساتھ فیڈریشن سو اس میں شریک ہونے کے لیے ہمیں اپنے جمہوری نظامِ مملکت اور شہری آزادی کی قربانی بھی دینی پڑے گی۔ اربابِ اقتدار اگر ان قربانیوں کے حق میں ہیں تو ان کو چاہیے کہ اخلاقی جرأت سے کام لیں اور بات کھل کر کہیں تاکہ پاکستان کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

۳۱ اگست ۱۹۵۸ء

معاشرتی بہبود

فلاح و بہبود

یورپ والوں کی نیند ہائیڈروجن بم نے اُچاٹ کر رکھی ہے، امریکہ کو کمیونزم کا خوف کھائے جا رہا ہے، سوویت روس اپنی نوکر شاہی کے ہاتھوں تنگ ہے لیکن ایشیا کے پس ماندہ ملکوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس علاقے کے عام باشندوں کا معیارِ زندگی کیسے اُونچا کیا جائے، ان کی روزمرہ کی ضروریات کیونکر پوری کی جائیں، فراہمیِ روزگار کی کیا صورت ہو اور مکان، مدرسے، ہسپتال اور سڑکیں کیسے تعمیر ہوں۔ آئینِ پاکستان کے رہبر اصول اسی بنیادی مسئلے کو پیشِ نظر رکھ کر ترتیب دیے گئے تھے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آئین کی رُو سے عام پاکستانیوں کی فلاح و بہبود حکومت کے اوّلین فرائض میں داخل ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اربابِ اختیار آہستہ آہستہ اپنے ان فرائض کی جانب توجہ کر رہے ہیں۔

معاشرتی فلاح و بہبود کی تیسری کانفرنس جو گزشتہ ہفتے لاہور میں ہوئی اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے اُن مندوبین نے شرکت کی جو فلاح و بہبود کے کاموں میں براہِ راست حصہ لیتے ہیں۔ ان کو عام لوگوں کے مسائلِ زندگی کا تھوڑا بہت ذاتی علم ہے اور رکاوٹوں اور دشواریوں کا عملی تجربہ ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے وزیروں میں بھی اب یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ زبانی وعدوں اور بلند بانگ دعوؤں سے لوگوں کو زیادہ دن تک بہلایا نہیں جا سکتا لیکن اس کانفرنس میں وزارتی کرسیوں سے جو تقریریں ہوئیں ان سے یہ اندیشہ بدستور باقی رہتا

ہے کہ ہماری حکومت کے ذمہ دار افراد اپنے خلوص اور نیک نیتی کے باوجود شاید اب تک فلاح و بہبود کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے ہیں اور نہ انہیں اُن فرائض کا پورا شعور ہے جو آئین ان پر عائد کرتا ہے۔ مثلاً مغربی پاکستان کے وزیرِاعلیٰ نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ حکومت مختلف شہروں میں کوڑھیوں، اندھوں، اپاہجوں، بیواؤں اور بچوں کے لیے ''ویلفیر ہومز'' کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے اور سوشل ویلفیر کے وزیر نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ گداگری کی لعنت دور کرنے کی غرض سے حکومت عنقریب ایک قانون بنانے والی ہے۔ معذور لوگوں کے لیے اقامت گاہیں تعمیر کرنا بڑا نیک کام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ایسے ادارے ہر شہر میں قائم ہوں۔ گداگری کی لعنت سے نجات دلانے کا عزم بھی اپنی جگہ نہایت مناسب ہے بشرطیکہ یہ لعنت قانون سے دور ہو سکے لیکن کیا پاکستان جیسے پس ماندہ علاقے میں معاشرے کی فلاح و بہبود کے معنی یہی ہیں؟۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تو فلاح و بہبود کے ادارے بے شک اسی قسم کے کام کرتے رہتے ہیں لیکن پس ماندہ ملکوں میں فلاح و بہبود کا تصور قدرے وسیع ہے۔ ہمارے قومی پنج سالہ منصوبے میں بھی — جو بدقسمتی سے منصوبے کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکا — اس فرق کو محسوس کیا گیا تھا۔ چنانچہ زاہد حسین مرحوم نے اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''پس ماندہ علاقوں میں معاشرتی فلاح و بہبود کا بنیادی تصور یہ نہیں ہے (یتیم خانے اور اقامت گاہیں قائم کرنا) بلکہ بڑے پیمانے پر ایسے اقدامات کرنے ہیں کہ فلاکت کی جڑیں ختم ہو جائیں۔''

فلاح و بہبود کی کانفرنس میں عام کارکنوں نے بھی معاشرے کی اصلاح و ترقی کے اسی مثبت پہلو پر زور دیا اور اقوامِ متحدہ کے مشیر مسٹر وکٹر کارلسن نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ ہمیں ''تنگ دستی، خالص غذا، حفظانِ صحت اور تعلیم کے ناقص اور ناکافی مواقع جیسے مسائل کو دوسرے تمام مسائل پر ترجیح دینی چاہیے۔''

اربابِ اختیار نے ان تقریروں اور مشوروں کو کس نظر سے دیکھا اس کا علم ہم کو نہیں لیکن وقت آ گیا ہے کہ معاشرتی فلاح و بہبود کے بارے میں حکومت اپنے نقطۂ نظر میں ضروری تبدیلی پیدا کرے تاکہ قوم کا روپیہ اور کارکنوں کی محنت اور صلاحیت بے کار ضائع نہ ہو۔

وزرائے کرام نے اپنی تقریروں میں اس بات پر بھی بڑا زور دیا کہ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں مخیّر اور صاحبِ ثروت حضرات کو آگے آنا چاہیے۔ اربابِ اختیار نے اس سے پیشتر بھی ان حضرات سے ایسی ہی اپیلیں کی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اہلِ دوَل کے ضمیر پر ان

باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان حالات میں حکومت یہ کہہ کر تو بری الذمہ نہیں ہوسکتی کہ ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں اس لیے ہم معذور ہیں۔ کیونکہ بنیادی ذمہ داری حکومت ہی کی ہے خواہ وہ اس کے لیے خزانوں کے منہ کھولے یا دولت مندوں پر علیحدہ محصول لگائے۔

۱۶ فروری ۱۹۵۸ء

تذبذب اور بے یقینی کی فضا

قومی اسمبلی نے مہاجرین کے معاوضے اور آبادکاری کا قانون منظور کرکے ایک تاریخی فرض ادا کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ نیا قانون بڑی عجلت اور رواروی میں وضع ہوا ہے اور اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں لیکن ان نقائص کے باوجود ہر شخص نئے قانون کا خیرمقدم کرے گا کیونکہ حکومت کے لیت ولعل کے باعث ملک میں بے یقینی، تذبذب اور خوف و ہراس کی جو فضا بن گئی تھی وہ شاید اب ختم ہو جائے۔

گزشتہ دس سال میں کرسیِ اقتدار سے مہاجرین کے حق میں وقتاً فوقتاً جو گہرافشانیاں ہوئی ہیں اگر ان سے تقدیریں بدل سکتیں تو ملک کے پچاس ساٹھ لاکھ خانماں برباد باشندے کب کے آسودہ حال ہو چکے ہوتے مگر افسوس ہے کہ قول وفعل کے تضاد نے دوسرے قومی مسائل کی مانند اس مسئلے کو بھی اور پیچیدہ کر دیا۔ مہاجروں کی غالب اکثریت ۴۸۔۱۹۴۷ء کے درمیان یہاں آ چکی تھی۔ متروکہ جائیدادیں — مکان، کھیت، فیکٹریاں اور دکانیں — بھی یہیں موجود تھیں۔ مہاجروں کی آبادکاری پر اگر اسی وقت سنجیدگی اور ہمدردی سے غور کیا جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دو تین سال کے اندر ہم اس فریضے سے سبک دوش نہ ہو جاتے لیکن بُرا ہو اقتدار کی ہوسنا کیوں اور استحصالِ دولت کی بے شرمیوں کا کہ یہ خالص فلاحی مسئلہ بھی سیاسی مسئلہ بن گیا۔ شاطرینِ سیاست نے مہاجروں کو آباد کرنے کے بجائے ان کو اپنی سودہ بازیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین کی آبادکاری فٹ بال کی طرح ٹھوکریں کھاتی رہی۔ الاٹمنٹیں ہوتیں اور

منسوخ ہوجاتیں، قبضے ملتے اور واپس لے لیے جاتے۔ ہر طرف سفارشیوں، خوشامدوں اور رشوتیوں کی گرم بازاری تھی اور ہر سمت بے یقینی اور تذبذب کا غبار۔ نہ کسی نے متروکہ جائیدادوں کو قومی دولت سمجھا جس کا درد ہوتا اور نہ کسی نے مہاجروں کی آبادکاری کو تعمیرِ وطن سے تعبیر کیا— قومی دولت ضائع ہوتی رہی اور مہاجروں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا—

نئے قانون کے نافذ ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ ہر مہاجر کے گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں نہیں بہنے لگیں گی مگر اسے کم سے کم یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ کل جب سورج طلوع ہوگا تو جس زمین پر وہ کاشت کر رہا ہے، جس مکان یا جھونپڑی میں وہ آباد ہے، جس دکان پر وہ بیٹھتا ہے وہ کس کی ملکیت ہوں گے۔ اسے آئندہ مزارع کی حیثیت سے زندگی گزارنی ہے یا مالک کی حیثیت سے، کرائے کے مکان میں رہنا ہے یا اپنے مکان میں، اپنی دکان کو اور چمکانا ہے یا کوئی دوسرا کاروبار اختیار کرنا ہے۔ اس نئے قانون کے بعد شاید متروکہ جائیداد مزید تباہی سے بچ جائے اور مجموعی طور سے ملکی پیداوار میں اضافے کے امکانات بڑھ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیاست میں ناپائیداری اور ہماری زرعی پیداوار میں کمی کا ایک بنیادی سبب یہ عارضی آبادکاری اور الاٹمنٹیں بھی ہیں۔ مستقبل کے بارے میں اگر یقین نہ ہو تو کوئی شخص یکسوئی اور دلجمعی سے یہ کام نہیں کرسکتا۔ امید وبیم کی زندگی انسان کو عمل و تخلیق کی طاقت سے محروم کر دیتی ہے اور ہماری بہت بڑی آبادی ان دنوں اسی بیم و ہراس کا شکار ہے۔ اگر معاوضے اور آبادکاری کے نئے قانون سے مہاجروں کے مستقبل کی کوئی مستقل صورت پیدا ہوگئی— خواہ وہ کتنی ناقص کیوں نہ ہو— اور متروکہ جائیدادیں لوگوں میں مستقل طور پر تقسیم ہوگئیں تو ہمیں یقین ہے کہ مہاجرین کی ذہنیتوں پر اس کا اثر خوشگوار ہوگا۔ سیاسی لیڈران کو وعدوں کے سبز باغ نہ دکھا سکیں گے اور ہماری ملکی سیاست میں استحکام و پائیداری آئے گی۔

۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء

تعلیم

برہمنی ذہنیت

نوجوان طلبا کی اکثریت کا یومِ حساب گزر چکا۔ ہزاروں لڑکے اپنی ننھی ننھی آرزوؤں اور تمناؤں کا جنازہ اٹھائے ناکامی کا سوگ منانے گھروں کو واپس جا چکے۔ اب ان نوجوانوں کی باری ہے جو میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہو کر بھی ناکام رہے ہیں، جو کالج میں داخل ہونا چاہیں گے لیکن کالج جن کو قبول کرنے سے انکار کرے گا، جو داخلے کے لیے ہر کہ ومہ کی خوشامد کریں گے، ہر صاحبِ ثروت اور ذی اثر شخص کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے پھر بھی کلیدِ کامرانی ان کے ہاتھ نہ آئے گی۔ ہزاروں ذہین اور محنتی بچے کالج کے در و دیوار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھیں گے مگر اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہونے کے باوجود وہ اعلیٰ درس گاہوں کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکیں گے کیونکہ ان کے والدین میں مہنگی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ وہ پچاس ساٹھ روپیہ کی کلرکی اور چپراس گیری کے لیے مارے مارے پھریں گے لیکن ہر دفتر، ہر دکان سے انہیں مایوس لوٹنا پڑے گا۔ کتنی حوصلہ شکن ہے اس دور کے نوجوانوں کی زندگی!

لیکن اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور تشویش ناک ہمارے خداوندانِ تعلیم کی ذہنیتیں ہیں۔ ان کے قوم دشمن منصوبے میں تعلیم کو سستا اور عام کرنے کے بجائے وہ ویدک دور کے برہمنوں کی مانند تعلیم کو ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بنا رہے ہیں۔ ''کنٹرولڈ'' تعلیم کے نام پر وہ برگزیدہ بندوں کا ایک نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک

آپ کو ملک میں ایسی کئی درس گاہیں ملیں گی جن میں فقط وزیروں، اونچے سرکاری افسروں اور دولت مند حضرات کے بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔ ان درس گاہوں کا معیارِ تعلیم بہت بلند ہوتا ہے اور طلبا کو ہر قسم کی تعلیمی اور مجلسی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ عام امتحان ہوں یا مقابلے کے امتحان یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوان دوسرے لڑکوں پر سبقت لے جاتے ہیں لیکن ان درس گاہوں کے مصارف اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ درمیانہ طبقے کا کھاتا پیتا پاکستانی بھی اپنے بچوں کو وہاں تعلیم نہیں دلوا سکتا چہ جائیکہ عام پاکستانی — ان درس گاہوں کی فضا عام سکولوں اور کالجوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہاں طلبا کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ تمہیں آگے چل کر پاکستان کے لوگوں پر حکومت کرنا ہے اور وہ ایک خاص قسم کی رعونت اور احساسِ برتری لے کر نکلتے ہیں ان عمارتوں سے — اسی کا نتیجہ ہے کہ آہستہ آہستہ ہمارے ملک میں ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ ابھر رہا ہے جو اپنی افسرانہ ذہنیت میں انگریزوں سے بھی چار قدم آگے ہے۔ اس کی بود و باش اور فکر و نظر خالص غیر ملکی ہے اور وہ عام پاکستانیوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھ کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ یہ خطرناک رجحان ان نوجوانوں کے لیے جتنا مضر ہے اتنا ہی ملک و ملت کے لیے نقصان دہ ہے۔

اس تعلیمی برہمنیت کا یہ نتیجہ بھی نکلا ہے کہ ہمارے وزیروں، اعلیٰ افسروں اور آسودہ حال شہریوں کو عام طلبا کے روزمرّہ کے مسائل کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں۔ ان کے بچے گھوڑا گلی، حسن ابدال، چیفس کالج لاہور میں تعلیم پاتے ہیں جہاں نہ درسی کتابوں اور کاپیوں کی قلت ہوتی، نہ والدین کی تنگ دستی کے پیشِ نظر فیس معاف کرانے کا سوال اٹھتا، نہ استادوں کی کمی اور تعلیمی سامانوں کی عدم موجودگی کی شکایت پیدا ہوتی اور نہ داخلے کی دشواریاں ہوتیں۔

برطانیہ کی تقلید میں پاکستان میں ہیرو، ایٹن اور آکسفورڈ اور کیمبرج قسم کی ایسی درس گاہوں کو فروغ دینا جن میں خواجگی اور افسری کے آداب سکھائے جاتے ہوں نہایت مذموم اور قابلِ اعتراض بات ہے۔ جب تک یہ ذہنیت نہیں بدلتی ملک میں ''کنٹرولڈ'' تعلیم کے نت نئے تجربے ہوتے رہیں گے۔ پاکستان کے نوجوان تعلیم کی سہولتوں کے لیے ترستے رہیں گے اور ملک معرفت کی اُس روشنی سے اور کردار و عمل کے اُس حسن سے محروم رہے گا جو سچی اور مفید تعلیم ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

۲ جون ۱۹۵۷ء

یہ تعلیم

ذرا اسے ہفتے کی چند خبریں ملاحظہ فرمایئے:

—انجینئرنگ کالج لاہور کے طلبا پرنسپل سے ملنے ان کی کوٹھی پر گئے تو اتفاق سے برآمدے میں رکھا ہوا ایک گملا کسی کی ٹھوکر سے ٹوٹ گیا۔ پرنسپل صاحب اتنے خفا ہوئے کہ انہوں نے پولیس بلوائی اور گملا توڑنے والے کا سراغ لگانے کے لیے پولیس تمام دن طلبا سے پوچھ گچھ کرتی رہی۔

— پولیس نے لاہور کارپوریشن کے سولہ اساتذہ کو اس جرم میں گرفتار کیا ہے کہ انہوں نے خشک دودھ کے آٹھ ہزار ڈبے جو پرائمری سکولوں کے طلبا میں مفت تقسیم کرنے کے لیے آئے تھے بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیے۔

— گورڈن کالج راولپنڈی کے ہڑتالی طلبا سے انتظامیہ نے دو دو سو روپے فی کس ضمانت طلب کی ہے۔ ایک لڑکے کے پاس نقد روپے نہ تھے چنانچہ اس نے اپنی ماں کا طلائی نیکلس بطور ضمانت داخل کیا ہے۔

— کراچی میں ایک استانی نے آٹھ سال کی ایک بچی کو پانچ منٹ دیر سے سکول آنے پر تمام دن دھوپ میں کھڑا رکھا۔

—بورڈ ٹیچرز یونین کے ۳۶ ہزار اساتذہ نے دھمکی دی ہے کہ اگر ان کے مطالبات منظور نہ کیے گئے تو وہ مستعفی ہو جائیں گے اور ایک وزیرِ باتدبیر نے فرمایا ہے کہ۔ ”مستعفی ہوتے ہیں تو

ہو جائیں''۔

کیا یہ خبریں ہمارے تبصرے کی محتاج ہیں؟ کیا ان کو پڑھ کر قوم کی تعلیمی پستی اور اخلاقی زوال کی واضح شکل ہمارے سامنے نہیں آ جاتی اور اگر پاکستان کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے قریے کی درس گاہوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو کیا حالات مختلف ہوں گے۔

طلبا کو اُس وقت تک داخلہ نہیں ملتا جب تک کہ وہ کسی بااثر استاد کو پرائیوٹ ٹیوشن کی رشوت نہ دیں۔ اگر وہ استاد صاحبان کے نوٹس نہ خریدیں تو انہیں امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی یا فیل کر دیا جاتا ہے۔ پھر ''گیس پیپرز'' کی وبا ہے جو پھیلتی ہی جاتی ہے۔ یہ گیس پیپرز ہمارے استاد صاحبان ہی تیار کرتے ہیں اور اب تو امتحان کے پرچے آؤٹ کرنے کا بھی کاروبار چمک چلا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ طلبا اور دفتری کلرکوں کے علاوہ اساتذہ کے دامن بھی اس گندگی سے داغدار نہیں ہیں۔

طلبا اور اساتذہ کے تعلقات کی ناخوشگواری، نصاب کی کتابوں کے معیار کی پستی، درس گاہوں کے اندر تعلیم کے سامان کی کمی، عمارتوں کی قلت اور خستہ حالی، اساتذہ کی فرض ناشناسی، مدرسوں اور کالجوں کی ناکافی تعداد، تعلیم کے مصارف میں ناقابلِ برداشت اضافہ، تعلیم کے منتظمین کی حاکمانہ ذہنیت اور ان سب سے بڑھ کر تعلیم کے شعبے میں کسی قومی مقصد اور منصوبے کا المناک فقدان ایسی حقیقتیں ہیں جن پر بارہا تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہمارے وزرائے کرام اور ماہرینِ تعلیم یہ تو مانتے ہیں کہ ہمارا نظامِ تعلیم حد درجہ ناقص ہے لیکن دس برس گزر گئے مگر اب تک تعلیم کے بنیادی نقائص کو دور کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نہ کوئی تحقیقاتی کمیشن بیٹھا جو حالات کا مفصل جائزہ لیتا اور نہ ملک کے اسّی نوے فیصدی ان پڑھ لوگوں کو حروف تہجی سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی ملک گیر مہم چلائی گئی اور اب تو قرائن بتا رہے ہیں کہ اربابِ اقتدار کے ذہن سے تعلیم کی ضرورت اور افادیت ہی محو ہوتی جا رہی ہے۔ وہ تعلیم کو عام اور ارزاں کرنے کے بجائے فقط ایک مخصوص طبقے کی نئی پود کی ہمت افزائی کر رہے ہیں اور اس نئی پود کے اندر وہ ذہنیت پیدا کرنے کے درپے ہیں جو برطانیہ میں ہیرو اور ایٹن کے طلبا میں پائی جاتی ہے۔ یعنی عام لوگوں سے نفرت اور ان پر حکومت کرنے کی ذہنیت۔

استاد صاحبان کو طلبا سے یہ شکوہ ہے کہ وہ ان کی عزت نہیں کرتے اور لکھنے پڑھنے میں جی نہیں لگاتے۔ اُنھیں حکومت اور منتظمین سے یہ گلہ ہے کہ ان کی شکایتوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کی

کوشش نہیں کی جاتی۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض افراد کو جو قلیل تنخواہوں پر گزر نہیں کرسکتے وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اساتذہ کی شکایتوں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اور ہم نے ہمیشہ ان کے جائز مطالبات کی حمایت کی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ تقسیم سے پیشتر بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مالی دشواریوں کے باوجود کیا وہ سکول میں تقسیم ہونے والے دودھ کو بلیک مارکیٹ میں فروخت کرنے کی سوچ سکتے تھے۔ دس پندرہ برس پیشتر کا استاد اپنی تمام سخت گیریوں کے باوجود اپنے شاگردوں سے محبت کرتا تھا۔ ان پر ریاض کرتا تھا اور ان کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔ آج یہ محبت مفقود ہے۔ آج تو ایک گملا توڑنے پر استاد اپنے شاگردوں کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے— شاگرد ایسے "روحانی باپ" سے نہ تو محبت کرسکتے ہیں اور نہ اس کی رہنمائی قبول کرسکتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اساتذہ کی اکثریت ان گئے گزرے حالات میں بھی اپنے قومی فرائض سے بے خبر نہیں ہے اور نہ وہ طلبا کی بدخواہ ہے۔ اس لیے ان سے ہماری پُرخلوص درخواست یہ ہے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کی کوشش ضرور کریں لیکن یہ نہ بھولیں کہ قوم کا مستقبل ان کی نگرانی میں پرورش پا رہا ہے اور یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل قومی خدمت کا جذبہ لے کر میدانِ عمل میں داخل ہو تو انہیں اپنے نکتہ نظر اور طریقِ کار میں بڑی تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اپنے شاگردوں کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا، ان کی خدمت کرنی ہوگی۔ اس سے فقط درس گاہوں کی فضا خوش گوار نہ ہوگی بلکہ اربابِ اختیار کی غفلت اور بے توجہی کے خلاف لڑنے میں طلبا کا عملی تعاون بھی مل سکے گا۔

۸ جون ۱۹۵۸ء

بورڈ اساتذہ سے ناانصافی

بعض حلقوں کا خیال ہے کہ جس طرح ادیبوں کا ایک گروہ ادب برائے ادب کا مدعی ہے اسی طرح محنت کشوں کا ایک گروہ بھی ہڑتال برائے ہڑتال کا قائل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پیٹ بھرے مزدور جب کام کرنا نہیں چاہتے تو یوں ہی، تفریحاً ہڑتال کر دیتے ہیں۔ الٹے سیدھے مطالبات پیش کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، ہنگامے اٹھاتے ہیں اور خواہ مخواہ اپنا وقت اور دوسروں کا امن وسکون غارت کرتے ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ محنت کشوں کا یہ تفریحی مشغلہ متعدی مرض کی مانند اب پڑھے لکھوں میں بھی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ موٹی عقل اور کھردرے ہاتھوں والے مزدور تو الگ رہے، ہڑتال کے اس کھیل میں اب کالجوں کے پروفیسر اور سکولوں کے اساتذہ بھی شرکت پر مجبور ہو رہے ہیں حالانکہ ان کی نہ عقل موٹی ہے اور نہ ہاتھ کھردرے ہیں بلکہ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کا کام ہی نئی نسل کو لہو ولعب کی لعنتوں سے بچانا اور عقل و علم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے۔

ہڑتال کا یہ زہر یوں تو پورے ملک کے ٹیچروں میں پھیل چکا ہے (مشرقی پاکستان کے ٹیچروں نے بھی نوٹس دے رکھا ہے) لیکن پنجاب ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیچر سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ ان دنوں بورڈ کے ۲۶ ہزار ٹیچروں کی ہڑتال ہو رہی ہے۔ ان کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکولوں کو صوبائی حکومت اپنی تحویل میں لے تاکہ بورڈ ٹیچروں کو بھی وہ حقوق ومراعات حاصل ہوں جن سے گورنمنٹ سکول کے اساتذہ مستفید ہوتے ہیں۔ انہیں

تنخواہوں کے بروقت نہ ملنے کی بھی شکایت ہے اور یہ بھی کہ بورڈ کے ممبروں کی ذاتی اور سیاسی دھڑے بندیوں کا نزلہ ان پر گرتا ہے۔ ان کے لیے نہ ترقی کا کوئی گریڈ ہے نہ ملازمت کی سیکورٹی اور نہ تبادلوں اور تنخواہوں کا کوئی اصول۔

بورڈ ٹیچروں کی یہ شکایتیں نئی نہیں ہیں۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے یہ شکایتیں افسروں اور وزیروں کے گوش گزار کرتے رہے ہیں اس لیے ان پر بے صبری اور جلد بازی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ جہاں تک ان شکایتوں کا تعلق ہے مسٹر حسن محمود کے علاوہ شاید ہی کوئی ذی فہم بہ ثباتی عقل و ہوش ان کی معقولیت سے انکار کر سکے۔ ہمارے ڈسٹرکٹ بورڈوں سے مسٹر حسن محمود سے زیادہ کون واقف ہوگا جو اب تک ۱۹ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ۵۶ میونسپل کمیٹیوں کو داخل دفتر کر چکے ہیں اور جن کے خلاف اس وقت کم و بیش پچاس رٹ درخواستیں ہائی کورٹ میں دائر ہیں۔ اس کے باوجود مسٹر حسن محمود بورڈ کے سکولوں کو بورڈ کی نگرانی میں رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وزارت کا قلمدان ان کے پاس نہیں ہے اور انہیں اندیشہ ہے کہ اگر بورڈ سکول صوبائی حکومت کی تحویل میں آ گئے تو مسٹر حسن محمود کے اثر و اقتدار میں کمی آ جائے گی اور وہ الیکشن میں ان سے کام نہ لے سکیں گے۔ ورنہ یہی مسٹر حسن محمود جن دنوں ریاست بہاولپور کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے وہاں کے تمام بورڈ سکولوں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ سندھ اور سرحد کے بورڈ سکول بھی صوبائی حکومت کی تحویل میں آ چکے ہیں۔ اب ۔لے دے کر پنجاب کے بورڈ سکول ہیں جو حکومت کی چشمِ التفات سے ہنوز محروم ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز بہاولپور، سندھ اور سرحد کے بورڈ ٹیچروں کے حق میں مناسب ہے وہ پنجاب کے ٹیچروں کے حق میں نامناسب کیوں ہے۔ مسٹر حسن محمود ''مالی مضمرات'' کی آڑ لیتے ہیں لیکن ایک یونٹ کے دوسرے علاقوں میں بورڈ سکولوں کو صوبائی حکومت کی تحویل میں لیتے وقت ان ''مالی مضمرات'' پر غور کیوں نہ کیا گیا اور یہ کیا ایک یونٹ ہے جس کے کچھ بورڈ سکول تو صوبائی حکومت کی تحویل میں ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔ وحدت میں یہ کثرت، یہ تضاد، یہ دو عملی کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے وزیرِ باتدبیر میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرح بورڈ سکولوں کو بھی آنے والے الیکشنوں میں استعمال کرنے کے درپے ہیں لیکن بیگار کا زمانہ کب کا ختم ہوگیا۔ بورڈ ٹیچروں سے کام لینا تو درکنار اگر یہی حالات رہے تو وہ الیکشن میں ۳۶ ہزار بورڈ

ٹیچروں کو اپنا سب سے خطرناک حریف پائیں گے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ بورڈ ٹیچروں کو برطرفی کی دھمکی دے کر دبایا جاسکتا ہے تو یہ بھی ان کی بھول ہے۔ انہوں نے بہ کمالِ شفقت و دردمندی یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کا نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا لہٰذا وہ نئے ٹیچروں کی بھرتی کا حکم دے چکے ہیں۔ اربابِ اختیار کو قوم کے بچوں کی تعلیم اگر عزیز ہوتی تو آج ہمارے سکولوں کی حالت یہ نہ ہوتی اور نہ ہمارے ٹیچروں کو ہڑتال کرنے کی ضرورت پیش آتی البتہ جہاں تک نئی بھرتی کو بطور حربہ استعمال کرنے کا تعلق ہے ہم بہ کمالِ ادب عرض کریں گے کہ مل مالکوں کا یہ زنگ آلود ہتھیار اب مزدوروں کی ہڑتالوں میں بھی کارگر نہیں ہوتا اور مل مالکوں کو بھی بہ ایں بے روزگاری بالآخر ہڑتالی مزدوروں ہی سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اس لیے ہمیں اندیشہ ہے کہ ان کی یہ دھمکی رائیگاں جائے گی۔ بورڈ ٹیچروں کے مطالبات آج نہیں تو کل منظور ہوکر رہیں گے۔ بورڈ سکولوں کو آج نہ سہی کل حکومت کی تحویل میں آنا ہے کیونکہ یہ دوعملی زیادہ دن تک نہیں چل سکتی۔ البتہ مسٹر حسن محمود کو پبلک میں سرخرو ہونے کا ایک سنہرا موقع ملا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء

ہماری تہذیبی سرگرمیاں

سردیوں کا موسم آتا ہے تو ملک میں تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور قوم کی تخلیقی صلاحیتیں دفعتاً بیدار ہوجاتی ہیں۔ تہذیبی سرگرمیوں سے ہماری مراد فقط رقص و سرود کی محفلیں اور فلموں اور تصویروں کی نمائشیں نہیں بلکہ تہذیب عبارت ہے کسی قوم کی ہر نوع کی تخلیقات کے نچوڑ سے۔ ان تخلیقات میں کمہار کے چاک پر بنے ہوئے مٹی کے برتن بھی شامل ہیں اور کھڈیوں اور کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑے بھی، دانش وروں کے افکار بھی اسی طرح ہمارا تہذیبی اثاثہ ہیں۔ جس طرح شاعروں کا کلام یا افسانہ نویسوں کے افسانے، ذوق اور فہم کے اس تنوّع سے تہذیب کے پھول کھلتے ہیں اور لوگ اپنی بساط کے مطابق ان سے لطف حاصل کرتے ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ تہذیب کا تذکرہ چھیڑتے ہی ذہن فنونِ لطیفہ کی جانب منتقل ہوجاتا ہے۔ گویا جمالیاتی ذوق کا بھی ایک پیمانہ ہے۔

اب کے ان سرگرمیوں کا آغاز ایک دس روزہ تہذیبی تہوار سے ہوا۔ یہ تہوار پاکستان آرٹ کونسل کے زیرِ اہتمام نومبر کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں منایا گیا تھا۔ اس تہوار میں پاکستانی آرٹسٹوں کے علاوہ امریکہ، چین اور جرمنی کے آرٹسٹوں نے بھی شرکت کی اور اس طرح موسیقی اور رقص کے شیدائیوں کو غیر ملکی فن کاروں کے کمالات سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ پاکستان آرٹ کونسل کی یہ ابتدائی کوشش لائقِ ستائش ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کی سرگرمیوں میں برابر

اضافہ ہی ہوتا رہے گا لیکن ان سرگرمیوں سے قطع نظر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار نے گزشتہ دس سال میں شاید ہی کبھی ملک کے تہذیبی مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا ہو۔ ہماری تہذیبی روایات کیا ہیں، ان کی پہچان کیا ہیں، ہمیں اپنے تہذیبی ورثے میں سے کن کن چیزوں کو مسترد کرنا ہے، کن کن کو فروغ دینا ہے، قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کا کیا رشتہ ہے اور اس رشتے کو کس طرح اور مضبوط کیا جائے۔ یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات ہیں جو تہذیبی مسائل سے وابستہ ہیں لیکن اربابِ اختیار کو ان دس سال میں ان گتھیوں کو سُلجھانے کا وقت ہی نہیں ملا یا شاید انہیں تہذیبی مسائل کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ سبب خواہ کچھ ہی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ نہ مرکزی حکومت نے اور نہ کسی صوبائی حکومت نے اب تک کوئی واضح منصوبہ تہذیبی اور ثقافتی فروغ کے لیے تیار کیا ہے۔ البتہ اس قسم کی کوئی نیم سرکاری یا غیر سرکاری تقریب ہو تو کوئی نہ کوئی وزیر اس کا افتتاح کر دیتا ہے اور چند رسمی فقرے تہذیبی سرگرمیوں کی شان میں دہرا دیے جاتے ہیں۔ وزراء حکومت سمجھتے ہیں انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور اب تہذیب کے فروغ میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ ان کی بھول ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستان آرٹ کونسل یا اس نوع کے دوسرے اداروں میں بعض سرکاری افسر بڑی دلچسپی لیتے ہیں لیکن ان کی اس دلچسپی کو حکومت سے تو منسوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ عام طور سے تو یہ دیکھا گیا ہے کہ اِدھر ان افسر صاحب کا تبادلہ ہوا اُدھر ان کی تہذیبی دلچسپیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ ادارہ بھی باقی نہ رہا جس کی وہ سرپرستی کرتے تھے۔ تہذیب کے فروغ کا کام چند افسروں کے بس کی بات نہیں۔ وہ کتنے ہی لائق، مستعد اور فرض شناس کیوں نہ ہوں اپنا پورا وقت تو ان کاموں پر بہرحال صرف نہیں کر سکتے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دو چار بڑے شہروں میں قومی تہوار منا کر ہم اپنے فرائض سے سبک دوش ہو گئے وہ نہ تہذیب کی اصل روح سے واقف ہیں اور نہ تہذیبی سرگرمیوں کی غرض و غایت سے آگاہ۔ جو تہذیب اپنے آپ کو فقط ایک مخصوص گروہ سے وابستہ کر لیتی ہے یا جس کا رشتہ زندگی کے دھاروں سے استوار نہیں ہوتا وہ کبھی پنپ نہیں سکتی۔ ہمارے ملک کی غالب اکثریت گاؤں، قصبوں اور چھوٹے شہروں میں رہتی ہے مگر یہ اکثریت ابھی تک تعلیم، سینما اور ریڈیو کی برکتوں سے بھی محروم ہے چہ جائے کہ قومی تہوار کی لطف اندوزیاں۔ پھر بڑے شہروں میں بھی ان تہذیبی سرگرمیوں سے مستفید ہونے کی استطاعت ایک فیصدی سے کم لوگوں میں ہوتی

ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کراچی، لاہور یا ڈھاکہ میں قومی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے جو کوششیں جاری ہیں ان کا خیر مقدم نہ کیا جائے۔ موجودہ حالات میں ہم اسے بھی بسا غنیمت سمجھتے ہیں کہ بعض ادارے اور افراد حکومت کی بے توجہی کے باوجود اپنی دھن میں لگے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ادب، فن اور تہذیب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ یہ لگن قائم رہی اور اس شوق میں کمی نہ ہوئی تو ایک نہ ایک دن حکومت کو بھی اپنے فرض کی طرف توجہ دینی ہوگی۔

یکم دسمبر ۱۹۵۷ء

تحقیقات کی جائے

انجمن ترقی اردو کا عروج و زوال ایک آئینہ ہے جس میں ہماری قوم کے فکر و عمل اور مزاج و کرادر کی بلندیوں اور پستیوں کے خدوخال صاف نظر آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا — اور اس زمانے کی یاد ابھی ہمارے ذہنوں سے مٹی نہیں ہے — کہ اردو زبان و ادب کے شیدائی انجمن ترقی اُردو سے دور کا تعلق بھی اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ملک کی ممتاز شخصیتیں اور جماعتیں انجمن کے روحِ رواں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ اُس زمانے میں انجمن فقط ایک ثقافتی ادارہ نہ تھی بلکہ ایک قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور مولوی عبدالحق کی ذات اس تحریک کی علامت تھی۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ نظریۂ پاکستان کی رگوں میں زندگی اور حرارت اردو ہی کی بدولت آئی اور اس نظریے کی شیرازہ بندی اردو ہی کے ہاتھوں ہوئی۔

خیال تھا کہ پاکستان بننے کے بعد اردو زبان کو چار چاند لگیں گے تو انجمن ترقی اردو کا ستارہ بھی چمکے گا مگر ہماری یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اربابِ اختیار نے مطلب نکل جانے کے بعد اردو کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ ترقی اردو کے دعوے اور وعدے بھلا دیے گئے، انجمن کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اُس شخص کو بھی انجمن سے الگ کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں جس نے ۴۵ سال کی ان تھک کوشش سے انجمن ترقی اردو کو ایک زندہ تنظیم اور اس زندہ تنظیم کو ایک قومی تحریک کا وقار بخشا تھا۔ جس قلندر صفت انسان نے اپنی

زندگی کا ہر لمحہ، اپنی علمی تحقیق وتخلیق کا ہر ورق، اپنی کمائی اور پونجی کا ایک ایک پیسہ اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہو، جس نے پاکستان میں اپنی ذات کے لیے نہ کوئی مکان یا دکان الاٹ کروائی اور نہ کسی فیکٹری یا زمین پر قبضہ کیا آج اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے ہیں۔

پاکستان کے آئین میں اردو کو قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے البتہ اس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہ عبوری دور میں انگریزی ہم پر بدستور مسلط رہے گی مگر حکومت نے اب تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے اس کے خلوص اور نیک نیتی کی تصدیق ہوتی اور یہ امید بندھتی کہ وہ اردو اور بنگالی کو واقعی سرکاری زبان بنانا چاہتی ہے اور انگریزی کے اقتدار کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے۔ ہمیں اربابِ اختیار سے اس کی توقع بھی نہیں کیونکہ ہم ان کی ذہنیت سے واقف ہیں البتہ یہ کام انجمن ترقی اردو کے کرنے کا تھا۔ اگر انجمن نے کوئی ملک گیر مہم چلائی ہوتی تو ہمیں کامل یقین ہے کہ عبوری دور کے اختتام سے پیشتر ہی ہم انگریزی کے تسلط سے آزاد ہو جاتے۔ اس سے انجمن میں نئی زندگی آتی اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا مگر افسوس ہے کہ انجمن کی مجلس نظما نے اس بنیادی کام کی طرف توجہ نہ دی۔ آج انجمن کے اندر اقتدار کی جو جنگ جاری ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انجمن نے اصل مقصد کو نظر انداز کر دیا ہے اور فروعی کاموں میں لگی ہوئی ہے۔

کسی فعّال ادارے کے اندر اختلافِ رائے کا پایا جانا صحت کی دلیل ہے لیکن افسوس ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اور انجمن کے دوسرے عہدہ داروں کے درمیان کوئی اصولی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ نزاع کا باعث چند شخصیتیں ہیں یا انجمن کا موجودہ اثاثہ ہے یعنی اردو کالج، پریس، کتب خانہ اور انجمن کی مطبوعات کی نگرانی۔ لطف یہ ہے کہ اس جھگڑے میں بعض عناصر ہماری سب سے قیمتی متاع کو (جس نے انجمن کو انجمن بنایا) ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مولوی عبدالحق کی ذات سے الگ انجمن ترقی اردو کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ ضمانت بھی تو نہیں دے سکتا کہ مولوی صاحب کے بعد انجمن کی حالت وہی نہ ہو جائے گی جو ان سے پیشتر تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اردو زبان وادب پر جو احسانات کیے ہیں ان کا اعتراف تو دشمنوں کو بھی ہے۔ اس کے باوجود انہیں ذہنی اور روحانی اذیت پہنچانے کے لیے انتہائی مذموم حرکتوں سے بھی اجتناب نہیں کیا جاتا۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔ ہم مولوی عبدالحق صاحب کو فرشتہ نہیں سمجھتے لیکن ان کے مخالفین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اختلاف کے جوش میں ان کی

دیرینہ خدمات اور پیرانہ سالی کو نظر انداز نہ کریں۔

اب کہ انجمن ترقی اردو کا قضیہ سازشی ایوانوں سے نکل کر سر بازار آ گیا ہے انجمن کی تنظیمی خامیوں کو دور کرنا از بس ضروری ہے لیکن اس سے پیشتر کہ انجمن کو جمہوری اساس پر چلایا جائے اور اس کے کاموں میں باقاعدگی اور آہنگ پیدا ہو ان تمام الزامات کی تحقیقات ہو جانی چاہیے جو مجلسِ نظما کے عہدہ داروں اور ممبروں پر لگائے جا رہے ہیں۔ تحقیقات کا یہ کام کسی ایسے غیر جانب دار کمیشن کے سپرد ہو جس پر پبلک، حکومت اور انجمن کے عہدہ داروں کو پورا بھروسہ ہو اور جسے اردو زبان اور ادب کے مسائل سے دلچسپی بھی ہو۔ تحقیقاتی کمیشن کو وسیع اختیارات ملنے چاہییں تا کہ وہ انجمن کے دفتر، اردو کالج، پریس، کتب خانے اور مطبوعات سب کی مکمل جانچ پڑتال کرے۔ موجودہ انتشار اور اختلاف کو ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

یکم جون ۱۹۵۸ء

متفرقات

۱۸۵۷ء کی اہمیت

اس ہفتے ملک کے گوشے گوشے میں پہلی جنگِ آزادی کی صد سالہ یادگار منائی جائے گی اور اُن مجاہدینِ وطن کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا جنھوں نے غلامی کے دھبّوں کو اپنے خونِ دل سے دھویا اور مادرِ وطن کی عزت بڑھائی۔ لیکن اہلِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کوئی اتفاقی واقعہ یا حادثہ نہ تھی بلکہ اس عظیم تحریک کا سلسلہ اُن اسباب وعلل اور واقعات وسانحات سے ملتا ہے جن کی ابتدائی کڑیاں پلاسی کے میدان میں بکھری نظر آتی ہیں۔ یہی وہ تاریخی رزم گاہ تھی جہاں نواب سراج الدولہ، لارڈ کلائیو کی فوجوں سے نبرد آزما ہوا تھا، جہاں میر جعفر نے چند سکوں کے عوض وطن کی آزادی کا سودا کیا تھا اور غداری کی نئی روایت قائم کی تھی۔ اس کے بعد وطن کی سو سالہ تاریخ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فتح مندیوں کی تاریخ ہے۔

انگریزوں کی طرف سے اکثر یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم نے بے خیالی اور خود فراموشی کے عالم میں ہندوستان کو سلطنتِ برطانیہ میں شامل کیا مگر تاریخ گواہ ہے کہ انگریزوں نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھتے ہی اس ''سب سے قیمتی ہیرے'' پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔ رشوت، خوشامد، وعدے، طاقت، غرض کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو حصولِ مقصد کے لیے استعمال نہ کیا گیا اور کوئی ایسا حیلہ، بہانہ اور عذر نہ تھا جس سے کام نہ لیا گیا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ ایک کے بعد دوسرے

علاقے کو تسخیر کرتے رہے اور اربابِ اقتدار کی آنکھ اُس وقت کھلی جب پورا ملک برطانیہ کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔

انگریزوں نے تو اس برعظیم پر بے خیالی اور خود فراموشی کے عالم میں قبضہ نہیں کیا تھا البتہ ہم ضرور بے خیالی اور خود فراموشی کے عالم میں اپنی آزادی کھو بیٹھے۔ انگریز لال قلعہ کی کٹھ پتلیوں کو شہنشاہِ ہند کے لقب سے مخاطب کرتے اور اودھ کے نوابوں کو بادشاہ کہتے۔ شہنشاہ کے دربار میں نذر پیش کرتے اور مؤدب کھڑے رہتے۔ کتنی عزت کرتے وہ ہمارے ان بے ملک کے بادشاہوں کی۔ اگر بنگال اور بہار کی دیوانی ہاتھ سے نکل گئی تو کیا غم، انگریز ہمارے شہنشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تو تسلیم کرتے تھے اور جو پنشن دی جاتی تھی وہ دراصل پنشن نہ تھی بلکہ ''مالی امداد'' تھی اور ''فوجی امداد'' کا مقصد سلطنتِ مغلیہ کو مرہٹوں کی دست بُرد سے محفوظ رکھنا تھا پھر ایک دن وہ آیا جب مرہٹوں کو بھی تسخیر کر لیا گیا اور اعلان ہوا کہ ''ملک خدا کا فرمان بادشاہ کا اور حکومت کمپنی بہادر کی۔'' بہی خواہوں نے لاکھ سمجھایا کہ ان غیر ملکی تاجروں کو اپنا دوست اور حلیف نہ سمجھیے اور ان کے وعدوں اور معاہدوں پر اعتبار نہ کیجیے لیکن درباروں میں تو اثر و رسوخ مرزا الٰہی بخش اور مولوی علی نقی قسم کے لوگوں کا تھا۔

اہلِ وطن کو اپنے حکمرانوں کی ان مجرمانہ غفلتوں کا جو خمیازہ بھگتنا پڑا اس سے کون واقف نہیں لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ہماری آزادی اور خود مختاری بالکل محفوظ ہے وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آزادی کی جنگ ایک مسلسل اور پیہم عمل ہے، اس کے ان گنت محاذ اور لاتعداد مورچے ہیں، یہ جنگ سدا جاری رہتی ہے، اس جنگ میں ایک لمحے کی غفلت بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے اور ناعاقبت اندیشی کی معمولی سے معمولی لغزش پوری قوم کی غلامی کا باعث بن سکتی ہے، مالی اور فوجی امداد کے وعدے آج بھی ہمارے پاؤں کی زنجیر بن سکتے ہیں۔ عیاریوں اور مکاریوں کے نام اور ان کی ظاہری شکلیں ممکن ہے بدل گئی ہوں لیکن ان کے مقاصد بدستور وہی ہیں۔

بعض مغربی ممالک اس دور میں بھی جہاں گیری اور جہاں بانی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان بیرونی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے ہماری آزادی اور خود مختاری کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس خطرے کا سدِباب کرنا ہر محبِ وطن پر واجب ہے۔ افسوس ہے کہ اربابِ اقتدار اس خطرے کو بالکل محسوس نہیں کرتے اور نہ ماضی سے سبق لیتے ہیں۔ اس خطرے سے ملک کو

آگاہ کرنے والوں کو انتشار پسند اور آزادی وطن کا دشمن کہا جاتا ہے، اور ان کی زباں بندی کے لیے سیکورٹی ایکٹ استعمال کیا جاتا ہے۔

آزادی ایک متاعِ بے پایاں ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا قومی فریضہ ہے اور اس کے دشمنوں سے لڑنا ہماری قومی روایت ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے شہیدانِ آزادی کا ہر قطرۂ خون پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ مغربی طاقتوں کی گندم نما جو فروشیوں سے ہوشیار رہو جو امداد کی آڑ میں تم کو آزادی کی دولت سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

۱۲ مئی ۱۹۵۷ء

گمنام شہیدوں کی یادگار

وہ کون تھے کوئی نہیں جانتا۔ سیاسی اکابر کی صفوں میں ان کا مقام نہیں، معززین کے باب میں ان کا ذکرِ خیر نہیں، حکامِ عالی اور خطاب یافتہ بزرگوں کی فہرستیں ان کے نام سے خالی ہیں۔ وہ ہزاروں، لاکھوں گمنام افراد جو محکومی کی سیاہ رات میں آزادی کی منزل کی جانب جادہ پیما رہے اور صبحِ دم اپنے لہو میں شرابور موت کی پُر اسرار وادیوں میں کھو گئے، وہ تہی دست اور دامن چاک شہدائے آزادی جن کا تمام سرمایۂ حیات جذبۂ حریت اور استقامت کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن جن کی گراں بہا قربانیوں کا عوض ارضِ پاکستان ہے۔ فرداً فرداً انہیں کون جانتا ہے اور کون یاد کرتا ہے۔ یہ احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے کہ نہ ان شہدا کو یاد رکھا گیا ہے جنہوں نے حصولِ پاکستان کی راہ میں اپنی قیمتی جانیں قربان کیں نہ ان کروڑوں شہریوں کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا ہے جنہوں نے آزادی کی جدوجہد میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا۔ بارے، شہدائے آزادی کی گمنام روحوں کو مژدہ ہو کہ اب قیامِ پاکستان کے گیارہ برس بعد ان کی دائمی یادگار کے قیام کی ایک تجویز سنائی دی ہے۔ اس مفہوم کا اعلان مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ جناب مظفر علی قزلباش نے فرمایا ہے۔ زندہ قوموں کا دستور ہے کہ صحت مند روایات سے زندگی کی حرارت قبول کرتی ہیں اور اپنے ماضی کے تابندہ نقوش سے مستقبل کی صورت سنوارتی ہیں لیکن ہم سے اب تک یہ بھی نہ ہو سکا پر حیرت نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ ہم سے تو اب تک اور بہت کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ سنگِ حوادث کی پیہم یورش نے شہریوں کو سر چھپانے کی مہلت تو دی نہیں، یہ ہوش کسے رہتا

کہ شہدائے حریت کے لہو کے تاج کسمپرسی کی گرد میں اَٹے جا رہے ہیں۔

بہر حال، تاخیر سے سہی لیکن گمنام شہیدوں کے شایانِ شان یادگار لاہور میں ایک مرکزی مقام پر قائم کرنے کی تجویز بڑی مناسب ہے۔ تفصیلات ابھی طے نہیں ہوئیں لیکن وزیرِاعلیٰ کا ارشاد ہے کہ فی الوقت ایک منصوبہ بابِ عالی کی تعمیر کا ہے اور دوسرا درس گاہ یا ہسپتال کی تعمیر کا۔ منصوبوں کی کامیابی کا انحصار سرمائے پر ہے کہ سرمایہ پیہم پہنچا تو بہت کچھ ممکن ہوگا۔

ہمارے خیال میں شہریوں کی جانب سے ایسے ہر تعمیری منصوبے کا خیر مقدم کیا جائے گا اور اس ضمن میں حکومت کو مالی امداد بھی توقع سے کچھ زیادہ بہم پہنچے گی۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ ان گمنام شہدا سے تعلقِ خاطر کروڑوں گمنام ہم وطنوں کو نامورانِ حکومت کے مقابلے میں یقیناً زیادہ ہے۔ ان شہریوں نے بھی شہدائے آزادی کی طرح نہایت صبر و استقامت سے قیامِ پاکستان کی تحریک میں اپنا حق ادا کیا اور اس کے استحکام کی جدوجہد میں نہایت خاموشی سے ہر قسم کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس جذبۂ ایثار کے مقابلے میں اربابِ اقتدار کا دفترِ عمل ہے جو آئینی انحراف، سیاسی بے اصولی، وزارتی سودے بازی، انتظامی افراتفری اور ہزار گونہ بدعنوانیوں سے پُر ہے۔ بہتر ہوگا اگر شہدائے آزادی کے حضور میں عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے سے قبل اربابِ اقتدار اس دفترِ عمل کو بھی کہیں ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں۔

شہدائے آزادی کی ایک یادگار تو وہ ہوگی جس کا اجمالاً تذکرہ وزیرِاعلیٰ نے فرمایا ہے یعنی درس گاہ یا کسی دوسرے فلاحی ادارے کی تعمیر لیکن ایک یادگار ان گمنام شہدا کی اور بھی ہے جو تمام مجوزہ یادگاروں سے زیادہ گراں مایہ اور وقیع تر ہے یہ ہے پاکستان۔ اس یادگار کو بھی شہدائے آزادی کے شایان شان رفیع بنانے کے لیے مدتوں تفصیلات کا انتظار رہا۔ منصوبے بنتے اور بگڑتے رہے، تفصیلات مرتب اور مسترد ہوتی رہیں اور یہ یادگار اپنے سنگِ بنیاد کو سینے سے لگائے اُس دن کی منتظر رہی جب اس کے معمار ذاتی مصالح اور مفادات کی آویزشوں کو ترک کر کے اس کی تعمیر میں کوشاں ہوں گے۔ دس گیارہ برس کی آئینی، وزارتی اور انتظامی بدعنوانیوں کے بعد اب کہیں جا کر وہ مبارک دن قریب آیا ہے جب ہم وطنوں کی پُرسش ہوگی اور ان کے منتخبہ نمائندوں کو موقع دیا جائے گا کہ کروڑوں مجاہدینِ آزادی اور شہدا کی اس دائمی یادگار کی توسیع اور تعمیر شایانِ شان طور پر اور اپنی دیرینہ آرزوؤں کے مطابق کریں۔ البتہ اس امر کی احتیاط لازم ہے کہ اربابِ ہوس کی سازشوں اور اربابِ وطن کی سہل انگاریوں سے وہ دن کہیں پھر دور نہ جا

پڑے۔

شہدائے آزادی کی یادگار قائم کرنے کی تجویز سے ایک اور تجویز کا انجام یاد آ گیا۔ بابائے قوم قائدِ اعظم کی رحلت کو دس برس ہونے کو آئے ہیں لیکن ان کے مقبرے اور جامعہ کے قیام کا منصوبہ ہنوز تفصیلات کا محتاج ہے۔ کاش گمنام شہدا کے ساتھ اس محسنِ اعظم اور نامور شہید کو بھی یاد کیا جائے۔

۲۵ مئی ۱۹۵۸ء

قومی تقریبات

پچھلے چند دنوں میں اہلِ پاکستان نے عید بھی منائی، یومِ اقبال بھی لیکن یہ تو محض محاورہ ہے ورنہ ہم کوئی تقریب کب مناتے ہیں، البتہ دل کو ضرور منانا پڑتا ہے کہ آج عید کا دن ہے اور آج یومِ اقبال، آج یومِ جمہوریہ ہے اور آج قیامِ پاکستان کا دن۔ قوموں کی زندگی میں ایسی تقریبات عام طور سے بہت اہم سمجھی جاتی ہیں اور ان کے بندوبست میں بہت تکلف اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ جشن، نمائشیں، میلے، کھیلیں، علمی اور تہذیبی مظاہرے، تہوار کی مناسبت سے مختلف نوع کی سرگرمیاں مرتب کی جاتی ہیں جن سے بیک وقت عوام کے قلب ونظر کو آسودگی اور قومی تہذیب وثقافت کو فروغ ملتا ہے، اس کے برعکس ہمارے ہاں یہ کیفیت ہے کہ جب بھی کوئی مسعود و مقبول دن آتا ہے تو انشراحِ قلب اور انبساطِ خاطر کے بجائے اداسی اور بے لطفی کی کیفیت چھوڑ جاتا ہے، بہت ہوا تو کسی صاحبِ حشم کی سواری کہیں سے گزر گئی۔ چند سرکاری دفتروں اور مالدار گھروں یا دکانوں میں روشنی ہوگئی، ہما شما کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ جانِ بہار سے آنکھیں سینک لیں یا زہرِ عشق سے پیاس بجھالیں اور یہ بھی مقدور نہ ہو تو کوچہ و بازار میں بے کار و آوارہ پھریں۔ عام طور سے ایسی ہر تقریب گزر جانے کے بعد اخبارات میں چھپتا ہے کہ فلاں جگہ بازاروں میں ہلڑ مچا اور فلاں مقام پر اوباشوں نے خواتین سے بدتمیزی کی، پھر اس بدتہذیبی پر شدید غیظ وغضب کا اظہار ہوتا ہے، اداریے لکھے جاتے ہیں اور بیانات دیے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر عوام کو آپ نے کون سی ایسی مہذب تفریح یا معقول مصروفیت مہیا کی ہے

جسے چھوڑ کر وہ بدتہذیبی اور ہلڑ بازی پر اتر آئے۔ گزشتہ دس برس میں ہمارے سرکاری، سیاسی یا معاشرتی اداروں نے ان کی ذہنی اور ثقافتی تربیت کے لیے کون سے اسباب اور مواقع پیدا کیے کہ ان کے آداب و اخلاق کا گلہ برحق ہو۔ اس کوتاہی میں یوں تو سبھی با اثر اور ذی شعور طبقے شریک ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس ضمن میں اوّلین ذمہ داری اربابِ حکومت کی ہے کہ جملہ امورِ عامہ انھیں کی تحویل میں ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے اسمائے گرامی کی فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد ان سے خستگی کی داد پانے کی توقع قطعی عبث معلوم ہوتی ہے۔ آپ ہمارے مرکزی اور صوبہ جاتی وزرائے کرام کے نام گنیے اور فرمایے کہ ان میں سے کون بزرگ ایسے ہیں جنہیں علوم وفنونِ جدید وقدیم کی کسی شاخ سے لگن یا کسی مد میں کوئی مقام حاصل ہے۔ شاید وہ یہ عذر تو پیش کر سکتے ہیں کہ ان کے ایامِ تعلیم و تربیت کے دوران ان کے موجودہ مناصب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اپنی موجودہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد انہوں نے حصولِ فضل و کمال میں کہاں تک سعی کی، بہت اَدَق اور ارفع علوم وفنون میں نہ سہی قومی تاریخ و تہذیب، زبان و ادب اور رسوم و روایات سے شناسائی پیدا کرنے ہی میں سہی اور اگر انہیں دفتری اور وزارتی مشاغل اس کی بھی مہلت نہیں دیتے تو کم از کم یہی کریں کہ ہماری مذہبی، قومی اور ثقافتی تقاریب کے موزوں اہتمام کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے ایسے ہنرمندوں اور دانشوروں سے رجوع کریں جو ان معاملات میں نظر رکھتے ہیں تاکہ مستقبل میں یہ ایام فرحت بخش اور سودمند تہذیبی روایات کی ابتدا کر سکیں۔

۲۷ اپریل ۱۹۵۸ء

جرأتِ رندانہ کی ضرورت

کہتے ہیں کہ یہ سائنس کا زمانہ ہے، ایٹم اور سپوتنک کا زمانہ ہے، چاند تاروں کی تسخیر کا زمانہ ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں ہی نے جہل کی تاریکیوں میں علم کی شمع روشن کی اور مغرب کو سائنس کے اصولوں سے روشناس کیا۔ یہ سب بجا و درست لیکن کیا اس وقت تک ہماری قوم میں سائنسی تقاضوں کا کوئی شعور پیدا ہوا ہے۔ کیا ہمارے اربابِ اختیار کو اس بات کا پورا پورا احساس ہو گیا ہے کہ سائنسی علوم سے آگہی اور سائنسی نقطۂ نظر کا حصول ہماری بقا و ترقی کے لیے کتنا اہم ہے۔ گزشتہ منگل کو کراچی میں ''سائنس اور صنعت'' کے موضوع پر جو مجلسِ مذاکرہ کونسل آف پاکستان ایسوسی ایشن آف سائنٹسٹس کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی تھی اس کی رُوداد اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس مذاکرے میں ملک کے بعض نہایت ذمہ دار حضرات نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی ضرورت سائنسی علوم کی ہمہ گیر ترویج اور سائنسی تحقیق و جستجو کا فوری فروغ ہے۔ اس کے بغیر نہ ہماری قوم کا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہے نہ ہم خود کفیل ہو سکتے ہیں، نہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں ہمارا وقار بڑھ سکتا ہے اور نہ ہم فرسودہ رسوم و توہمات کی گرفت سے نجات پا سکتے ہیں۔

سائنسی تعلیم و تحقیق ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک غور و فکر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کا محتاج ہے۔ سائنس کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا دقیانوسی نظامِ تعلیم ہے جو سائنس پر نام نہاد آرٹ کی تعلیم کو فوقیت دیتا ہے۔ ہمارے کالجوں،

یونیورسٹیوں اور دوسری درس گاہوں میں سائنسی علوم کی تعلیم کا جو حال ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نہ سند یافتہ اساتذہ ہیں، نہ نئے آلات سے آراستہ لیبارٹریز ہیں، نہ سائنس کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں اور نہ اساتذہ اور طلبا کو تحقیق و جستجو کی سہولتیں ملتی ہیں۔ بس ایک رسم ہے جو نباہی جاتی ہے حالانکہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ نظامِ تعلیم میں سائنس کو اوّلیت کا درجہ دیا جائے۔ اگر سائنس کو لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا تب بھی سائنس کے شعبوں کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ طلبا سائنس کی طرف راغب ہوں۔

ہمارے مل مالکوں اور صنعتی سرمایہ داروں کو بھی اپنی ذہنیت بدلنی ہوگی۔ مجلسِ مذاکرہ میں مسٹر مظفر علی خاں قزلباش، مسٹر غلام فاروق اور مسٹر حاتم علوی نے اپنی تقریروں میں یہ شکایت بھی کی کہ یہ حضرات اپنی ملوں اور کارخانوں سے کروڑوں روپیہ نفع کماتے ہیں لیکن صنعتی ریسرچ پر بالکل توجہ نہیں دیتے حالانکہ اس میں ان کا ذاتی فائدہ بھی ہے۔ یورپ میں شاید ہی کوئی صنعتی ادارہ ایسا ہو جس میں ریسرچ کا شعبہ نہ ہو۔ وہاں کے بڑے بڑے مل مالک ریسرچ پر کروڑوں روپیہ صرف کرتے ہیں اور اس سے انہیں بڑا فائدہ ہوتا ہے لیکن حیرت ہے کہ ہمارے مل مالکوں کو اب تک اس کا احساس نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ حضرات صنعتی تحقیقات پر توجہ نہیں دیتے تو کیا حکومت کسی قانون کے ذریعے انہیں اس بات پر مجبور نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے نفع کا ایک حصہ ریسرچ کے کاموں پر لگائیں۔

مگر سائنسی تعلیم اور تحقیق کو فروغ دینے کے سلسلے میں بنیادی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔ حکومت چاہے تو پوری قوم کا اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا مزاج بدل سکتی ہے بشرطیکہ وہ خود سائنس کی ضرورت کو دل سے تسلیم کرے اور رسمی تلقین پر اکتفا نہ کرے لیکن کیا ہمارے وزرائے عالی مقام میں سے خواہ وہ مرکز کے ہوں یا صوبوں کے کسی ایک کے بارے میں بھی یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سائنس کی ابجد سے واقف ہیں یا سائنسی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں البتہ ہمارے وہ سائنس داں ضرور شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ان نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں سائنسی علوم کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا۔ یہاں سینٹرل کونسل آف ریسرچ کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ یہ مفید ادارہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی نگرانی میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت اس ادارے میں فقط چار سائنس دان کام کرتے تھے اور آج خوشی کا مقام ہے کہ اس ادارے میں سائنسی تحقیقات کا کام کرنے والوں کی تعداد تین سو ہے۔ ریسرچ کونسل کی صوبائی

تجربہ گاہیں بھی مفید کام سرانجام دے رہی ہیں اور اب مرکزی حکومت کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ ہر سال ۹۸ ہزار روپیہ اُن سائنس دانوں میں تقسیم کیا جائے گا جو نئی چیزیں ایجاد کریں گے۔ یہ رقم بہت تھوڑی ہے لیکن شکر ہے کہ ہماری حکومت نے اس طرف توجہ دی اور ہمیں امید ہے کہ اس رقم میں برابر اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

لیکن سائنس کا سب سے اہم مسئلہ قوم میں سائنسی نکتۂ نظر پیدا کرنے کا ہے۔ سائنس کی بنیاد تجربات و مشاہدات پر ہے۔ ذاتی خواہشات و تعصبات، جذباتیت، جانب داری اور ماضی پرستی سائنس کی سب سے بڑی دشمن ہیں چنانچہ سائنس کو اور سائنسی نکتۂ نظر کو ہمارے ملک میں اسی وقت فروغ حاصل ہوسکتا ہے جب ہم نہایت سنجیدگی اور غیر جانب داری سے چیزوں کا تجربہ اور مشاہدہ کریں اور ان سے حیات کے اصول مرتب کریں۔ اگر کوئی پرانا اصول یا پرانی روایت ہمارے تجربے اور مشاہدے کی نفی کرتی ہے تو اسے ترک کردیں۔ اگر کوئی نیا تجربہ ہمارے پرانے تجربے کی نفی کرتا ہے تو ہم اس پرانے تجربے کو بھی غلط تسلیم کرنے سے نہ ہچکچائیں، کہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا راز اسی جرأتِ رندانہ میں مضمر ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء

اسلامی مجلسِ مذاکرہ

اسلامی مجلسِ مذاکرہ کا نو روزہ اجلاس ہوگیا۔ بتّیس ملکوں کے ایک سو ستر مندوبین نے اپنے ایک سو مقالوں میں جن خیالات و آرا کا اظہار کیا چند سطروں میں ان کا جائزہ لینا اجلاس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی البتہ مضامین اور مباحثوں کے سرسری مطالعے سے بھی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام ماضی کی کوئی داستانِ پارینہ نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے اور مراکش سے پیکنگ اور سمرقند و بخارا سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی مسلم آبادی اپنے لسانی، تاریخی اور سیاسی اختلافات کے باوجود چند بنیادی قدروں کا ایک رشتۂ اتحاد رکھتی ہے اور آج جب کہ مسلمان غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں مسلم عالموں اور دانش وروں میں اغیار کی خوشہ چینی کرنے کا رجحان ختم ہو رہا ہے اور خود اعتمادی کا احساس بڑھ رہا ہے۔ وہ دورِ حاضر کے معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں سے آگاہ ہیں اور ان کے غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا مرکز مسلمانانِ عالم کی بہبودی اور ترقی ہے۔

بعض حلقوں کی طرف سے مجلسِ مذاکرہ کے منتظمین کی نیتوں پر شبہہ ظاہر کیا گیا ہے اور مذاکرے کے خفیہ اغراض و مقاصد کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان بدگمانیوں کی تصدیق کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے البتہ اجلاس میں بعض ایسے مقالے ضرور پڑھے گئے اور مباحثے کے دوران میں بعض ایسی باتیں ضرور کہی گئیں جن سے ان شبہات کو تقویت پہنچتی ہے لیکن شکر ہے کہ مفسدین کو اپنے ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ مندوبین کی توجہ اصل مسائل سے نہ ہٹا سکے اور نہ مذاکرے کو وہ رنگ دے سکے جس کی آرزو لے کر وہ یہاں آئے تھے۔

خیال تھا کہ غیر مسلم مستشرقین کی موجودگی سے مذاکرے اور مباحثے کا معیار بلند ہوگا اور اسلامی دنیا ان کی علمی خدمات سے مستفید ہو سکے گی لیکن دانایانِ مغرب کی وضع، احتیاط اور پُر اسرار خاموشی بڑی مایوس کن تھی۔ اس کے برعکس مصر و شام کے علما نے جس علمیت، اعتماد اور جرأت کا ثبوت دیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس مجلسِ مذاکرہ کے روحِ رواں دراصل یہی عرب علما تھے جن کی لیاقت اور بالغ نظری نے ثابت کر دیا کہ اب دنیائے اسلام دانایانِ مغرب کی محتاج نہیں ہے اور مسلمانوں کے تاریخی، تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی مسائل کا تجزیہ خود مسلمان بطریقِ احسن کر سکتے ہیں۔

مجلسِ مذاکرے کا مقصد تبادلۂ خیالات تھا، تجاویز منظور کرنا یا فیصلہ صادر کرنا نہ تھا پھر بھی عام خیال یہی تھا کہ مشرق و مغرب کے دانش وروں کا یہ اجتماع دنیائے اسلام کے بعض اہم معاشرتی مسائل پر سیرِ حاصل روشنی ڈالے گا اور ان مسائل کو حل کرنے کی راہیں بتائے گا لیکن افسوس ہے کہ تاویل و تفسیر کے ہنگاموں نے فرصت ہی نہ دی کہ عقدہ کشائی اور راہنمائی کے فرائض انجام دیے جاتے مثلاً اسلامی ملکوں کا فرسودہ زرعی نظام ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بنا ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم علما کے درمیان اس مسئلے پر شدید اختلاف پایا گیا۔ یہ صورتِ حال بڑی حوصلہ شکن تھی۔ مذاکرے میں بعض غیر مسلم مندوبین کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا جن سے عداوت نہ سہی کم آگہی ضرور جھلکتی تھی۔ جواب میں مسلم مندوبین نے جب بھی لب کشائی کی تو یوں محسوس ہوا کہ گویا اسلام کا محاکمہ ہو رہا ہے۔ دینِ محمدی عدالت میں ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہے اور مسلم مندوبین وکیلِ صفائی کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ دفاعی انداز کہیں زیب نہیں دیتا۔

بہر حال مجموعی حیثیت سے یہ مذاکرہ بہت کامیاب رہا۔ غیر مسلم مندوبین کو اہلِ مشرق کے مزاج اور نفسیات سے تھوڑی بہت واقفیت ہوگئی اور انہیں معلوم ہوگیا کہ مسلم عالموں اور دانش وروں کے غور و فکر کا انداز ان دنوں کیا ہے۔ مسلم علما کے درمیان اخوت کے رشتے اور مضبوط ہوگئے اور دوست دشمن میں بھی تمیز ہوگئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ذاتی رابطے اور گفتگو سے یگانگت و موانست کے راستے کھل گئے اور متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔ اسلام ہمیں رواداری اور فراخ دلی کا سبق سکھاتا ہے اور تعصب و تنگ نظری کی مذمت کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ بین الاقوامی مذاکرہ اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں ہماری مدد کرے گا۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء

عیدِ قرباں کا مفہوم

عیدِ قرباں کا ہفتہ اپنی بے پایاں مسرتوں سے قطع نظر اسلامی برادری کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ اس ہفتے میں شمعِ رسالت کے لاکھوں پروانے عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے ارضِ حجاز میں یک جا ہو کر خدا کی سب سے قدیم اور سب سے عظیم عبادت گاہ کا طواف اور سنتِ ابراہیمی کی تجدید کرتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں وہ مسلمان ہیں جنہیں حج کی سعادت تو نصیب نہیں ہوتی البتہ اپنی استطاعت کے مطابق وہ بھی راہِ حق میں اپنے متاع کی قربانی کر کے اس عالمگیر برادری کے رشتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

لیکن بغور دیکھا جائے تو عیدِ قرباں ایک علامت ہے جو اللہ کے پرستاروں کو بھیڑوں، بکریوں، دنبوں اور اُونٹوں سے بڑی قربانیوں کی جانب اشارہ کرتی ہے مگر آج ہم اپنی ذات کا محاسبہ کریں اور اپنے قومی کردار کا جائزہ لیں تو ہم میں قربانی کا نہ وہ جذبہ ملے گا جس کی یاد ہم بڑے اہتمام سے مناتے ہیں نہ سنت ابراہیمی کی وہ روح کہیں نظر آئے گی جس نے مسلمانوں کو حق کے لیے جینے اور حق کے لیے مرنے کا راز بتایا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ہم اپنی ذات کو، اپنے مفاد کو، اپنے آسائش و آرام کو، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو، اپنے احباب و اقربا کی خوشنودیوں اور پاسداریوں کو راہِ حق میں بے دریغ قربان کر دیتے تھے۔ دراصل ہماری پوری زندگی عبارت تھی نفس کی قربانی سے اور بلاشبہ سب سے بڑی قربانی نفس کی قربانی ہی ہے کیونکہ ذاتی اور معاشرتی زندگی کی بیشتر خرابیوں کا رشتہ نفس پرداریوں اور نفس پرستیوں ہی سے ملتا ہے اور حق کی خاطر جس

شخص اور جس معاشرے نے اپنے نفس کو قربان کر دیا دنیا اور عقبیٰ میں وہی سرخ رُو ہوا اور اسی نے سنتِ ابراہیمی کا صحیح مفہوم سمجھا۔

قربانی کلمہ نہیں عمل ہے۔ اس کو قول کی کسوٹی پر نہیں بلکہ عمل کے معیار ہی پر پرکھا جاسکتا ہے اور عمل بھی وہ جس کا تعلق انسانی معاشرے کی اعلیٰ قدروں سے ہو۔ پھر یہ عمل کوئی واحد فعل یا وقتی حادثہ نہیں جو کسی اضطراری جذبے کے تحت سرزد ہوجائے تو تاریخ کے صفحات کو منور کر دے۔ قربانی تو اعمالِ صالح کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، جینے کا ایک خاص قرینہ ہے، سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک خاص انداز ہے جو پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے خواہ یہ شخصیت فرد کی ہو یا قوم کی۔ آج اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چُھری پھیر دے تو دنیا اسے دیوانہ کہے گی کیونکہ اس کی یہ قربانی— وہ کتنے ہی خلوص سے کیوں نہ کی گئی ہو— اس کی پوری زندگی سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کے برعکس حضرتِ ابراہیمؑ کی پوری زندگی راہِ حق میں قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش کرتی ہے ''ذبحِ عظیم'' تو فقط اس سلسلے کی آخری اور سب سے اہم کڑی تھی۔ قربانی ہماری سرشت میں نہیں۔ ہم یہ نہیں مانتے۔ یہ بھی درست نہیں کہ ہماری قوم اجتماعی اور انفرادی قربانی کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ آخر ہمارے یہی امیر اور فقیر تو تھے جنہوں نے ۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اور تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان کے موقع پر بڑی سے بڑی قربانیوں سے گریز نہ کیا۔ پاکستان کے عام باشندے اب بھی اپنی بساط بھر وقتاً فوقتاً قربانیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان قربانیوں کے بغیر مملکت کی بقا اور تحفظ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن گزشتہ چند برسوں میں نفس پروری اور حبِ ذات کی ایسی روایتیں قائم ہوئی ہیں جن کے سبب پورے ملک کی فضا مسموم ہوگئی ہے اور قربانی اور خدمتِ خلق کا جذبہ دب کر رہ گیا ہے— یہ روایتیں ٹوٹیں گی اور انشاءاللہ جلد ٹوٹیں گی۔ قربانی کی روح فنا نہیں ہوتی اسے تو بیدار ہونا ہے، وہ بیدار ہوگی۔

عیدِ قرباں کا ہفتہ اسلامی اخوت و اتحاد اور امن و سلامتی کا ہفتہ بھی ہے۔ ان مبارک دنوں میں دنیائے اسلام جذبۂ ایمانی سے سرشار ہوتی ہے اور اس کے قلب و نظر کا مرکز وہ مقدس مقام ہوتا ہے جسے مولدِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اتحادِ اسلام کی کڑیوں کو مضبوط بنانے کا اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہوسکتا لیکن افسوس ہے کہ نہ مکہ معظمہ میں اس کی کوئی کوشش ہوتی ہے نہ مسلم مملکتوں کے سربراہوں کی طرف سے اس بین الاقوامی اسلامی اجتماع کے موقع پر اتحاد و یگانگت کا کوئی عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ حج کے دنوں میں مختلف ملکوں سے آنے والے اور مختلف

بولیاں بولنے والے مسلمان، میدانِ عرفات میں بے شک یک جا ہوں گے اور طواف کعبہ کے وقت ان کے جسم بلاشبہ ایک دوسرے سے مس ہوں گے لیکن کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ذہنی یگانگت بھی پیدا ہوگی اور ان کے دل کے تار بھی ہم آہنگ ہو کر اتحاد اور اخوت کے گیت گائیں گے۔

افسوس ہے کہ مسلم مملکتوں کے سیاسی اختلافات رفتہ رفتہ اتنے شدید ہوتے جاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے اتحاد کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن ہمیں امید ہے کہ حالات بدلیں گے اور مسلم عوام کا جذبہ اتحاد مسلم مملکتوں کے سربراہوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے پر مجبور کرے گا۔ اختلافات کو ہوا دینے والی اور مسلمانوں میں نفاق کا بیج بونے والی بیرونی طاقتوں کو شکست ہوگی اور مسلمانانِ عالم کے درمیان ایک ایسا اتحاد قائم ہوگا جس کی بنیاد اسلامی ملکوں کی آزادی، جمہوریت، امن اور خوش حالی پر ہوگی۔

۷ جولائی ۱۹۵۷ء

ذبحِ عظیم

تاریخ نے خیر و شر کا تصادم ہر دور میں دیکھا ہے اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اس نے خلیل کو شعلوں میں خراماں اور مسیح کو صلیب پر سربلند دیکھا ہے، اس نے سقراط کے پُرسکون چہرے کو زہر کی آنچ سے درخشاں اور حسینؓ کو جامِ شہادت سے سرشار دیکھا ہے۔ تاریخ نے دیکھا ہے کہ ایک طرف باطل ہے اور باطل کا تخت و تاج ہے، ثروت اور امارت ہے اور سپاہِ لشکر ہے۔ مقابل میں حق ہے اور حق کی بے سروسامانی۔ فروتنی اور خاک نشینی ہے اور اس صف آرائی میں جب دار و گیر کا ہنگامہ فرو ہوتا ہے تو باطل کا علم بلند اور حق کا سرنگوں نظر آتا ہے لیکن تاریخ نے دیکھا ہے کہ ظاہر کی یہ فتح باطن کی شکست ہوتی ہے اور ظاہر کی شکست باطن کی فتح۔

حق کا سرمایۂ ذات، ہر دور میں انسان کی روحانی طہارت اور اخلاقی رفعت، علم و ہدایت، خلوص اور محبت رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں باطل کے پاس جہل ہے اور تاریکی، خبثِ باطن اور اخلاقی بے راہ روی، افتراق اور انسان دشمنی، استحصال اور غلامی اور ان لعنتوں کا سکہ بٹھانے کے لیے جاہ و ثروت اور لشکر و امارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی عظمت اور انسانی معاشرے کی فلاح و اصلاح کے لیے جب بھی کوئی پیغمبر، کوئی پیشوا، کوئی بزرگ، کوئی دانا رشد و ہدایت کی مشعل لے کر اٹھا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر اٹھا،

گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود، داری شود

حسینؑ پر بھی یہ وقت آنا تھا لیکن ''گفتارِ صدق'' کا جو صلہ آپ کو ملا وہ اس سے پہلے کسی روحانی پیشوا کو نصیب نہ ہوا۔ حق کے لیے کسی نے نفس کی قربانی دی تھی، کسی نے جان کی، کسی نے مال کی اور بیٹے کی لیکن شہیدِ اعظم نے بیک وقت تمام قربانیوں کی نذر پیش کی۔

یہی وہ دن ہیں جب کوئی تیرہ صدی قبل اہلِ بیت کا ایک چھوٹا سا قافلہ کربلا میں فرات کے کنارے فروکش ہوا تھا۔ ان میں بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی اور بیمار بھی، کوئی ستر بہتر افراد تھے۔ ان میں اعزہ بھی تھے اور انصار بھی اور اس قافلے کے سالار حسینؑ تھے، علی کے بیٹے، پیغمبرِ اسلام کے نواسے، آپ کو یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار تھا اس لیے کہ یزید نے دولت اور امارت کے نشے میں اسلام کی تعلیماتِ کو بھلا دیا تھا۔ اس کے دل میں انسان کا احترام نہ تھا۔ اس نے معاشرے میں فسق و فجور کو از سرِ نو رواج دینا چاہا تھا اور حسینؑ کو یہ بات قبول نہ تھی۔ ایک طرف جہل، فسق اور فساد تھا، دوسری طرف روحانی طہارت، نیکی اور آشتی۔ ایک کا صلہ دولت اور مسندِ امارت تھی۔ دوسرے کا عوض، مصائب اور جاں کنی۔ امام علیہم نے آخر الذکر کا انتخاب کیا۔ انجام ظاہر تھا، آپ اپنے بچوں اور بوڑھوں، اعزہ اور انصار سمیت شہید کر دیے گئے۔ سر نیزوں پر بلند کیے گئے، لاشیں روندی گئیں، خیمے جلائے گئے اور عورتوں کو کوفہ و شام کے بازاروں میں قیدی بنا کر پھرایا گیا لیکن سب نے دیکھا کہ ظاہر کی یہ شکست باطن کی فتح تھی جس کی یاد کے نقوش آج بھی تازہ ہیں اور رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ رہیں گے۔

اقوامِ عالم کا دستور ہے کہ اپنے بزرگوں اور پیشواؤں کی یادیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں اور ان سے زندگی کی حرارت حاصل کرتی ہیں۔ امام علیہم اور آپ کے رفقا نے حق اور صداقت کی راہ میں جو عظیم اور ولولہ انگیز قربانیاں پیش کی تھیں ان کی یاد بھی ہمیشہ منائی جاتی رہے گی اور غیر ممکن ہے کہ جن مصائب و آلام سے ان شہدا کو گزرنا پڑا ان کا ذکر سن کر کوئی آنکھ پرنم نہ ہو۔

لیکن عاشورۂ محرم صرف اسلام کی تجدید کا یوم نہ تھا۔ ایک سے دوسری قربانیوں کے سلسلے ملتے ہیں۔ اس دن صلیب زندہ ہوئی، آتشِ خلیل دوبارہ گلزار ہوئی، سقراط کو نئی زندگی ملی۔ اس ایک چراغ نے کتنے ہی چراغوں کی لویں تیز کر دی تھیں — آج، جب ہم شہدائے کربلا کی یاد تازہ اور گریہ و ماتم کی صفیں آراستہ کرتے ہیں تو صرف حسینؑ اور رفقائے حسینؑ کا نام نہیں لیتے ہم ان یادوں کے پردے میں دراصل نیکی اور بصیرت، انسان دوستی اور روحانی طہارت، اخلاق اور مروّت کی شمعیں روشن کرتے ہیں اور اُس انسانی جذبے کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں جو صلیب

پر چڑھ کر بھی سربلند رہا، نیش کو نوشِ جاں بناتا رہا اور اپنے خون میں نہا کر بھی شاداب رہا۔ اگر شہدائے کربلا کا غم تازہ کرنے اور ان کی یاد منانے سے ہمارے دلوں میں اِن نیک جذبات کی کوئی کرن نہیں پھوٹتی اور آنکھیں پُرنم ہوتے ہوئے بھی بصیرت سے تہی رہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اس شہادت کے مفہوم اور اس کی روح کو سمجھا ہی نہیں۔

خیر و شر کی طاقتوں کا تصادم آج بھی جاری ہے۔ ہم اپنے قومی حالات کو پرکھیں یا عالمی صورتِ حال کا جائزہ لیں ان دونوں کی آویزش ہر جگہ نظر آئے گی۔ ایک طرف وہ عناصر ہیں جو آزادیِ خیال اور اظہارِ رائے کو صرف اپنا حق سمجھتے ہیں اور مکاری، منافقت اور تشدد کے بل پر معاشرے کو روحانی اور اخلاقی فرومایگی اور مادّی افلاس کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اخلاقی اور روحانی رفعت اور مادّی فارغ البالی کے لیے کوشاں ہیں جو اظہارِ خیال اور رائے کی آزادی چاہتے ہیں — اگر ہم نے شہدائے کربلا کی قربانیوں کا صحیح مفہوم سمجھا ہے تو ہم حق و باطل کی موجودہ معرکہ آرائی میں بھی خیر کی فتح کے طالب ہوں گے اور شر کی عارضی فتح کو بھی شکست سمجھیں گے خواہ وہ کتنی ہی بلند آہنگ کیوں نہ ہو۔

۴ اگست ۱۹۵۷ء

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

مقتلِ عشق میں ایک اور انسان سر بلند ہوا، معرکہ ٔ امتحان میں ایک اور تبرد آزما کو نصرت نصیب ہوئی۔ آج محبت اپنے شہید کی موت پر ماتم گسار ہے اور عشق نے کفن کا لباس پہن لیا ہے اور آدمِ خاکی کو خونخوار و مفسد کہنے والے فرشتوں کی پیشانیاں عرق آلود ہیں اور زندگی تعصّب کی تنگ نظری اور فرسودہ رسم و رواج کی سخت گیری پر اشک فشاں ہے۔

بوٹا سنگھ (جمیل احمد) نے اُلفت کی خاطر گھر بار، عزیز و اقربا، ملک، مذہب سب کو قربان گاہِ محبت کی نذر کر دیا مگر آرزو کی شمع جلائے جب وہ ارضِ پاک میں داخل ہوا تو پاسبانوں نے اس راہ نوردِ عشق کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کی اجازت نہ دی۔ چارہ سازوں نے چارہ سازی نہ کی۔ جس کو وہ اپنا سمجھ کر آیا تھا اس نے بھی ساتھ نہ دیا۔ بوٹا سنگھ کا دل خون ہوگیا۔ وہ شکستِ آرزو کی تاب نہ لاسکا۔ اس نے خودکشی کر لی۔

خودکشیاں اس سے پیشتر بھی ہوئی ہیں۔ عشق و محبت کی وادی میں یہ سخت مقام پہلے بھی آچکے ہیں لیکن اس سے بوٹا سنگھ کے کردار کی عظمت اور اس کی داستانِ اُلفت کی المناکی اور ابھر آتی ہے۔ بیش و کم اور سُود و زیاں کی اس کاروباری دنیا میں آج بھی ایسے "پراگندہ طبع" اور آشفتہ سر موجود ہیں جو مصلحتوں سے سودا کرنے کے قائل نہیں، جو محبت کی خاطر جیتے ہیں اور محبت کی خاطر مرتے ہیں — اخلاق کے محتسب بوٹا سنگھ کی خودکشی کو بزدلی کہیں گے، اس کی موت کو حرام قرار دیں گے مگر یہ وہ لوگ ہیں جو نہیں جانتے کہ انسان زندگی جیسی پیاری اور حسین شے کو کب

اور کتنی مشکل سے قربان کرتا ہے — بوٹا سنگھ ایک سیدھا سادہ دیہاتی تھا۔ نہ فلسفے سے واقف نہ سیاست سے آگاہ۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اسے اپنے بیوی بچوں سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسی محبت کے نشے میں سرشار زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار رہا تھا مگر عزت و ناموس کے ٹھیکے داروں کو اس کی یہ خوشی بہت بڑی لگی اور قانون کے خونی پنجوں نے اس کے پریم نگر کو ویران کر دیا۔

اغوا شدہ عورتوں کو ان کے عزیز و اقربا سے ملانا بڑا نیک کام ہے لیکن نیکی سے اگر بدی پیدا ہونے لگے اور بسے ہوئے گھر اُجڑنے لگیں تو پھر نیکی نیکی نہیں رہ جاتی — بوٹا سنگھ کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس نیکی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اس نیکی کی بدولت میرے بچے یتیم اور بے سہارا ہو گئے اور میری بیوی ہمیشہ کے لیے احساسِ جرم میں مبتلا ہو گئی۔

المیہ کبھی خواہش اور حقیقت کے تصادم سے بنتا ہے کبھی دو سچائیوں کے آپس کے ٹکراؤ سے۔ بوٹا سنگھ کی محبت کی سچائی اس کی بیوی کے اعزا و اقارب اور رسم و رواج سے ٹکرائی اور پاش پاش ہو گئی۔ اس تصادم میں حق پر کون تھا اور فتح کس کی ہوئی اس کا فیصلہ تاریخ بہت پہلے کر چکی ہے۔

انسان کی انسان سے محبت، رسم و رواج، رنگ و نسل سب سے بڑی صداقت ہے۔ جو لوگ خدا کو محبت، خدا کے رسولؐ کو محبت اور اسلام کو محبت تصور کرتے ہیں انسان سے محبت کرنا ان کا جزوِ ایمان ہوتا ہے کیونکہ جو انسان سے زیادہ انسان کے بنائے ہوئے رسم و رواج کو عزیز رکھتا ہے وہ نہ انسانیت کو برت سکتا ہے اور نہ فلسفۂ انسانیت کی روح کو پا سکتا ہے۔

۲۳ فروری ۱۹۵۸ء

پہلی سالگرہ

شوق کی رفعتیں آواز دے رہی ہیں کہ ترقی کے زینے جلد جلد طے کرتے رہو۔ ذوقِ سفر کا تقاضا ہے کہ آگے بڑھتے جاؤ۔ جس منزل سے گزر گئے اس کی سمت مڑ کر نہ دیکھو۔ زندگی کی برق رفتاری اتنی مہلت نہیں دیتی کہ کسی مقام پر رُک کر راہ کی صعوبتوں کا جائزہ لیا جائے، حوصلہ شکن حالات کا شکوہ کیا جائے، ارادے اور عمل میں جو فرق ہے اس کے اسباب بیان کیے جائیں، آرزو اور خونِ آرزو کی داستانِ کہن دہرائی جائے یا اپنی بے بضاعتی اور تہی مائیگی کا ماتم کیا جائے لیکن ہر فرد، جماعت اور ادارے کی زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جب اسے اپنے نصب العین اور طریقِ کار کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا اور اپنے ماضی سے سبق لینا پڑتا ہے۔

اس عالمِ حرکت و تغیر میں یوں تو ہر لحہ اپنی آغوش میں تجربات و حادثات کی ایک نئی دنیا لے کر نمودار ہوتا ہے لیکن "لیل و نہار" کی حیاتِ یک سالہ کے لمحات انسانی فکر و عمل کی تاریخ میں بڑے عہد آفریں ثابت ہوئے۔ سائنس کی عظمت و افضلیت یوں تو پہلے بھی مسلم تھی لیکن سائنسی ترقی کا رجحان ابھی تک افقی تھا، عمودی نہ تھا۔ کششِ ارض سے آزاد ہو کر اور فضائے بسیط میں اپنی قوتِ پرواز کے جوہر دکھا کر انسان نے ثابت کر دیا کہ اس کے مرحلۂ شوق کا آخری مقام کوئی نہیں۔ وہ ہر لحظہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کا متلاشی رہتا ہے۔

ایک طرف جراُتِ رندانہ کی یہ سرخوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ دوسری طرف ارضِ پاک کے آٹھ کروڑ باشندوں کی وہ مایوسیاں اور ہراسانیاں ہیں جنھوں نے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو مردہ

کر دیا ہے اور زندگی کی اُمنگیں ہم سے چھین لی ہیں۔ سیاست ہماری زندگی کا مرکز اور محور بن گئی ہے۔ سیاست بھی وہ جو درباری سازشوں اور محلاتی جوڑ توڑ سے عبارت ہے۔ وزیر آتے رہے، وزیر جاتے رہے لیکن گزشتہ ایک سال میں اہلِ جاہ وحشم کی مفاد پرستیوں میں کوئی فرق نہ آیا، نہ قوم پر سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا بار ہلکا ہوا اور جب قوم کی غالب اکثریت کے شب و روز مویشیوں کی مانند تلاشِ رزق میں بسر ہوں تو سائنس وطب، علم وفن، ادب اور شاعری کو فروغ کیوں کر ہو۔ ذوقِ پرواز کہاں سے آئے۔ آتشِ نمرود میں بے خطر کودنے کا حوصلہ کیسے پیدا ہو۔ ''لیل ونہار'' کی حیاتِ یک سالہ پر اسی پس منظر میں تبصرہ کرنا ہوگا۔

''لیل ونہار'' کی پہلی اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ ''لیل ونہار'' کے اجرا کا ایک مقصد اُس تشنگی کی تسکین ہے جو ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے ہم خود کئی بار محسوس کر چکے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک ایسا مرقع پیش کیا جائے جو اخبار بین طبقے کو بدیسی زبان کے جریدوں سے کسی حد تک بے نیاز کر دے اور پاکستان کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے میں مدد دے۔ ہم اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ تو قارئین ہم سے بہتر کر سکتے ہیں البتہ ''لیل ونہار'' نے ایک سال کی مختصر مدت میں جو حیرت انگیز مقبولیت حاصل کی ہے اگر اسے قارئین کے ذوقِ انتخاب کا معیار تسلیم کیا جائے تو پھر ہمیں یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہ ہوگا کہ ''لیل ونہار'' اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ اس ایک سال میں ''لیل ونہار'' پر بعض سخت مقام بھی آئے ہیں، کئی بار ہمارے صبر وتحمل کا امتحان بھی لیا گیا ہے۔ وہ کون سے الزام تھے جو بدخواہوں نے نہ تراشے، وہ کون سے حربے تھے جو قارئین کو ہم سے بدظن کرنے کی خاطر نہ استعمال کیے گئے لیکن یہ عنکبوتی جال نہ سچائیوں کو قید کر سکے اور نہ قارئین کو ہم سے بدگمان کر سکے۔ ہمارے سرپرستوں کا حلقہ بڑھتا ہی رہا اور آج ہم بڑی انکساری سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں کوئی اردو جریدہ اتنا مقبول نہیں جتنا ''لیل ونہار'' ہے۔

''لیل ونہار'' کا واحد مقصد ابنائے وطن کے ذہنی شعور اور ذوقِ جمال کو جلا دینا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ''لیل ونہار'' کی سیرت وصورت کا سارا حسن وطن کے دانشوروں، ادیبوں اور فن کاروں کا مرہونِ منت ہے، انھیں کے عملی تعاون نے ''لیل ونہار'' کو اردو صحافت کے میدان میں سرخرو کیا۔ چنانچہ گزشتہ ایک سال میں قارئین کی خدمت میں جو ۲۶۳ مصور فیچر، ۵۷ افسانے، ۶۱ طنزیہ مضامین، ۱۵۶ غزلیں اور نظمیں، ۱۳۹ کارٹون اور اسکیچ، ۴۰۵ مضامین، ۶۱ سہ رنگی تصاویر

بشمول سرورق اور ۲۵۳۸ سادہ تصویریں پیش کی گئیں وہ انھیں کی تخلیق تھیں۔ ان کے لکھنے والے چوٹی کے ادیب اور فن کار بھی تھے اور نو وارد نوجوان بھی۔ ادارہ ان سب دوستوں کا ممنون ہے۔

''لیل ونہار'' کی کتابت و طباعت کا طریقہ عام جریدوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کام میں بڑی دشواریاں ہیں کیونکہ ابھی ہمارے ملک میں چھاپے خانوں کو وہ جدید مشینیں میسر نہیں جن کے بغیر اعلیٰ طباعت ممکن نہیں اس لیے ہم لاہور کے خوش نویس حضرات اور پاکستان ٹائمز پریس کے کارکنوں کے بے حد ممنون ہیں جنھوں نے ''لیل ونہار'' کے صوری حسن کو فروغ دینے میں انتہائی محنت، محبت اور خلوص کا ثبوت دیا۔

ادارۂ ''لیل ونہار'' کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے البتہ ہماری مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہتر ہو اور پرچے کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے۔ قارئین کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو مفید مشورے ہم تک پہنچے ہیں ہم نے ان کو قبول کرنے سے بھی کبھی گریز نہیں کیا اور جن احباب نے نقائص کی نشان دہی فرمائی ہم نے ان کی نظرِ التفات کو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قارئین کی یہ دلچسپیاں بدستور قائم رہیں گی اور ''لیل ونہار'' کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء

دوسرا حصہ......ایوبی مارشل لا

(۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء......۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء)

صفحہ نمبر ۲۴۲ سے ۲۷۶ تک

آئین سازی

آئین سازی کا مسئلہ

ہمارے ملک میں آئین کو منسوخ ہوئے آہستہ آہستہ پانچ ماہ سے زیادہ مدت ہو چکی ہے۔ اس درمیان نئی حکومت کے ترجمانوں نے ایک سے زائد بار قوم کو یہ یقین دلایا ہے کہ جمہوریت کو بحال کرنے اور جمہوری آئین کو وضع کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی۔ حال ہی میں وزیرِ خارجہ مسٹر منظور قادر نے مشرقی پاکستان اور کراچی میں آئین کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے یہ امید اور بھی قوی ہوتی ہے کہ حکومت آئین سازی کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور اربابِ اختیار عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے خواہش مند بھی ہیں۔ چنانچہ مسٹر منظور قادر کے حالیہ دورے کا مقصد بھی یہی تھا اور اب وہ اسی غرض سے مغربی پاکستان کا بھی دورہ کریں گے۔ مسٹر منظور قادر نے ایک بار پھر ہمیں یقین دلایا ہے کہ ''آئین وضع کرنے میں ایک لمحے کی بھی غیر ضروری تاخیر نہ ہوگی'' البتہ اس سے پہلے لوگوں کی از سرِ نو تعلیم کا کام مکمل کرنا ہوگا اور ملک کے جہاز کو سطحِ آب پر لانا ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''آئین سازی میں عجلت کرنا اور ایسی صورتِ حالات پیدا کر دینا جیسی پاکستان میں ۷ اکتوبر سے پیشتر تھی'' غلط ہوگا۔

وزیرِ خارجہ کی اس رائے سے ہر شخص اتفاق کرے گا کہ ہمیں آئین سازی میں عجلت کی بجائے احتیاط سے کام لینا چاہیے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۷ اکتوبر سے پیشتر یہاں جو

ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوگئے تھے ان میں آئین بنانے یا نافذ کرنے میں عجلت کو دخل نہ تھا بلکہ خرابی کی اصل وجہ یہی تھی کہ آئین سازی میں پہلے تو جان بوجھ کر دس سال تاخیر کی گئی اور پھر بہ خرابی بسیار جب آئین بن گیا تو دو سال تک اس کو نافذ کرنے سے بلاوجہ گریز کیا گیا۔ اگر پاکستان بننے کے فوراً بعد ملک میں جمہوریت قائم کردی جاتی تو شاید لوگوں کو اُن تلخیوں اور اذیتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو اکتوبر سے پیشتر ان کی تقدیر بن گئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے جمہوری حقوق استعمال کرنے کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ ملک میں عام انتخابات ۱۹۴۶ء میں پاکستان بننے سے پیشتر ہوئے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ فقط چودہ فیصدی باشندوں کو رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر ہماری پہلی آئین ساز اسمبلی وجود میں آئی۔ اسے پاکستان کے باشندوں نے منتخب نہیں کیا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ اسمبلی بھی توڑ دی گئی اور نوبت مقدمے بازی تک پہنچی۔ تب ایک نئی آئین ساز اسمبلی بنائی گئی جو شاید پہلی اسمبلی سے بھی زیادہ غیر نمائندہ تھی کیونکہ اس کا بالواسطہ انتخاب صوبائی اسمبلیوں اور دوسرے غیر نمائندہ اداروں نے کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ صوبائی اسمبلیاں منتخب شدہ تھیں مگر صوبائی انتخابات میں جو دھاندلیاں ہوئیں ان سے کون واقف نہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہمارے ملک میں اب تک جمہوریت کا تجربہ دیانت داری اور خلوص سے کبھی ہوا ہی نہیں اس لیے جمہوریت کے ناکام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک کا نیا جمہوری آئین کون بنائے اور آئین سازی کے کام میں عوام کی مرضی اور ان کے مشورے کو کس طرح شامل کیا جائے۔ مسٹر منظور قادر کا خیال ہے کہ ''چند معتبر اشخاص کو نامزد کیا جائے اور یہ لوگ نمائندگی کے طریقے وضع کریں'' کیونکہ ان کی رائے میں ایمان دار لوگوں کی نامزدگی انتخاب سے بہتر ہے۔ مسٹر منظور قادر بڑے لائق اور ایمان دار وکیل ہیں۔ وہ آئین کے قوانین سے بھی بخوبی واقف ہیں اس لیے ان کی طرف سے نمائندوں کے انتخاب کے بجائے ان کی نامزدگی کی وکالت حیرت انگیز ہے۔ انفرادی لیاقت یا خدمت کا اعتراف نامزدگی سے ہوسکتا ہے مگر قوم کے اجتماعی تقاضوں کی تشفی وہی لوگ بہ طریقِ احسن کرسکتے ہیں جن کو قوم نے اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔ آئین سازی کا فرض عوام کے چنے ہوئے نمائندے ہی ادا کرسکتے ہیں کیونکہ انہیں عوام کے مسائل اور ان کی خواہشات و جذبات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ جمہوری آئین فقط جمہوری ذریعے ہی سے بن سکتا ہے۔

اب کہ حکومت آئین سازی کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کرنے کی خواہش مند

ہے یہ گزارش بے محل نہ ہوگی کہ ایک بار پھر یہ یقین دلا دیا جائے کہ جمہوری نظام جہاں تک جلد ممکن ہوا ملک میں قائم کر دیا جائے گا اور اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی۔ آئین کے بارے میں بعض غیر سرکاری حلقوں میں قیاس آرائیاں بھی ہوئی ہیں مثلاً یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہاں امریکی طرز کا آئین نافذ ہوگا جس میں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ خود مختار عناصرِ مملکت ہوتے ہیں اور صدر جمہوریہ کو عوام منتخب کرتے ہیں۔ فرانس کے نئے آئین کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس میں رائے دہی کا حق زینہ بہ زینہ محدود ہوتا جاتا ہے۔ وفاقی کے بجائے وحدانی طرزِ حکومت کی تجویز بھی پیش ہوئی ہے لیکن ان باتوں کا فیصلہ تو آئین ساز اسمبلی ہی کرے گی۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ عوام کے حق رائے دہی کو تعلیم یا املاک کا پابند بنا دیا جائے۔ حقِ رائے دہی کو محدود کرنے کی تجویز نہ صرف پاکستان کے بنیادی تصور اور قائدِ اعظم کے واضح فرمودات کی نفی کرتی ہے بلکہ پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کو ترقی اور خوشحالی کے مواقع سے محروم کرتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ملک کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والے وہی حضرات تھے جن کو تعلیم یافتہ ہونے کا گھمنڈ تھا۔ آخر ہمارے سابق وزرا جاہل تو نہ تھے اور وہ دولت مند حضرات ہی تو تھے جنہوں نے اقربا پروری، رشوت ستانی، بلیک مارکیٹ، لائسنسوں اور پرمٹوں کی خرید و فروخت اور سمگلنگ کو فروغ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پڑھ ہونا اور ضمیر فروش ہونا یا غریب ہونا اور بد دیانت ہونا الگ الگ باتیں ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عوام کو اگر غیر مشروط حقِ رائے دہی ملا اور ایسے حالات پیدا کر دیے گئے جن میں اس حق کو آزادی سے استعمال کیا جا سکے تو پھر اس کا قوی امکان ہے کہ وہ ملک کے لائق، ایمان دار، محبِ وطن اور روشن ضمیر اشخاص ہی کو اسمبلیوں میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجیں۔ مناسب یہی ہے کہ آئین سازی کا کام بھی عوام کے منتخب شدہ نمائندوں کے سپرد ہو اور حق رائے دہی پر کوئی شرط اور پابندی نہ لگائی جائے۔ انتخاب میں غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ہر جمہوری ملک میں ہوتی ہیں مگر ان غلطیوں کی تلافی دوسرے انتخاب میں کی جا سکتی ہے لیکن غیر جمہوری نظام میں جہاں نامزدگی کا اصول رائج ہو اس کی گنجائش کم ہوتی ہے۔

۸ مارچ ۱۹۵۹ء

بلدیاتی اداروں کا انتخاب

ہر محبِ وطن پاکستانی کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ حکومت عنقریب بلدیاتی اداروں کو بحال کرنے والی ہے اور نمائندوں کے انتخاب کے طریقے پر غور کیا جا رہا ہے۔ یہ مژدہ وزیرِ خارجہ مسٹر منظور قادر نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کے موقع پر سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ لوکل باڈیز کا انتخاب نیا آئین وضع کرنے سے پیشتر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جوں ہی طریقۂ انتخاب کا فیصلہ ہوگیا بلدیاتی اداروں کا انتخاب عمل میں آجائے گا۔

مہذب ملکوں میں بلدیاتی اداروں کو عام شہریوں کی روزمرہ کی زندگی میں قریب قریب وہی اہمیت حاصل ہے جو مجالسِ قانون ساز کو ہے۔ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اختیارات نہایت وسیع ہیں۔ لوگ ان اداروں کا احترام کرتے ہیں اور یہ ادارے بھی لوگوں کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال کرتے ہیں۔ لندن، نیویارک اور پیرس جیسے شہروں کی کارپوریشن تو حقیقت میں خودمختار ریاستیں ہیں جو اپنے حدود میں سیاہ و سفید کی مالک ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بلدیاتی اداروں کو یہ مرتبہ اور اختیار کبھی نصیب نہ ہوا۔ انہیں جمہوری انداز میں ترقی کرنے کا نہ تو کبھی موقع ملا اور نہ کبھی ان کو ایسی ذمہ داریاں سونپی گئیں جن سے ان کے اقتدار اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا۔ انگریزوں نے یہ ادارے لوگوں کو جمہوریت کی تعلیم دینے اور نظم و نسق کے رموز سے آگاہ کرنے کی خاطر نہیں بنائے تھے بلکہ مقصد یہ تھا کہ لوگ ان بے جان کھلونوں سے بہلے رہیں اور اپنے جمہوری حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔ قیامِ پاکستان کے بعد امید

بندھی تھی کہ بلدیاتی ادارے ہمارے ملک میں بھی وہی خدمات انجام دیں گے جو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ان اداروں سے لیا جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ خود غرض عناصر کے شوقِ ناوک افگنی نے بلدیاتی اداروں کو بھی شکار کر لیا اور یہ مفید ادارے بھی ہمارے آزمودہ کار سیاست دانوں کی ہوسناکیوں کی آماجگاہ بن گئے۔ ان کو جمہوری انداز میں چلانا اور ان کے اختیارات کو وسیع کرنا تو درکنار جو آیا اس نے ان اداروں کو اپنی جاگیر بنانے کی کوشش کی چنانچہ مغربی پاکستان میں درجنوں ایسے بلدیاتی ادارے ہیں جہاں پندرہ پندرہ سال سے انتخاب نہیں ہوا ہے کیونکہ برسر اقتدار گروہ کو یہ ڈر تھا کہ مبادا مخالف گروہ الیکشن میں کامیاب ہو جائے۔ اگر کہیں الیکشن ہوا بھی تو حریفوں کو کرسی سے گرانے کی خاطر۔ اس رسّہ کشی میں کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ بلدیاتی اداروں کی اصلاح و ترقی بھی ہونی چاہیے یا ان کے ذریعے لوگوں کی خدمت بھی کرنی چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگ بلدیاتی اداروں سے اتنے بدظن ہو گئے کہ ان سے وابستہ ہر شخص کو بد دیانت، بے ایمان اور نا اہل سمجھا جانے لگا اور جب اکتوبر میں نئی حکومت نے تمام بلدیاتی اداروں کو توڑ دیا تو کسی کو بھی ان نام نہاد جمہوری اداروں سے ہمدردی نہ ہوئی۔

لیکن بلدیاتی ادارے اگر اپنے فرائض پورے نہ کر سکے تو اس میں ان کا قصور نہ تھا اور نہ یہ خطا جمہوریت کی تھی بلکہ خطا کار وہ حضرات تھے جنہوں نے جمہوریت کو چھوٹے پیمانے پر بھی پنپنے نہ دیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ نئی حکومت بھی مسئلے کے اس پہلو سے واقف ہے چنانچہ اس نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں سب سے پہلے بلدیاتی اداروں ہی کو منتخب کیا ہے کیونکہ حکومت جانتی ہے کہ اچھی حکومت نمائندہ حکومت کا بدل نہیں ہو سکتی البتہ جہاں تک بلدیاتی اداروں کے طریقہء انتخاب کا تعلق ہے حکومت ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ مسٹر منظور قادر کی ذاتی رائے شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ فقط تعلیم یافتہ لوگوں ہی کو رائے دینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس تجویز میں جو نقص ہے اس پر ہم گزشتہ ہفتہ آئین کے سلسلے میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ یہاں فقط اتنا عرض کریں گے کہ اسمبلیوں کی مانند بلدیاتی اداروں کو بدنام اور رسوا کرنے والے ان پڑھ عوام نہ تھے بلکہ وہی سیاست دان تھے جن کو ہم تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔ جس طرح ہر تعلیم یافتہ یا دولت مند آدمی فرض شناس اور ایمان دار نہیں ہوتا اسی طرح ہر ان پڑھ آدمی بھی عقل و ہوش سے عاری نہیں ہوتا بشرطیکہ اسے اپنی عقل اور سمجھ کو آزادی سے استعمال کرنے کا موقع ملے۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہوگی کہ بلدیاتی انتخاب بھی عام بالغوں کے حقِ رائے دہی کے اصول پر ہوں۔ موجودہ

حالات میں ہمیں پورا یقین ہے کہ اَن پڑھ اور تعلیم یافتہ دونوں کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہوگا اور وہ ایمان دار، لائق اور فرض شناس امیدواروں ہی کو منتخب کریں گے۔

۱۵ مارچ ۱۹۵۹ء

آئین سازی کا صحیح راستہ

جمہوری آئین کی تدوین کے حق میں اعلانات موجودہ حکومت کے ترجمانوں کی وساطت سے بھی متعدد بار منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس باب میں تازہ ترین ارشاد صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خاں کا ہے۔ ایک حالیہ نشری تقریر میں انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ آئین کے بغیر پاکستانی عوام اپنے اعلیٰ قومی مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتے اور مناسب وقت کے اندر نمائندہ طرز کی حکومت کا احیا نہایت ضروری ہے۔ یہ اعلان اور سابقہ اعلانات نہایت خوش آئند ہیں۔

جمہوری آئین اور جمہور کی نمائندہ حکومت وہ منزل ہے جس تک انسان صدیوں کی کشاکش، غور و فکر اور جدوجہد کے بعد پہنچا ہے اور یہ نسل اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس نے یہ منزل ورثے میں پائی ہے اور اسے مہذب نظامِ حکومت کا ایک معقول ڈھانچہ ملا ہے۔ ہر ہوش مند اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ کوئی بھی دوسرا نظام بدترین جمہوریت سے بھی بہتر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جمہوریت اپنی اصلاح کے دروازے کھلے رکھتی ہے اور جمہوری عمل بذاتِ خود اصلاح اور تطہیر کا ایک ذریعہ ہے۔ ہمارے ہاں اگر گزشتہ گیارہ برس میں جمہوریت کا یہ اصلاحی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تو اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ مفاد پرست حکمرانوں نے جمہوری عمل کو ہی معطل رکھا اور گیارہ برس میں ایک مرتبہ بھی ملک گیر انتخابات منعقد کرنے کا موقع نہیں آیا۔ انتخابات جمہوریت کی بنیاد یا بنیادی جزو ہیں۔ جب ان کی راہ ہی روک دی گئی اور اس کے ساتھ سابق حکمرانوں نے آزادیِ فکر و خیال پر بھی پہرے بٹھائے رکھے تو مایوس کن اور حوصلہ شکن نتائج کے لیے جمہوریت کو

ذمہ دار قرار دینا انصاف نہیں ہے؟ اہلِ نظر اور خود موجودہ مقتدر اصحاب سے بھی مخفی نہیں ہے کہ ناکامیوں کی ذمہ داری کس پر ہے؟

دنیا کی ہر متمدن اور مہذب قوم کی طرح اہلِ پاکستان بھی مکمل جمہوریت کے مستحق ہیں اور موجودہ قیادت کو بھی شروع دن سے اصرار ہے کہ وہ جمہوریت کو اپنی منزل مانتی ہے اور اسی کی خاطر حالات کو سازگار بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ اصول کی حد تک نئے رہنماؤں کے جمہوری عزائم سے ہر ایک کو اتفاق ہے مگر طریقۂ کار میں اختلاف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آئین کی ترتیب کے سلسلے میں جنابِ صدر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ سابق حکومتوں کی پیدا کردہ خرابیاں جب یکسر دور ہوتی ہوئی نظر آئیں گی اور موجودہ اہم اصلاحات نافذ ہونے لگیں گی تو اس وقت چند عالی دماغ افراد پر مشتمل ایک آئینی کمیشن نامزد کر دیا جائے گا جو آئین کا مسودہ مرتب کرے گا۔ اس مسودے پر مناسب طریقے سے عوام کی رائے معلوم کی جائے گی اور (عوام کی توثیق کے بعد) اسے نافذ کیا جائے گا۔ یہاں اختلاف کا محل اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کی اساس جمہور کی رائے پر ہوتی ہے۔ مختلف حکومتی اور اقتصادی شعبوں میں اصلاحات کرنے کے لیے بلاشبہ کمیشن قائم کیے جاتے رہے ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں لیکن آئین کا تعلق کسی ایک شعبے یا چند شعبوں سے نہیں بلکہ آئین تو پورے نظامِ مملکت کی اساس ہوتا ہے جس کے تحت انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ بلکہ پورے معاشرے کی جملہ قوتوں کا دائرۂ عمل متعین ہوتا ہے اور جو چند برسوں کے لیے نہیں بلکہ صدیوں کے لیے مرتب ہوتا ہے اور جس کو مشعلِ راہ بنا کر قوم مستقبل کی طرف جادہ پیما ہوتی ہے۔

آئین کی ترتیب کا مسئلہ اگر ایک کمیشن کے تقرر اور چند افراد کی نامزدگی سے حل ہو سکتا تو آج سے بہت پہلے قائدِ اعظم اور قائدِ ملت کی زندگی میں حل ہو چکا ہوتا بلکہ آئین کی ساخت میں قائدِ اعظم کی رائے کسی بھی عالی دماغ سے کم معتبر نہ تھی لیکن ہر دو قائدین نے عجلت کی خاطر مسلمہ جمہوری راہ سے انحراف نہ کیا۔ وقتی ضرورت کے تحت انہوں نے ۱۹۳۵ء کے آئین میں ترامیم کر لیں (اہم ترین ترمیم عوام کے لیے بالغ حق رائے دہی کا حصول تھی) لیکن جمہوری آئین کے لیے کوئی کمیشن نامزد کرنا گوارا نہ کیا، اس کا بنیادی سبب اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آئینی روایات بھی آئین ہی کی طرح اہم ہیں اور آئین سازی کے ساتھ ہی آئینی روایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آئین سازی کا کام جمہوری اصولوں کے مطابق مکمل نہ ہو تو پہلا قدم غلط پڑے گا

اور یہ ناقص روایت صحت مند آئینی روایت کو بھی مجروح کرتی رہے گی۔ موجودہ حالات میں اس سوال کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ عوام نے اگر نامزد آئینی کمیشن کا تیار کیا ہوا آئین قبول نہ کیا تو آئندہ صورتِ حال کیا ہوگی یا وقتی مصالح کے تحت تسلیم کرلیا تو مستقبل میں اِمکانی حالات کیا ہوں گے؟

ہر نوع کے خدشات سے محفوظ رہنے کا واحد معقول اور جمہوری طریقہ یہ ہے کہ آئین مرتب کرنے کا کام ایک نمائندہ خود مختار اسمبلی کے سپرد کیا جائے اور اس اسمبلی کے براہِ راست انتخاب کے لیے ابھی سے انتظامات شروع کر دیے جائیں۔ موجودہ حکومت کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کے ذرائع رکھتی ہے اور اگر وہ چاہے تو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کو بلا خوف وخطر اپنے حقیقی نمائندے منتخب کرنے کا موقع دے سکتی ہے۔ اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوگا کہ آئین کی ترتیب اور تیاری کا کام صحیح طریقے پر اور ستھرے ماحول میں ہو سکے گا بلکہ اس سے عوام کی جمہوری تربیت ہوگی اور قوم کی اجتماعی سیاسی نشو ونما کا سلسلہ از سرِ نو قائم ہو جائے گا جو سابق مقتدر افراد کی ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ یہ تو معمولی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ جمہوری انتخابات کے عمل ہی میں تو قومیں تجربہ کار اور پختہ کار ہوتی ہیں، صحت مند جمہوری سیاست کی بنیادیں رکھی جاسکتی ہیں اور عوام میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے جو کسی بھی قوم کی سربلندی کے لیے لازمی ہے!

۲۹ مارچ ۱۹۵۹ء

معاشی اور سماجی اصلاحات

زرعی اصلاحات

۲۴ جنوری کی سرد و سیاہ رات اب کے اس انداز سے آئی کہ لاکھوں کروڑوں ابنائے وطن کے غم خانے امید کے چراغوں سے روشن ہوگئے۔ مغربی پاکستان کے کاشتکاروں نے جن کی زندگی عبارت تھی ذلت، مفلسی اور بے آبروئی سے، صدرِ مملکت کا پیغام سنا جس میں معاشرتی انصاف اور معاشرتی خوش حالی کی بشارت دی گئی تھی۔ یوں تو ہمارے سابق آقاؤں نے قوم کو خالی خولی بشارت دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا مگر موجودہ حکومت اور اس کے پیش روؤں میں یہ فرق ہے کہ ان کے وعدے پورے نہ ہوئے اور جنرل ایوب خاں نے تین ماہ کی مختصر مدت میں اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ انہوں نے زرعی اصلاحات کے اعلان ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فوراً ایک کمیشن بھی مقرر کر دیا جو اکتوبر تک ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنائے گا تاکہ ربیع کی فصل بونے تک کاشتکار زمینوں کے مالک بن چکے ہوں۔

زرعی اصلاحات کی اہمیت اور افادیت پر ہم اس سے پیشتر متعدد بار اظہارِ خیال کر چکے ہیں کیونکہ ہماری رائے میں زرعی اصلاحات نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیا اور افریقہ کے تمام پسماندہ ملکوں کا سب سے ضروری مسئلہ ہے اور اس صدیوں پرانے اور فرسودہ زرعی نظام کو بدلے بغیر ملک نہ صحیح معنی میں آزاد ہوسکتا ہے نہ یہاں جمہوری قدریں فروغ پاسکتی ہیں نہ پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ عام لوگوں کا معیارِ زندگی اونچا ہوسکتا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ زرعی کمیشن نے وقت

کے اس تقاضے کو محسوس کر لیا اور اصلاحات کی طرح ڈال دی۔

زرعی اصلاحات کا ملک کے ہر گوشے میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہے البتہ زرعی معیشت کے ماہرین نے جن کو ہم جذباتی یا انتہا پسند نہیں کہہ سکتے — یہ رائے ظاہر کی ہے کہ زرعی اصلاحات کافی نرم ہیں اور بڑے زمینداروں کو جو مراعات دی گئی ہیں وہ ان کے مستحق نہ تھے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ ملکیت کی انتہائی حد (پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار بارانی) بہت زیادہ ہے حالانکہ خود بڑے زمینداروں کے مشورے پر پہلے پنج سالہ منصوبے میں انتہائی حد تین سو ایکڑ نہری یا ساڑھے چار سو ایکڑ بارانی مقرر ہوئی تھی۔ مزارعوں کی بے دخلی کا جو حق زمینداروں کو دیا گیا ہے اس پر بھی اعتراض ہوسکتا ہے حالانکہ اب زمینداروں کے لیے اپنے مزارعوں کو بے سبب بے دخل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ بٹائی کی شرح بھی ہنوز مبہم ہے کیونکہ ''مقامی رواج'' کی طنابیں خاصی طویل ہوسکتی ہیں۔ ورثا اور رشتے داروں کے نام انتقالِ اراضی کے سلسلے میں مالکوں کو جو رعایتیں دی گئی ہیں ان میں بھی اصلاحات کی گنجائش موجود ہے مگر یہ خامیاں بڑی آسانی سے دور ہوسکتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ زرعی کمیشن بڑے زمینداروں کے حدود ملکیت متعین کرتے وقت ان کاغذی کارروائیوں کا پورا پورا محاسبہ کرے گا جو قیامِ پاکستان سے اب تک ورثا اور رشتے داروں کے نام انتقالِ اراضی کے سلسلے میں ہوئی ہیں تاکہ زرعی اصلاحات کا اصل مقصد فوت نہ ہونے پائے۔ اسی طرح بٹائی کی شرح بھی غیر مبہم الفاظ میں مقرر کر دی جائے اور فریقین کے حقوق اور فرائض پوری تفصیل سے بیان کر دیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ بہرحال یہ باتیں فروعی ہیں اور ان سے زرعی اصلاح کے تاریخی رول اور کردار پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔

یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ جاگیری نظام کی یک قلم تنسیخ اور زمینداری نظام کی اصلاح کا اثر ہمارے سماجی رشتوں پر کیا ہوگا اور ہمارے معاشرتی نظام — بالخصوص دیہی معاشرہ — میں ان اصلاحات کی وجہ سے کیا ذہنی اور مادّی تغیرات رونما ہوں گے البتہ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اب ہم تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ مانا کہ زمیندار اب بھی مزارعوں کی محنت سے مستفید ہوں گے مگر نئے دور میں ان کو وہ سیاسی اثر و اقتدار حاصل نہ ہوگا جس کی بدولت یہ گروہ برسوں ہماری تقدیر سے کھیلتا رہا، ہماری معیشت کو تباہ کرتا رہا، ہماری اخلاقی قدروں کو پامال کرتا رہا۔ اس نئے دور میں لاکھوں مزارعے اور ہاری زمینوں کے مالک بنیں گے۔ ان کا رتبہ بلند ہوگا، ان میں خود اعتمادی آئے گی، عزتِ نفس کا جذبہ ابھرے گا اس سے ملک کی

پیداوار ہی میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ قوم کی تقدیر بھی بدلے گی۔ ان کو ذمہ دار شہریوں کی سی زندگی گزارنی ہوگی۔ اسی طرح کاشتکاروں کو بھی نئے ڈھنگ سے سوچنا اور عمل کرنا ہوگا اور جب ملک میں جمہوری ادارے دوبارہ قائم ہوں گے تو وہ حالات بدل چکے ہوں گے جن میں کاشتکاروں کے حق انتخاب کو دھن اور دھونس سے خریدا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زرعی اصلاحات نے جمہوریت کے قیام و بقا کے لیے راہیں ہموار کر دی ہیں۔

زرعی اصلاحات نے دُور از کار بحثوں اور نزاعوں کے بھی در بند کر دیے ہیں اور اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ ملکیتِ زمین کے قوانین مقدس اور ازلی ابدی نہیں بلکہ قومی ضرورت کے مطابق ان قوانین میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ زرعی اصلاحات کے مخالفین نے گیارہ سال میں وہ کون سا حربہ تھا جو استعمال نہ کیا ہو۔ کبھی ذاتی ملکیت کے تقدس کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی زرعی اصلاحات کو شرع کے منافی بتایا گیا، کبھی معاشی توازن کے بگڑ جانے کا خوف ظاہر کیا گیا اور کبھی پیداوار گر جانے کا۔ شکر ہے کہ یہ ساری حیلہ سازیاں اور عذر تراشیاں تارِ عنکبوت کی مانند پارہ پارہ ہوگئیں۔

زرعی کمیشن اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا بھی علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کام کی راہ میں کتنی رکاوٹیں پیدا کی جاسکتی ہیں اور کس کس طرح ان اصلاحات کو ناکام بنایا جاسکتا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سرکاری عملے میں جس کے سپرد زرعی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ہو کام کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا احساس پیدا کیا جائے اور دیہی آبادی کو تعاون پر آمادہ کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں تاکہ کوئی خود غرض عنصر زرعی اصلاحات میں رخنہ اندازی کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔

یکم فروری ۱۹۵۹ء

خاندانی منصوبہ بندی

خاندانی منصوبہ بندی کا تصور ہمارے ملک میں قدرے نیا ہے۔ تعلیم کی کمی اور توہمات کی فراوانی کے باعث بعض لوگ اس سے بدظن بھی ہیں کیونکہ وہ اسے ضبطِ تولید کے ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ ایک گروہ خاندانی منصوبہ بندی کو مذہب کے منافی سمجھتا ہے حالانکہ صدرِ مملکت کے بقول ''کوئی ایسا مذہب نہیں جو انسان کی عُسرت اور فلاکت کی تلقین کرتا ہو۔'' خاندانی منصوبہ بندی سے مراد فقط یہ ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلایا جائے۔ نسلِ انسانی میں اضافہ کرنے سے پیشتر اس بات کا اطمینان کرلیا جائے کہ والدین تندرست اولاد پیدا کرنے کے اہل ہیں یا نہیں، عورت کی صحت تولید کا بار اٹھانے کی متحمل ہے یا نہیں اور بچے کی پرورش، تربیت، خوراک، لباس اور تعلیم کا مناسب انتظام موجود ہے یا نہیں۔ اگر والدین آسودہ حال اور تندرست ہیں تو انہیں افزائشِ نسل سے روکنا ضروری نہیں البتہ وہ دنیاوی یا جسمانی نعمتوں سے محروم ہیں تو انہیں ضبطِ تولید کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ بچہ فقط باپ کی اولاد نہیں ہوتا وہ معاشرے کا ایک فرد بھی ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ آبادی میں مزید اضافے کی تاب نہیں لاسکتا تو والدین کو معاشرے کے مفاد کا احترام کرنا پڑے گا۔ انہیں اولاد پیدا کرکے اپنی اور معاشرے کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کے تحت ان دنوں مختلف ملکوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی ایک تحریک چلائی جارہی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ معقول تجویز ہمارے ملک میں بھی ہمہ گیر

تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے مگر مقامِ مسرت ہے کہ ملک کے باشعور طبقے میں اس مسئلے سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اور خود خواتین اس کام میں پیش پیش ہیں۔ سرکاری حلقے بھی اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں چنانچہ ۱۹۵۷ء کے قومی بجٹ میں حکومت نے پاکستان فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کو پانچ لاکھ کی گرانٹ بھی دی تھی۔ حال ہی میں خاندانی منصوبہ بندی سے دلچسپی رکھنے والے نو ملکوں کے ۴۵ نمائندوں کا ایک سیمینار (تربیتی اجتماع) لاہور میں ہوا تو اس کا افتتاح مسٹر اختر حسین گورنر مغربی پاکستان نے کیا اور صدرِ مملکت جنرل ایوب خاں نے اس سیمینار کو مخاطب فرمایا۔

صدرِ مملکت نے حکومت کی امداد اور سرپرستی کا وعدہ فرماتے ہوئے کارکنانِ انجمن کو چند نہایت مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھی سے اچھی اور مفید سے مفید تحریک بھی اگر ''اوپر'' سے شروع کی جائے اور اسے عوام کا اعتماد و تعاون حاصل نہ ہو تو وہ ناکام ہو جاتی ہے۔ صدرِ مملکت کی رائے میں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت سب سے زیادہ دیہات اور شہروں کے غریب طبقے کو ہے لہٰذا توجہ ادھر ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اتنا وسیع ہے کہ جب تک حکومت براہِ راست اس کو اپنی نگرانی میں نہیں لیتی اور باقاعدہ پروگرام نہیں بنتا کوئی پرائیویٹ ادارہ تنہا اس فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ صدرِ مملکت نے دیہی امداد کے سرکاری اداروں کو بھی خاندانی منصوبہ بندی کے کام میں ہاتھ بٹانے کی ہدایت کی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو خاندانی منصوبہ بندی کا تعلق آبادی کی کثرت اور اضافہ نسل کی رفتار سے اتنا نہیں ہے جتنا عام لوگوں کے معیارِ زندگی اور وسائلِ روزگار سے ہے۔ گنجان سے گنجان ملک بھی اگر اپنے وسائلِ دولت کو ڈھنگ سے استعمال کرے تو خوش حال ہوسکتا ہے۔ مثلاً انگلستان کی فی مربع میل آبادی ۷۰۳ ہے، بلجیئم کی ۷۰۲، ہالینڈ کی ۹۳۹، جرمنی کی ۵۱۲، جاپان کی ۴۹۲ اور اٹلی کی ۴۰۱۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کی فی مربع میل آبادی فقط ۲۲۶ ہے اور مغربی پاکستان میں تو آبادی کا اوسط صرف ۱۰۹ فی مربع میل ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں اضافہ، آبادی کی سالانہ شرح بھی جاپان، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ سے بھی کم ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ ہماری پسماندگی کا باعث آبادی کی کثرت ہے۔ مناسب ہوگا اگر خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کو کثرتِ آبادی کے نکتہ نظر سے نہ دیکھا جائے کیونکہ اس سے خلط مبحث کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ دراصل ہمارے ملک میں افرادِ خاندان کی تعداد عام طور پر زیادہ نہیں ہوتی

البتہ مصیبت یہ ہے کہ کمانے والا ایک ہوتا ہے اور کھانے والے درجنوں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اگر ہمیں بھی ان ملکوں کی مانند روزگار اور دولت پیدا کرنے کی دوسری سہولتیں میسر آ جائیں تو تین چار بچوں کی تعلیم وتربیت ایسا بوجھ تو نہیں جو اٹھایا نہ جا سکے۔

ہمیں امید ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مسئلہ کے اس پہلو کو نظر انداز نہ کریں گے۔

یکم مارچ ۱۹۵۹ء

عبوری دور کا بجٹ

ہمارا مالی سال دستور کے مطابق اب تک یکم اپریل سے شروع ہوتا تھا اور ۳۱ مارچ کو ختم ہوتا تھا۔ چنانچہ وزیرِ خزانہ عام طور سے مارچ کے پہلے ہفتے میں نئے سال کا بجٹ قومی اسمبلی میں پیش کرتے تھے۔ جہاں بجٹ کی ایک ایک مد پر کئی کئی دن تک بحثیں ہوتی تھیں مگر نئی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سے ہمارا مالی سال اپریل کے بجائے جولائی میں شروع ہوگا اور اس وقت پورے سال کا بجٹ پیش کیا جائے گا لہٰذا وزیرِ خزانہ نے ۳۱ مارچ کو جو بجٹ پیش کیا ہے وہ فقط آئندہ تین ماہ کے لیے ہے۔ ان تین مہینوں میں حکومت نے اپنی آمدنی کا تخمینہ ۳۵ کروڑ ۱۹ لاکھ روپیہ کیا ہے۔ آمدنی کی سب سے بڑی مد چنگی سے آئے گی (۱۰ کروڑ ۱۵ لاکھ) اس کے بعد انکم ٹیکس کا نمبر آتا ہے (۷ کروڑ ۴۶ لاکھ) سیلز ٹیکس اور بالواسطہ محصولات (ایکسائز) سے تقریباً آٹھ کروڑ روپیہ وصول ہوگا۔ مصارف میں سب سے بڑی مد دفاع کی ہے (۲۰ کروڑ ۴۴ لاکھ) اس کے بعد نظم ونسق کا نمبر آتا ہے (۷ کروڑ ۹۳ لاکھ) ترقیاتی بجٹ اس کے علاوہ ہے جس کا تخمینہ ۳۷ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ ہے۔

اس عبوری بجٹ پر تفصیل سے بحث نہیں کی جاسکتی البتہ حکومت نے یہ بجٹ جس اقتصادی اصول کے تحت مرتب کیا ہے اس سے حکومت کی مالی اور صنعتی پالیسی کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ حکومت کا بنیادی مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی صنعتی اور زرعی پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے اور اس پیداوار کا زیادہ سے زیادہ حصہ برآمد کیا جائے تاکہ ہم ضروری اشیا در

آمد کر سکیں۔ صنعتی پیداوار بڑھانے کے لیے صنعت کو فروغ دینا ہوگا۔ صنعت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ لوگ صنعتوں میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں۔ سرمایہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے پاس زیادہ سے زیادہ سرمایہ بچے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر وزیرِ خزانہ نے اونچے طبقے اور درمیانہ طبقے کو چند رعایتیں اور سہولتیں دی ہیں۔ براہِ راست محصولات میں تخفیف کی ہے اور نئے صنعتی اداروں کو آئندہ دو سال کے لیے محصول سے بری کر دیا ہے۔

دولت مندوں اور درمیانہ طبقے کے لوگوں کو (جن کی آمدنی پانچ ہزار روپیہ سال سے زیادہ ہے) جو رعایتیں دی گئی ہیں ان سے حکومت کی توقعات پوری ہوں گی یا نہیں اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ملک کی غالب اکثریت کی آمدنی ہزار روپیہ سال سے بھی کم ہے لہٰذا یہ اکثریت ان مراعات سے مستفید نہ ہو سکے گی۔ یہ درست ہے کہ وزیرِ خزانہ نے کوئی نیا محصول عائد نہیں کیا ہے لیکن گزشتہ گیارہ بارہ سال کے عرصے میں عام لوگوں پر بالواسطہ اور بلاواسطہ محصولات اس کثرت سے لگائے جا چکے ہیں کہ شاید اب مزید ٹیکسوں کے لیے گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ ماہرینِ معاشیات نے بھی ایک سے زائد بار یہ شکایت کی ہے کہ جتنے ٹیکس پاکستان کے عام لوگوں پر لگے ہوئے ہیں اتنے شاید ہی کسی دوسرے ملک میں لگے ہوں۔ ان حالات میں اگر بالواسطہ محصولات میں بھی تھوڑی سی تخفیف کر دی جاتی تو دولت مند اور درمیانہ طبقے کی مانند قلیل آمدنی کے لوگوں کی گراں باری میں بھی تھوڑی کمی ہو جاتی۔ ہمیں امید ہے کہ وزیرِ خزانہ جولائی میں پورے سال کا بجٹ مرتب کرتے وقت قلیل آمدنی والی اکثریت کو بھی مراعات اور سہولتوں سے نوازنے کی تجویز پر ہمدردی سے غور کریں گے۔

۵ اپریل ۱۹۵۹ء

عالمی امور

صوبائی خودمختاری یا حقِ علیحدگی

اِن دِنوں ہندوستان اور مغربی ملکوں میں تبت کی ''جنگِ آزادی'' سے بڑی ہمدردی جتائی جا رہی ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش ہو رہی ہے کہ جمہوریہ چین نے ایک غیر ملک پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے اور وہاں کے باشندوں کا مذہب، تہذیب اور ''مخصوص طرزِ زندگی'' سب خطرے میں ہیں۔

تبت کے لاماؤں اور جاگیرداروں نے وہاں جس ''مخصوص طرزِ زندگی'' کو رواج دیا ہے اور جمہوریہ چین نے وہاں چار پانچ سال کی قلیل مدت میں جو اصلاحات کی ہیں ان کو ہم نے تفصیل سے کسی اور جگہ بیان کیا ہے تاکہ قدیم اور جدید کا فرق نمایاں ہو جائے اور قارئین کو معلوم ہو جائے کہ تبت میں اب تک جو کلیسائی حکومت موجود تھی اس کی مثال قرونِ وسطیٰ کے رومن کلیسا میں تو شاید مل جائے مگر مہذب دنیا کے کسی حصے میں بھی یہ دقیانوسی ڈھانچہ اب دیکھنے کو بھی نہ ملے گا۔

مگر قضیہ تبت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ کسی ملک میں صوبائی خودمختاری کی حدیں کہاں شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ یعنی کیا کسی صوبے کو خواہ وہ چین کا ہو یا ہندوستان و پاکستان کا، یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے ملک کی سالمیت کو پارہ پارہ کر کے اپنی علیحدہ ریاست بنالے۔ مثلاً کیا سکاٹ لینڈ برطانیہ سے یا نیو میکسکو ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے الگ

ہوسکتا ہے یا صوبہ کیرالا کی کمیونسٹ حکومت کیا یہ کہنے میں حق بجانب ہوگی کہ چونکہ مرکز میں کانگریس کا راج ہے اس لیے ہم اپنی الگ ریاست بنائیں گے یا افغانستان سے پختونستان کا جو پروپیگنڈا ہوتا ہے کیا وہ درست ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ جمہوریہ چین کی مرکزی حکومت بڑی ظالم ہے اور اس نے تبت والوں کے تمام جمہوری حقوق غصب کر لیے ہیں مگر اس کے باوجود کیا تبت کے صوبے کو چین سے الگ ہو کر اپنی آزاد ریاست بنانے کا حق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مرکزی حکومت خواہ وہ اشتراکی ہو یا مغربی طرز کی، کسی صوبے کو علیحدہ ہوجانے کا حق نہیں دے سکتی۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ جناب ملک کی سالمیت اور یکجہتی کا اصول تسلیم مگر تبت تو چین کا حصہ نہیں ہے بلکہ چینیوں نے زبردستی تبت پر قبضہ کرلیا ہے لیکن یہ بات وہی کہے گا جس کو چین اور تبت کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو کیونکہ تبت ۱۷۲۰ء سے برابر چین کا ایک حصہ شمار ہوتا رہا ہے البتہ ماضی میں سلطنتِ مغلیہ کے دور افتادہ صوبوں کی مانند تبت کے حکمراں بھی، مرکزی حکومت مضبوط ہوئی تو، اس کی اطاعت کرتے رہے، کمزور ہوئی تو خودمختار بن بیٹھے۔ اس کے باوجود کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ تبت چین کا حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے تبت کو چین کا حصہ مانا اور ۱۹۴۶ء میں برطانیہ اور امریکہ نے بھی اس بات کو تسلیم کیا اور ۱۹۵۱ء میں جمہوریہ چین اور تبت کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس میں بھی اس حقیقت کا غیر مشروط طریقہ پر اعتراف کیا گیا۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا اور تبت کو چین کا حصہ تسلیم کیا۔

مگر پنڈت نہرو کی دوعملی ملاحظہ ہو کہ وہ آج بھی ایک طرف تبت کو چین کا حصہ مانتے ہیں اور دوسری طرف تبت کی آزادی کا راگ الاپتے ہیں۔ ایک ہمسایہ ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے وقت ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کل اگر چین، ناگاؤں کی تحریک سے ہمدردی کرے تو کیا ہو۔ پنڈت نہرو کی جسارت پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ جو شخص کشمیر کو غلام بنانے سے احتراز نہ کرے، ناگاؤں کی تحریک کا جواب گولوں، گولیوں اور بموں سے دے اور حیدرآباد کی خودمختاری کو ''پولیس ایکشن'' کے ذریعے ختم کردے وہ تبت کی آزادی کا نعرہ کس منہ سے لگاتا ہے۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پیشتر پنڈت جی کو بھی اپنی آنکھ کا شہتیر کیوں نظر نہیں آتا۔
رہ گئیں مغربی طاقتیں سو ان کے بارے میں تو ایشیا اور افریقہ کے کسی محبِ وطن کو کبھی غلط

فہمی نہیں ہوئی۔ یہ طاقتیں الجزائر، کینیا، نیا سالینڈ اور اپنے دوسرے مقبوضات کے حق آزادی کو کچلتی ہیں اور سیٹو کے بحری مظاہروں سے پیشتر تبت کی آزادی کے لیے دعائیں مانگتی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے پاکستان، انڈونیشیا یا سوڈان کی آزادی کے لیے کبھی دعا نہ مانگی تھی۔

ہم نے ہمیشہ صوبائی خود مختاری کے اصول کی حمایت کی ہے۔ ہماری رائے میں دفاع، امورِ خارجہ اور اس نوع کے چند دیگر امور کے علاوہ ہر صوبے کو اپنے نظم و نسق کا پورا پورا اختیار ہونا چاہیے خواہ یہ صوبہ چین کا تبت ہو یا ہندوستان کا کیرالا یا برطانیہ کا سکاٹ لینڈ یا امریکہ کا نیو میکسیکو۔ مگر ہم کسی صوبے کے حقِ علیحدگی کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے ملک کی سالمیت اور یک جہتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۵۹ء

یومِ پاکستان

آج ہمارا جشنِ نو روز ہے، آج ہی کے دن ہم نے حیاتِ نو کا خواب دیکھا تھا، اپنی قومی شخصیت کی بقا اور ترقی کے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ اپنی زندگی کو اپنے ارادوں اور اپنی خواہشوں کے مطابق سنوارنے کا عزم کیا تھا۔ ہم اس دن کو سلام کرتے ہیں، اُن پاک روحوں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں جنہوں نے اپنا سب کچھ آزادی کی راہ میں قربان کیا اور اس آرزو کو ایک حقیقت بنا دیا جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہمارے دلوں میں ابھری تھی۔

فصلِ گل آتی ہے اور حسن و نکہت بکھیرتی گزر جاتی ہے، موسمِ بہار گنگناتا ہوا آتا ہے اور نئی زندگی کا مژدہ سناتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ مگر جو مژدہ انیس برس پیشتر اسی موسمِ بہار میں ہمارے کانوں نے سنا اس کی گونج ہنوز محو نہیں ہوئی ہے۔ جو پیمانِ وفا ہم نے آج کے دن قوم کے روبرو باندھا تھا، مستقبل کو روشن و تابناک بنانے کا جو عہد ہم نے اپنے آپ سے کیا تھا راوی کی مضطرب لہریں وہ عہد و پیمان ہمیں آج بھی یاد دلاتی ہیں۔

مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کسی فرد یا جماعت نے ایک دن اچانک طلسمی عصا کو جنبش دی اور پاکستان بن گیا۔ پاکستان تو ابنائے وطن کی برسوں کی جدوجہد کا ثمرہ ہے اور ہمیں اُن مردانِ حق آگاہ کی خدمت کا اعتراف کرنا چاہیے جو دو سو سال تک آزادی کے لیے لڑتے رہے۔ اس جہاد میں علمائے دین، ادیب، خطیب، سپاہی، سیاستدان، اخبار نویس، تاجر، وکیل سبھی شامل تھے اور وہ

لاکھوں گمنام انسان بھی جن کے ایثار و انکسار نے ان کو اپنا نام ظاہر کرنے کی بھی اجازت نہ دی، آزادی کی یہ جدوجہد مختلف مدارج و ادوار سے گزری ہے تب پاکستان بنا ہے۔

پاکستان اس خطے کے باشندوں کے حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ اس کی سالمیت اور یک جہتی کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرضِ منصبی ہے مگر قائدِ اعظم نے بار بار فرمایا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری اور فلاحی ریاست ہوگا جس میں تمام باشندوں کو بلا تمیزِ مذہب و ملت اور نسل و زبان مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ آزادیِ تحریر و تقریر کا حق، آزادیِ ضمیر و تنظیم کا حق، روزگار اور تعلیم کا حق۔ یہ درست ہے کہ بعض خود غرض اور ابن الوقت عناصر نے ان حقوق کو ناجائز طور پر استعمال کیا مگر عام پاکستانیوں کا تو اس میں کوئی قصور نہ تھا، انہیں تو یہ حق کبھی ملے ہی نہیں۔ صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے تو ناجائز طریقے پر، آئین ساز اسمبلیاں بنائی گئیں تو غیر جمہوری انداز سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمانی نظام اور جمہوری روایتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہ ملا اور نہ خلوص سے جمہوری تجربے کو کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی۔ مانا کہ پارلیمانی نظام میں نقائص ہیں مگر اولاً تو کوئی نظامِ حکومت نقائص سے پاک نہیں ہے، دوئمً اب تک کوئی ایسا نظام نہ تو کامیاب ہوسکا ہے جس کی اساس جمہوریت پر نہ ہو اور نہ کسی نے اس سے بہتر کوئی اسلوبِ حیات وضع کیا ہے۔ ہزاروں سال کے انسانی تجربے نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ وہی نظامِ حکومت مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے جو جمہور کی رائے اور مرضی سے بنایا جائے۔ جمہور کی مرضی اور رائے معلوم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ انہیں اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔ ایک ایسا آئین جو جمہوری بھی ہو اور قابلِ عمل بھی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ایسا آئین وہی لوگ بہتر بنا سکتے ہیں جن کو عوام نے اپنی مرضی سے چنا ہو اور جو عوام کی خواہشات کی نمائندگی کرتے ہوں۔ اس کے لیے نہ تعلیم یافتہ ہونے کی شرط ضروری ہے اور نہ صاحبِ املاک ہونے کی کیونکہ خواندگی اور جمہوری اقدار کا تحفظ اور دولت مندی اور معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا احترام ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ملک کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والے وہی حضرات تھے جن کو تعلیم یافتہ ہونے کا گھمنڈ تھا اور وہ دولت مند حضرات ہی تو تھے جنہوں نے بلیک مارکیٹ، لائسنسوں کی خرید و فروخت اور سمگلنگ کے کاروبار کو فروغ دیا۔ رہا یہ اندیشہ کہ آئین ساز اسمبلی عوام کی مرضی سے چنی گئی تو پرانے موقع پرست اور خود غرض سیاسی لیڈروں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا سو اس سلسلے میں ہم فقط اتنا عرض کریں گے کہ سیاست دانی

اور سیاست بازی میں بڑا فرق ہے اور مخلص سیاسی کارکن اور ابن الوقت طالع آزما دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آخر وہ سیاست دان ہی تو تھے جنہوں نے ہماری آزادی کی جدوجہد کی رہنمائی کی تھی اور وہ بھی سیاست دان ہی تھے جنہوں نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو کامیاب بنایا تھا۔ اس سلسلے میں قوم پر بڑے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسے قوم پرست سیاست دانوں اور ابن الوقت سیاست بازوں میں تمیز کرنا ہوگا۔ آج یومِ پاکستان ہے، وطن سے تجدیدِ محبت کا دن۔ اس محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ملک میں ایسے اسباب پیدا کیے جائیں جن میں عوام کی چنی ہوئی آئین ساز اسمبلی ایسا آئین بنائے جو جمہوری بھی ہو اور قابلِ عمل بھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۹ء

ادیبوں کے فرائض

ادیبوں کا کنونشن خیریت سے گزر گیا۔ اس کنونشن میں جو خطبے اور مقالے پڑھے گئے، جو تقریریں ہوئیں، جو منشور منظور کیا گیا اور جو تجویزیں پاس ہوئیں ان پر ملک کے ہر گوشے میں اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ادیبوں کے اس قومی اجتماع کو اخباروں نے بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادیبوں کو ہمارے معاشرے میں جو مقام حاصل ہے ملک کا باشعور طبقہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ لوگ ادبی تخلیقات کو پرکھنے ہی کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیوں اور اظہار و ابلاغ کی راہ میں جو دشواریاں ہیں ان سے بھی واقف ہیں اور ادیبوں کو جن آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان سے بھی ہمدردی رکھتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ بعض حلقوں کی جانب سے اس کنونشن کو سرکاری ادیبوں کے شوقِ نام و نمود سے تعبیر کیا گیا تھا اور بعضوں نے اس پر انتہا پسندوں کی سازش کا الزام لگایا تھا لیکن یہ شبہات و الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہر مکتبہ فکر کے ادیبوں کی شرکت ہی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کنونشن ایک قومی کنونشن تھا کسی ایک گروہ یا مدرسہء خیال کی اجارہ داری نہ تھی۔ منشور میں جس عقیدے کو اپنایا گیا ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے بھی کسی پاکستانی ادیب کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔

اس کنونشن کا سب سے بڑا کارنامہ رائٹرز گلڈ کا قیام ہے۔ یوں تو پاکستان میں ادیبوں کی

متعدد تنظیمیں موجود ہیں اور اپنی بساط کے مطابق علم و ادب کی خدمت کرتی رہتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک کوئی ایسی ادبی انجمن وجود میں نہ آئی تھی جسے صحیح معنی میں قومی انجمن کا لقب دیا جاسکے اور جس میں ہر علاقے اور ہر خیال کے ادیب شامل ہوں۔ رائٹرز گلڈ کے قیام کے بعد یہ کمی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ رائٹرز گلڈ کے دو مقاصد ہیں۔ ایک کاروباری جس کا تعلق ادیبوں کے حقوق کی حفاظت سے ہے اور دوسرا فنی اور ادبی تخلیق کو فروغ دینا ہے۔ تہذیب کے دورِ جدید میں ہر ادیب کی تخلیقی کاوشیں ایک مثلث کی پابند ہوتی ہیں۔ اس مثلث کا ایک زاویہ وہ پبلشر حضرات ہیں جن کا نقطۂ نظر خالص تجارتی ہوتا ہے اور جو ادیب کے مفاد کو شاذ و نادر ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ دوسرا زاویہ خداوندانِ احتساب کا ہے خواہ یہ احتساب حکومت کی جانب سے ہو یا معاشرے کی جانب سے۔ تیسرا زاویہ خود ادیب کی ذات اور وہ ماحول ہے جس میں ادیب کی ہمت افزائی یا حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ادیبوں کے اس کنونشن میں ادب کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی یا ادیبوں کے تمام مسائل کو حل کرنے کا انتظام کر لیا گیا— یہ ممکن بھی نہ تھا— البتہ اب کہ تنظیم کا ڈھانچہ بن گیا ہے یہ امید کی جاتی ہے کہ ادیبوں کی یہ گلڈ اس مثلث کے تینوں زاویوں پر نظر رکھے گی تاکہ زاویوں کے باہمی ربط سے ادب کے فروغ کے لیے نئی راہیں کھل سکیں۔

اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ کنونشن والوں کے پاس نسخۂ کیمیا تھا جو ادیبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اب ملک میں اچھے اور مفید ادب کی فراوانی ہوگی تو یہ اس کی بھول ہے۔ اچھا ادب کانفرنسوں، رزولیوشنوں اور منشوروں سے نہیں پیدا ہوتا اس کے لیے تو ادیبوں کو اپنا خون جلانا ہوتا ہے، قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ اگر ادیب قوم کا مزاج داں ہے اور روحِ عصر کے تقاضوں کا احترام کرتا ہے تو اس کے شب و روز اسی فکر میں بسر ہوں گے کہ وہ قوم کی ذہنی بیداری کے لیے سامانِ فکر و عمل پیدا کرتا رہے۔ یہ درست ہے کہ عُسرت و تنگ دستی ادبی ترقی میں مانع ہوتی ہے لیکن ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ادیبوں نے عُسرت و تنگ دستی کے عالم میں بھی اپنے تخلیقی فرائض سے کوتاہی نہیں کی اور بعض اوقات عظیم ادب پیدا کیا۔ مانا کہ احتساب سے پروازِ فکر کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور ذہن کی وسعتیں تنگ لیکن ایسے ادیب بھی گزرے ہیں جن کی طبیعت رُکتی ہے تو طبع کی روانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اصل چیز تخلیقی جذبے کی شدّت اور ادبی عقیدے کی پختگی ہے، وہ فنّی خلوص ہے جو پیدا ہو جائے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

اب کہ ادیبوں کی ایک گلڈ بن گئی ہے اور ادیبوں کے قومی فرائض کی نشان دہی بھی ہوگئی ہے ہمیں یقین ہے کہ ملک کے تمام ادیب خواہ وہ کسی مدرسۂ فکر سے وابستہ کیوں نہ ہوں نئے جذبے اور نئی امنگ اور لگن سے قومی ادب کی تخلیق میں مصروف ہو جائیں گے اور اس تنظیم کو کامیاب بنائیں گے۔

۸فروری ۱۹۵۹ء

ہم اور ہماری قومی تہذیب

بسنت رُت آتی ہے تو سرسوں کے پھول کھلتے ہیں اور پیلی پوشاکیں بہار دکھاتی ہیں اور گرم گڑ کی سوندھی سوندھی خوشبو سے گاؤں کی فضا مہک اٹھتی ہے اور قدرت کا حسنِ تخلیق نکھر آتا ہے— یہی زمانہ ہمارے شہروں میں تہذیبی سرگرمیوں کا بھی ہوتا ہے— انسان کے حسنِ تخلیق کے نکھرنے کا— علمی اورادبی کانفرنسیں کی جاتی ہیں، مشاعرے اور مباحثے ہوتے ہیں، ناٹک کھیلے جاتے ہیں، رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں اور تصویروں، مویشیوں اور ملکی مصنوعات کی نمائشیں ہوتی ہیں— یہ تہذیبی سرگرمیاں ہمارے شعور اور قوتِ عمل کا مظہر بھی ہیں اور ان کا پیمانہ بھی۔ ان سے قوم کے میلانِ طبع اور رجحانِ فکر کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے اور ان کی رفتار بھی ناپی جاسکتی ہے۔

ان تہذیبی سرگرمیوں کی افادیت سے انکار نہیں ہوسکتا البتہ غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک خاص قسم کا ایک انگا پن نظر آئے گا— یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ موسم کے خود رو پھول ہیں جن کی نشوونما کسی منصوبے کے تحت نہیں ہوئی ہے۔ ہماری یہ تہذیبی سرگرمیاں چند بڑے شہروں ہی تک محدود رہتی ہیں۔ چھوٹے شہر، قصبے اور دیہات کہ پاکستان اصل میں اِنھیں سے عبارت ہے، ان کے فیض سے یکسر محروم رہتے ہیں۔ فائدہ اٹھانا تو درکنار عام آدمیوں کو ان کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ اوراس قسم کے متعدد مسائل ہیں جن پر ابھی تک باقاعدہ طور سے غور نہیں کیا گیا ہے۔

شہر اور دیہات کی تہذیبی زندگی میں ربط و آہنگ پیدا کرنا، دیہات کے باشندوں کو شہری تخلیقات سے روشناس کرنا، شہریوں کو دیہاتی کلچر کے صحت مند پہلوؤں کی جانب متوجہ کرنا تاکہ قومی کلچر ایک وحدت بن کر ترقی کرے، خود تہذیب کے مختلف مظاہر کے درمیان کوئی رشتہ قائم کرنا اور پھر ان سب کے مجموعی فروغ کے لیے کوئی ہمہ گیر منصوبہ اور لائحۂ عمل بنانا غرض کتنے ہی کام ہیں جو ہنوز توجہ چاہتے ہیں۔ ابھی تک تو ہم یہ تصفیہ بھی نہیں کر سکے ہیں کہ ہماری تہذیب کا نشانِ امتیاز کیا ہے اور اس کو شناخت کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

سنتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں عنقریب کوئی کلچرل کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس میں اُن تمام لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جائے گی جو قوم کے تہذیبی احیا میں مصروف ہیں اور کوئی باقاعدہ منصوبہ بنے گا تہذیبی ترقی کا۔ جب صنعت اور زراعت کی ترقی کے لیے پنج سالہ، دس سالہ منصوبے بن سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری تہذیبی ترقی کے لیے کوئی ہمہ گیر منصوبہ نہ بنے۔ اگر یہ تہذیبی کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی تو ہماری تہذیبی سرگرمیوں میں ربط اور نظم پیدا کرنا آسان ہوجائے گا۔ اس کے بعد مرکزی اور صوبائی پیمانے پر کوئی الگ شعبہ امورِ تہذیب کا قائم کیا جاسکتا ہے جو ملک کے ہر حصے کی تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہے اور ان کی امداد کرتا رہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ ہر قوم اور ملک کی تہذیب اس کی روحانی اور مادّی تخلیقات کا نچوڑ ہوتی ہے تو پھر پاکستانی تہذیب کے ماضی، حال اور مستقبل کا منظم طور پر جائزہ لینا اور اس کی ترقی کے لیے کوئی باقاعدہ منصوبہ بنانا ہمارے فرائضِ منصبی میں شامل ہونا چاہیے۔ ہم اس فرض سے کب تک غافل رہیں گے۔

۱۵فروری ۱۹۵۹ء

اردو کانفرنس

آج سے لاہور میں ایک اردو کانفرنس بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اردو زبان اورادب کی خدمت کرنے والوں کا اتنا بڑا اجتماع اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے ملک کا دانش ور طبقہ قومی فرائض اور لسانی ذمہ داریوں سے باخبر ہے اور زبان کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ ہم اس کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ مقررین اور مندوبین ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس حقیقتوں پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں گے اور کوئی ایسا لائحۂ عمل بنائیں گے جس سے قومی وحدت و سالمیت کی بنیادیں اور مضبوط ہوں اور ہماری ذہنی، روحانی اور مادّی ضرورتیں پوری ہوں۔

پاکستان میں فلسفۂ زبان اور علمِ لسانیات سے پوری پوری واقفیت بہت کم لوگوں کو ہے مگر زبان کی حد تک یہاں کم از کم چار مختلف دبستانِ فکر پائے جاتے ہیں۔ اوّل وہ گروہ ہے جو غلط انگریزی بولتا ہے، غلط انگریزی لکھتا ہے اور شاید انگریزی ادب سے بھی ناآشنا ہے مگر اس کی ذہنیت کچھ ایسی بن گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان کے بدستور تسلط کے حق میں ہے اور کیا اردو، کیا علاقائی زبانیں سب کو حقارت اور نفرت سے دیکھتا ہے۔ اقلیت میں ہونے کے باوجود اس گروہ کا اثر ورسوخ بہت ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اردو کو غیر ملکی زبان سمجھتے ہیں، علاقائی زبانوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور اردو اور بنگالی کے بجائے اگر انگریزی راج سنگھاسن پر براجمان رہے تو اس

میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ یہ ایک عالم گیر بین الاقوامی زبان ہے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اردو سے بڑی والہانہ محبت کرتے ہیں مگر علاقائی زبانوں کو بڑی حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کو علیحدہ زبانیں بھی نہیں مانتے۔ ان کا بس چلے تو وہ ان زبانوں کو ختم کر کے اردو کو سب پر مسلط کر دیں۔ چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو علاقائی زبانوں کا احترام کرتے ہیں، ان کو فروغ دینے کے حق میں ہیں۔ انگریزی زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور افادیت کو مانتے ہیں پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ اردو، بنگالی کے پہلو بہ پہلو ملک کی سرکاری اور دفتری زبان بن جائے۔ زبان کے بارے میں جہاں اتنے مختلف خیالات موجود ہوں وہاں اس مسئلے کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔

یوں تو اردو زبان کے مسائل بہ کثرت ہیں مگر ہماری رائے میں بنیادی مسائل یہ ہیں:

۱۔ انگریزی کی جگہ اردو اور بنگالی کو ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان بنانا۔

۲۔ اردو کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم بنانا۔

۳۔ اردو ٹائپ کو رواج دینا اور لیتھو پریس کو ختم کرنے کی تدابیر سوچنا۔

۴۔ اردو میں، جدید دور کے تقاضوں کے مطابق، علمی اور فنی لٹریچر تیار کرنا۔

مگر ان بنیادی مسائل پر غور کرنے سے پیشتر ہمیں بعض ٹھوس حقیقتوں کو خلوصِ دل سے تسلیم کر لینا چاہیے اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

اوّل یہ کہ انگریزی ایک عالم گیر زبان ہے۔ بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے اردو بھی انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتی لہٰذا نصابِ تعلیم بناتے وقت ہمیں انگریزی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہیں ہے اور نہ وہ کسی علاقائی زبان کی جگہ لوگوں کی مادری زبان بن سکتی ہے۔

۳۔ اردو زبان مختلف علاقوں کے مابین اظہار و ابلاغ کا واحد ذریعہ ہے۔ پنجابی، سندھی، بنگالی اور پٹھان ایک دوسرے سے اردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔

۴۔ علاقائی زبانیں بولنے والے اردو کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اردو میں شعر، افسانے، مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں۔ اردو ان کے لیے کوئی اجنبی اور بدیسی زبان نہیں ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ وہ اپنی مادری زبان ترک کر کے اردو کو اس کی جگہ قبول کر لیں

گے۔

۵۔اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور یہ زبان بڑی آسان ہے۔

۶۔علاقائی زبانیں اردو کی دشمن یا حریف نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں، ان میں اتحاد وتعاون آسانی سے ممکن ہے اور اس تعاون کے بغیر پاکستان میں اردو کو وہ درجہ اور مرتبہ نہیں حاصل ہوسکتا جس کی یہ زبان مستحق ہے۔

اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں میں تعاون کی شکل کیا ہو، اردو میں ان زبانوں کے الفاظ اور محاورے کس طرح داخل کیے جائیں تا کہ اردو کے ذخیرے میں اضافہ ہو اور ہر علاقے کے لوگ اسے اپنی زبان تصور کریں، اُردو ٹائپ کو رائج کرنے کی کیا صورت ہو اور لیتھو کی وجہ سے اردو کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی تلافی کس طرح کی جائے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں اردو اور مادری زبانوں کا کیا رشتہ ہو، یہ اور اس نوع کے متعدد سوالات ہیں جن پر اس کانفرنس کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ رہا سرکاری اور دفتری زبان کا مسئلہ سو اس پر سب متفق ہیں کہ انگریزی کی جگہ اردو اور بنگالی کو ریاستی زبانوں کا درجہ ملنا چاہیے البتہ ابھی تک میعاد مقرر نہیں ہوئی ہے اور نہ عبوری دور کے لیے کوئی منصوبہ بنا ہے۔ امید ہے اردو کانفرنس اس طرف بھی توجہ دے گی۔

۲۲ فروری ۱۹۵۹ء

لخت، لخت

تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد صحافتی فرائض کے رشتوں کو جوڑنے بیٹھا ہوں تو انگلیاں قلم کی رفاقت سے گریز کر رہی ہیں۔ ذہن خالی ہے اور دامنِ خیال پارہ پارہ مگر مجھے "لیل و نہار" کے قدر دانوں سے نہ اپنی نا کردہ گناہی کی داد طلب کرنی ہے اور نہ میں ایامِ اسیری کی داستان چھیڑ کر ان کے منھ کا مزا خراب کرنا چاہتا ہوں۔ شکوہ و شکایت بھی بے سود چیزیں ہیں البتہ سالنامہ بروقت پیش نہ کر سکنے کا قلق ضرور ہے حالانکہ ہمارے قارئین ہماری مجبوریوں سے بخوبی واقف ہیں۔

الحمد للہ کہ "لیل و نہار" نے ۲۰ جنوری کو اپنی حیاتِ وفا آشنا کے دو برس پورے کر لیے۔ گزشتہ سال اس موقع پر سالنامہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ سالنامہ ملک کے ممتاز ادیبوں اور دانش وروں کے تعاون کے سبب بہت کامیاب رہا تھا۔ اب کہ حالات خوش گوار صورت اختیار کر رہے ہیں انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ہم تاخیر سے سہی مگر سالِ نو کا ایک بہتر تحفہ قارئین کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔

یوں تو حیاتِ انسانی کے اس طویل سفر میں، ایک سال کی مختصر مدت کوئی معنی نہیں رکھتی مگر قوموں کی زندگی میں کبھی کبھار ایک لحہ بھی بڑا عہد آفریں ہوتا ہے۔ سالِ گزشتہ کی ابتدا میں ایوانِ اقتدار کے مسند نشینوں نے ہمیں بار بار یہ مژدہ سنایا تھا کہ وہ لحۂ عہد آفریں آ پہنچا ہے لیکن دراصل یہ محلاتی سازشوں کی آواز تھی، ہوسِ اقتدار کی آواز تھی — اور پھر اس آواز کا طلسم ٹوٹ

گیا — لمحہ کا ذوقِ نمود، جلوے کا منتظر ہی رہا — بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پچھلا سال پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہم سال تھا اور اب کہ ایک نیا دور، نئے منصوبوں اور نئے ارادوں کے ساتھ شروع ہو چکا ہے، ابنائے وطن کے دلوں میں نئی امیدوں اور نئی آرزوؤں کے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ سالنامہ نئے دور کے ان تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ہماری قوم نئی ہے اور نہ اس کے مسائل نئے ہیں۔ تعلیمی اور طبّی سہولتوں کی کمی ہو یا روٹی اور روزگار کی قلت، مہاجروں کی آبادکاری ہو یا کاشتکاروں کی فلاح و بہبود، پیداوار بڑھانے کا مسئلہ ہو یا زرِمبادلہ کمانے کا، کشمیر اور نہری پانی کی نزاع ہو یا کفایت شعاری کی باتیں، آٹھ دس برس کے عرصے میں جو سیاسی جماعت برسرِاقتدار آئی، جو سیاسی رہنما ہمارا قائد بنا اس نے ان مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا اور پھر حصولِ جاہ و حشم میں مصروف ہوگیا مگر نئی حکومت کے بارے میں تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ان قومی مسائل کو حل کرنے کی پُرخلوص کوشش کر رہی ہے۔ اس سے — ہوں گی اور ضرور ہوں گی، کیونکہ وہ انسانی حکومت ہے لیکن کوئی شخص اس کی نیک نیتی اور خلوص پر شبہہ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو نہیں نوازتی اور نہ قوم کی دولت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتی ہے بلکہ نیک نیتی سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

''لیل و نہار'' کو اس بات کی خوشی ہے کہ گزشتہ دو برس سے وہ جن معاشرتی، اخلاقی اور روحانی قدروں کی تبلیغ کر رہا ہے موجودہ حکومت بھی انھیں قدروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ سالنامے میں اِنھیں فنّی، روحانی اور معاشرتی قدروں کو ایک بار پھر اُجاگر کیا جائے گا۔

۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء

عرضِ مدّعا

''لیل و نہار'' کا یہ سالنامہ ہم عیدالفطر کی تقریبِ سعید کے موقع پر آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ تحفہ آپ کی تشنگیِ علم اور ذوقِ جمال کے لیے باعثِ تسکین ثابت ہو اور آپ کی مسرتوں میں اضافے کا سبب بنے۔

یہ درست ہے کہ جن کے دل درد کی ٹیسوں سے آشنا ہیں اور ہجومِ یاس جن کے حوصلوں کا امتحان لے رہا ہے وہ کھلونوں سے نہیں بہلائے جا سکتے مگر ہر قوم اور ہر فرد کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اسے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھنا ہوتا ہے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے سے پیشتر حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ہوتا ہے۔ زندگی ایک سعیِ پیہم، ایک جہدِ مسلسل ہے۔ اس میں پر خطر کھائیوں اور ہلاکت خیز راہوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور چمنستانوں اور مرغزاروں سے بھی۔ اس میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں، پسپائیاں بھی ہوتی ہیں اور قدم آگے کی سمت میں بھی بڑھتے ہیں مگر انسان کی کئی ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے تمام آزمائشوں اور امتحانوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ پس حالات کتنے ہی ہمت شکن کیوں نہ ہوں زندگی کے تقاضے بہر صورت پورے ہو کر رہیں گے۔ زندگی اپنے آپ کو منوا کر دم لے گی لہٰذا مبارک ہیں وہ لوگ جو زندگی کے ان تقاضوں سے اور حیات کے قانونِ حرکت و تغیر سے آگاہ ہوتے ہیں اور زمانہ سازی کے بجائے زمانے کی ہوا کا رُخ بدلنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہتے ہیں۔

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من وتو
تو بستن درو من فتح باب می شنوم

''لیل و نہار'' کی پہلی اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ اس ہفت روزہ کے اجرا کا ایک مقصد اُس تشنگی کی تسکین ہے جو ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے ہم خود کئی بار محسوس کر چکے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک ایسا مرقع پیش کیا جائے جو اخبار بین طبقے کو بدیسی زبان کے جریدوں سے کسی حد تک بے نیاز کر دے اور پاکستان کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے میں مدد دے۔ الحمدُ للہ کہ حق گوئی اور حق بینی کا جو معیار ہم نے اس وقت قائم کیا تھا وہ مینارۂ نور کی مانند ہمیں آج بھی سچائی کی راہ دکھا رہا ہے اور ملک اور قوم کی خدمت کا جو جذبہ ہم لے کر چلے تھے وہ بدستور جوان ہے۔ جمہوری نظامِ حیات کی اساس پر معاشرے کی اصلاح و ترقی اور احترامِ انسانیت کے اصول پر شخصی آزادی کا فروغ ہمارا مسلک و شعار پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ ہمیں ملک کے دانش وروں، ادیبوں اور فن کاروں کا تعاون اگر حاصل ہے اور ہمارے قارئین کا حلقہ اگر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو اس کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ انہیں ہمارے نصب العین سے کامل اتفاق ہے۔

ہمیں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا پورا پورا احساس ہے مگر اس مختصر مدت میں ہماری ہر لمحہ یہی کوشش رہی ہے کہ اردو صحافت کے معیار کو بلند سے بلند تر کریں تاکہ عبوری اور معنوی اعتبار سے ''لیل و نہار'' کو دنیا کے بہترین جریدوں کی صف میں جگہ ملے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اربابِ علم و فن بدستور تعاون کرتے رہے اور قارئین نے بدستور ہماری ہمت افزائی کی تو راستے کی صعوبتیں ہمیں منزل کی طرف بڑھنے سے روک نہ سکیں گی۔

گفتمش ذرّہ بہ خورشید رسد، گفت محال
گفتمش کوش من در طلبش، گفت رواست

۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء

تیسرا حصہ......یحییٰ خان کا مارشل لا

(۱۹۷۰......۷۱ء)

صفحہ نمبر ۲۷۸ سے ۳۱۲ تک

مشرقی پاکستان

امداد اور آباد کاری کا منصوبہ

صدرِ پاکستان نے اپنی حالیہ پریس کانفرنس میں قوم کو یہ خوش خبری سنائی ہے کہ مرکزی حکومت نے طوفان سے متاثر ہونے والے علاقوں کی طویل المیعاد تعمیر اور وہاں کے باشندوں کی مستقل آباد کاری کا ایک مبسوط منصوبہ منظور کرلیا ہے۔ اس منصوبے پر ۸۶ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ منصوبہ عالمی بینک کے روبرو پیش کر دیا گیا ہے اور بینک کے صدر نے امداد کا حتمی وعدہ کیا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے یہ بھی کہا کہ میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ یہ منصوبہ عمل درآمد کے لیے فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ ''فوج یہ کام ایمان داری اور تن دہی سے سرانجام دے گی۔''

امدادی کاموں کے سلسلے میں مرکزی حکومت پر غفلت اور کوتاہی کے جو الزامات لگائے جاتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے جنرل یحییٰ خاں نے فرمایا کہ ''میں اعتراضات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لوگوں کو مجھ پر اعتراض کرنے کا حق ہے۔'' لیکن انہوں نے کہا کہ اس المیے سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ اس سانحے کو فٹ بال کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ وہ موجودہ امدادی انتظامات سے مطمئن تھے۔

متاثرہ علاقوں کی از سرِ نو تعمیر اور آباد کاری کے منصوبے کی تفصیلات ہنوز صیغۂ راز میں ہیں لہٰذا ان کی افادیت پر تبصرہ ممکن نہیں ہے البتہ یہ بات واضح ہے کہ اس منصوبے کو سرکاری افسروں

نے تیار کیا ہے خواہ وہ مشرقی پاکستان کے ہوں یا مغربی پاکستان کے۔ اس منصوبے کی تیاری میں مشرقی پاکستان یا متاثرہ علاقوں کے نمائندوں کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ان سے کسی قسم کا مشورہ کیا گیا ہے۔ رہی سرکاری افسروں کی اہلیت اور فرض شناسی اس سے تو خود صدرِ مملکت مطمئن نظر نہیں آتے ورنہ وہ یہ کیوں فرماتے کہ میں اس کام کو فوج کے سپرد کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔ جنرل یحییٰ خاں نے سرکاری افسروں پر بالواسطہ طور پر جس عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے وہی بے اعتمادی پوری قوم کا بائیس سالہ تجربہ بھی ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات نے آبادکاری کا جو منصوبہ تیار کیا ہے اس سے متاثر علاقے واقعی مستفید ہوسکیں گے اور کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں، سماجی کارکنوں اور میڈیکل ایسوسی ایشن، انجینئرنگ ایسوسی ایشن اور ٹیچرز ایسوسی ایشن کے نمائندوں سے بھی مشورہ کرلیا جاتا۔ یہ لوگ مقامی حالات سے سرکاری افسروں سے کہیں زیادہ باخبر ہیں۔ ان کو بخوبی معلوم ہے کہ لوگوں کو کن چیزوں کی ضرورت ہے اور کس مد پر کتنا خرچ کرنا مناسب ہوگا۔ ان طبقوں کے تعاون سے شاید مصارف کم ہوجائیں اور کام میں آسانیاں بھی پیدا ہوجائیں۔

جہاں تک اس کام کو فوج کے سپرد کرنے کا تعلق ہے اس سے کسی محبِ وطن پاکستانی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہماری فوج نے ماضی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متاثرہ علاقوں کی ازسرِ نو تعمیر اور آبادکاری اتنا بڑا کام ہے جسے کوئی ایک گروہ تنہا پورا نہیں کرسکتا خواہ وہ کتنا ہی مستعد اور ایماندار کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے تو ہمیں پوری قوم کا عملی تعاون درکار ہوگا اور پوری قوم کے جذبہ عمل کو بیدار کرنا ہوگا۔

اگر ہماری یادداشت دھوکا نہیں دیتی تو غالباً ہمارے ملک میں ایک سیلاب کمیشن بھی موجود ہے اور اس کمیشن کے ارکان چین اور دوسرے کئی ملکوں کا دورہ بھی کرچکے ہیں جہاں عوام کے تعاون سے سیلاب اور طوفان کی تباہ کاریوں پر قابو پایا جاچکا ہے۔ ان کی رپورٹیں بھی اربابِ اختیار کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ یہ پوچھنا تو عبث ہے کہ ان رپورٹوں پر اب تک عمل کیوں نہیں ہوا لیکن ان میں اگر عوامی تعاون کی کچھ تجاویز موجود ہیں تو ان پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ جمہوریہ چین نے تو عوامی تعاون ہی سے دریاؤں کے رخ پھیر دیے ہیں اور سیلاب کا زور ختم کر دیا ہے۔

ہمارے ملک میں اب تک تعمیری منصوبوں کی بنیادی خامی یہی رہی ہے کہ منصوبہ سازوں

نے فقط سرکاری عملے کی کارکردگی پر تکیہ کیا ہے اور ان لوگوں کے تعاون کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہے جن کے لیے یہ سارے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے افسر شاہی اور عوام کے درمیان شبہے اور بدگمانی کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ہے۔ عوام یہ سوچ کر الگ تھلگ رہتے ہیں کہ یہ سرکار دربار کے مشغلے ہیں ہمیں ان سے کیا سروکار۔ افسر شاہی عوام اور ان کے نمائندوں کو ان پڑھ اور گنوار سمجھتی ہے یا یہ خطرہ محسوس کرتی ہے کہ اگر ان کو کام میں شریک کرلیا گیا تو ذاتی منفعت کی راہیں مسدود ہو جائیں گی لہٰذا وہ عام لوگوں سے صلاح مشورہ کرنا بھی اپنی توہین خیال کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ہمارا کوئی منصوبہ بھی خاطر خواہ طور پر کامیاب نہیں ہوا ہے اور نہ کوئی منصوبہ عوام کے تعاون اور احتساب کے بغیر کبھی کامیاب ہوسکتا ہے۔

صدر یحییٰ خاں فرماتے ہیں کہ میں سیاسی اقتدار کا بھوکا نہیں ہوں بلکہ ملک کا نظم و نسق جلد از جلد عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کے سپرد کر دینا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں تو عوام کے مستند نمائندوں سے صلاح و مشورہ کرنا اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ کام کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور اختیار سنبھالنے کے بعد کوئی یہ عذر پیش نہ کرسکے کہ اس منصوبے کو ہم سے پوچھ کر تھوڑا ہی نافذ کیا گیا تھا جو ہم اسے چلائیں۔

لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے تعمیری منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے وہاں کے مختلف الخیال سیاسی رہنماؤں، سماجی کارکنوں، انجینئروں، استادوں، ڈاکٹروں، طالب علموں، جرنلسٹوں اور مزدور اور کسان لیڈروں کی ایک با اختیار مشترکہ کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی میں فوج اور حکومت کے نمائندے بھی شریک ہوں اور آبادکاری کے تمام اختیارات اور فرائض اس کمیٹی کے حوالے کر دیے جائیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کا ہر طبقہ، فرقہ اور گروہ مصیبت زدگان کی آبادکاری کو اپنا قومی فریضہ سمجھے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہر شخص میں تعمیری منصوبے میں شرکت کا احساس ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ امداد میں وصول ہونے والی اشیا خود غرض عناصر کی خورد بُرد سے بچ جائیں اور مستحقین تک پہنچیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ سرکاری ملازم آزمائشوں سے محفوظ رہیں اور نفرت و ملامت کا نشانہ نہ بنیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ منصوبہ واقعی کامیاب ہو تو پھر ہمیں قومی سطح پر ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل کرنی ہوگی۔

ہمیں صدرِ مملکت کے اس خیال سے بھی پورا اتفاق ہے کہ مشرقی پاکستان کی حالیہ تباہیوں کو سیاسی فٹ بال کے طور پر نہیں استعمال کرنا چاہیے لیکن اس ضمن میں بعض غیر ملکی طاقتوں کی

سرگرمیوں کی جو خبریں اخباروں میں شائع ہو رہی ہیں وہ بڑی تشویش ناک ہیں۔ امریکی سفیر کی مصروفیتوں پر ہم گزشتہ اشاعت میں احتجاج کر چکے ہیں۔ برطانوی فوجوں کی موجودگی پر مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنما بھی معترض ہیں اور اب ڈھاکہ کے اخبار آزاد نے یہ انکشاف کیا ہے کہ امریکی حکومت سیلاب اور طوفان کے کنٹرول اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے لیے امداد دینے کو تیار ہے مگر اس کے بدلے چٹاگام میں بحری اڈّے قائم کرنے کی خواہش مند ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو سیاسی بلیک میلنگ کی اس گھناؤنی کوشش کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ ہم امریکی سامراج کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سرزمینِ پاکستان کا ایک ایک ذرّہ مقدس ہے اور ہم اپنے جزیروں، میدانوں، دریاؤں اور ساحلوں کو امریکی سامراج کے گندے قدموں سے نجس ہونے کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔ ہم فاقے کریں گے لیکن اپنی آزادی اور سالمیت کو امریکہ کے ہاتھ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کریں گے۔

۷۔۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء

جاں گداز المیے کے بعد

پانچ لاکھ، دس لاکھ، پندرہ لاکھ...... کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ کتنے لاکھ افراد مشرقی پاکستان کے طوفان میں لقمۂ اجل بن گئے۔ انسانی ذہن موت کی اس ارزانی اور بے پایاں تباہی کے تصور سے عاجز ہے کیونکہ تاریخ میں اس المیے کی مثال نہیں ملتی اور اس کی سنگینی، ہندسوں میں بیان نہیں ہوسکتی۔ ایک درجن سے زائد جزیرے صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئے۔ نواکھلی کی بستیاں میلوں تک سنسان پڑی ہیں، لاشیں بے گور و کفن جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ جو اس المیے میں زندہ بچ رہے ان کا حال مُردوں سے بدتر ہے۔ دانے پانی کے بغیر، سڑتی ہوئی لاشوں کے درمیان فاقے سے یا وبا سے دم توڑ رہے ہیں۔

آفاتِ سماوی کے خلاف انسان کی جدوجہد کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ہر چند کہ دنیا میں جگہ جگہ طوفان اب بھی آتے ہیں، زلزلے اور سیلاب اب بھی اپنے ساتھ تباہی لاتے ہیں لیکن آج کا انسان ان آفتوں کے سامنے دورِ قدیم کے انسانوں کے طرح بے بس تو نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے، ہفت افلاک کے اسرار کھل چکے ہیں اور اب مہ و ستارہ انسان کی گزرگاہ بن گئے ہیں۔ ایسے میں بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اب تک مشرقی پاکستان کے ساحلی علاقوں کی حفاظت کے لیے کیا کیا؟

طوفان کے مقابلے میں ہماری بے تدبیری کا ایک عالم تو یہ ہے کہ اسے روکنے کے مستقل اقدامات نہیں کرتے حالانکہ یہ خونیں سلسلۂ حادثات ہماری آنکھوں کے سامنے بائیس سال سے

رونما ہو رہا ہے، اور دوسری طرف بے تدبیری کی کیفیت یہ ہے کہ ساحلی علاقوں کے لوگوں کو طوفان کے خطرے سے بروقت آگاہ نہیں کیا گیا۔ پی پی آئی نے بتایا ہے کہ محکمہ موسمیات کی جانب سے ریڈیو پاکستان کے ذریعے خطرے کے سگنل کے روایتی اعلان کا طریقہ اچانک ختم کر دیے جانے سے یہاں ساحلی علاقوں، اور ساحلی جزیروں کے لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے اور موجودہ وارننگ کے طریقے سے انہیں خطرے کی سنگینی کا کوئی احساس نہیں ہو سکا تھا۔ عوام کا کہنا ہے کہ خطرے کی شدت کا اگر انہیں پہلے سے علم ہوتا تو اتنا زبردست جانی نقصان نہ ہوتا۔

اسی بے تدبیری کی بنیاد پر نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما مولانا عبدالحمید بھاشانی نے صاف کہا ہے کہ لاکھوں انسانی جانوں کی ہلاکت کی ساری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، جس نے عوام کو طوفان اور متوقع سمندری ریلے سے بچانے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے۔ اگر یہ واقعہ درست ہے اور محکمہ موسمیات کی غفلت، یا نااہلی کا عالم یہی ہے، جیسا کہ بیان میں آیا ہے، تو اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے حکومت کو اس الزام کی تحقیق کر کے عوام کو اس کے نتائج اور آئندہ تدبیروں سے مطلع کرنا ہوگا۔

مشرقی پاکستان کے سیلاب اور طوفان میں اب تک کئی ارب روپے کا نقصان ہوا ہے اور لاکھوں انسانی جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ ان آفات کے تدارک کی تدبیریں جو دوسرے ملکوں میں اور خاص طور پر چین میں اختیار کی گئی ہیں، ان سے بہرہ مند ہونا ہمارے لیے ناممکن نہیں، پھر اس صورت میں کہ چین ہمارا ہمسایہ اور بہترین دوست ہے اور ہماری دست گیری کے لیے ہمیشہ مستعد رہتا ہے لیکن شرطِ اوّل یہی ہے کہ سب سے پہلے ہم خود اپنی امداد کی ضرورت محسوس کریں اور لاکھوں انسانی جانوں کے اس لرزہ خیز اور بھیانک اتلاف کو براہِ راست اپنی ذمے داری تسلیم کریں۔ کیا ہمارے قوائے عمل اب بھی بیدار نہیں ہوں گے اور ہم اپنی سعی و کاوش کو امدادی کاموں تک ہی محدود رکھیں گے؟ کیا ہمارا مقصد انسانی جانوں کو بچانا نہیں، محض لاشیں شمار کرنا ہے؟

۲۳۔۲۹ دسمبر ۱۹۷۰ء

انتخابات اور اس کے بعد

یومِ شوکتِ عوام

دسمبر کی ساتویں تاریخ جس کا مدت سے انتظار تھا بڑے ارمانوں سے آئی اور خوشبوں کے پھول بکھیرتی خیریت سے گزر گئی۔ کیسا عہد آفریں اور تاریخ ساز دن تھا جس دن اس سرزمین کے کروڑوں باشندوں نے پہلی بار اپنا حقِ رائے دہی استعمال کیا اور سلطانیِ جمہور کی آواز میں پہلی بار معنویت کی گونج پیدا ہوئی۔ اب کہ وطنِ عزیز کا قافلہ منزلِ مراد کی جانب رواں ہے، ان عاقبت نا اندیش ناخداؤں کے جور و ستم کا کیا گلہ کیجیے جنہوں نے قوم کو ۲۳ سال تک اس کے پیدائشی حق سے محروم رکھا اور جن کی بدولت قوم کی کشتی بار بار گردابِ بلا میں پھنسی اور بار بار خود غرضی کی چٹانوں سے ٹکرائی۔ البتہ افسوس اس کا ہے کہ قومی زندگی کے یہ بیش قیمت ماہ و سال رائیگاں گئے حالانکہ وہ قومیں جنہوں نے آزادی کے میدان میں ہمارے بعد قدم رکھا تھا اس اثنا میں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں لیکن ہم تھے کہ اس عرصے میں اپنے سفر کا رُخ بھی متعین نہ کر سکے۔ نئی نسل ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہ کرے گی۔

قومی اسمبلی کے انتخابات کے دن عوام نے جس شعور و آگہی کا ثبوت دیا اور وہ جس جوش اور ولولے سے اظہارِ حق کے لیے میدانِ عمل میں آئے وہ ہماری جمہوری جدوجہد کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ ابھی چند سال پیشتر تک ایک فوجی ڈکٹیٹر برملا کہا کرتا تھا کہ جمہوریت پاکستانیوں کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ حالانکہ ۷ دسمبر کے تجربوں نے ظاہر کر دیا کہ جمہوریت

پاکستانیوں کے خمیر میں شامل ہے اور ان کی فطری جبلت ہے۔ جس کو کبھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اب کہ عوام کا فیصلہ نوشتۂ دیوار بن کر سامنے آ گیا، یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ لوگوں میں نیک و بد میں تمیز کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ ان کا فیصلہ کہتا ہے کہ وہ ملک کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی نظام سے عاجز آ چکے ہیں اور اسے جلد از جلد بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر اُس نصب العین اور جماعت کے ساتھ ہیں جو سماجی انقلاب کی آرزومند ہے۔ انتخابی سرگرمیوں کے زمانے میں وہ کون سا حربہ تھا جسے حیلہ سازوں نے استعمال نہیں کیا۔ کبھی شور مچا کہ اسلام خطرے میں ہے لہٰذا اے سرفروشو! اٹھو اور اسلام کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دو، کبھی غل اٹھا کہ نظریۂ پاکستان خطرے میں ہے لہٰذا اٹھو اور پاکستان کے دشمنوں کا قلع قمع کر دو۔ سوشلزم اور سوشلزم کے حامیوں پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے گئے اور قومی اسمبلی کے انتخاب کو اسلام اور کفر کی جنگ سے تعبیر کیا گیا۔ اخباروں میں، مسجدوں کے خطبوں میں، جلسہ گاہوں میں حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تقریروں میں بائیں بازو کی جماعتوں کے خلاف نہایت اشتعال آمیز باتیں کہی گئیں اور اسلام پسندی کی ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی لیکن پروپیگنڈے کا یہ طوفان عوام کو متاثر نہ کر سکا۔ وہ اسلام پسندوں کے دھوکے میں نہ آئے اور کیوں آتے جبکہ انہیں اپنے روزمرہ کے تجربے سے معلوم تھا کہ سرمایہ پسندی کے عفریت نے اسلام پسندی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ انہوں نے اس لبادے کو پارہ پارہ کر دیا اور اسلام پسندوں کا مکروہ چہرہ سب کو نظر آنے لگا۔

قومی اسمبلی کا انتخاب کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی بلکہ دو متضاد سماجی قدروں اور نظریوں کے درمیان ایک تاریخی مقابلہ تھا۔ ایک طرف سماجی عدل و انصاف، جمہوریت اور مساوات کی قوتیں تھیں دوسری طرف لوٹ کھسوٹ، معاشی استحصال اور نابرابری کی قوتیں تھیں۔ ایک طرف دولت و اختیار تھا، سرمائے کی فراوانی تھی اور بے پایاں وسائل تھے۔ دوسری طرف تہی کیسہ اور تنگ دست عوام کا سوزِ یقین اور جذبۂ ایمان تھا۔ عوام کی اس بے پناہ قوت کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ تاریخ کا فیصلہ آپ کے سامنے ہے۔

انتخاب سے پیشتر قوم کے جھوٹے بیٹوں نے خوب خوب پیشین گوئیاں کیں اور اپنا دل خوش کیا۔ کبھی قوم کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ مجیب الرحمٰن کی مقبولیت کاغذ کی ناؤ ہے جو ڈوب رہی ہے اور مشرقی پاکستان کے لوگ جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر رہے

ہیں۔ کبھی یہ خوش خبری دی گئی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو چند بدقوارہ چھوکروں کے سوا کوئی منہ نہیں لگاتا لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ کوچہ زہاد میں اُلّو بول رہے ہیں اور قوم کی غالب اکثریت مجیب الرحمٰن اور بھٹو جیسے ''وطن دشمن انتشار پسندوں'' کے ساتھ ہے۔ اس معرکے میں کیسے کیسے پرانے گھاگ، کیسے کیسے گرگانِ باراں دیدہ کھیت رہے ہیں۔ اے۔ کے بروہی، جاوید اقبال، سومار، طفیل محمد، غلام اعظم، فضل القادر چودھری، نواب زادہ نصر اللہ خاں، ایوب کھوڑو، غلام محمد لونڈ خور، مولوی فرید احمد، حسن محمود، غرضیکہ اسلام پسندوں کی آستینوں میں جتنے بت پوشیدہ تھے ایک ایک کر کے منہ کے بل گر پڑے اور قوم نے ان کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اس انتخاب کا واحد مقصد ایک جمہوری آئین وضع کرنا ہے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی اکثریت کے بعد اب یہ اندیشہ باقی نہیں رہا کہ چار ماہ کے اندر آئین تیار نہیں ہوسکے گا۔ اب تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اگر عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں مفاہمت ہوگئی تو آئین معینہ مدت کے اندر بڑی آسانی سے وضع ہوسکتا ہے۔ البتہ ہمیں اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ آئین وضع ہونے یا جمہوریت کی بحالی سے عوام کے معاشی اور سماجی مسائل چشم زدن میں حل ہوجائیں گے۔ ان کے لیے تو طویل جدوجہد درکار ہوگی۔ البتہ ان انتخابات کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ان کی سیاسی جماعتوں نے ملک کے سماجی مسائل کو جو مذہبی رنگ دے رکھا تھا وہ رنگ اس انتخاب کے بعد اتر جائے گا۔ سرمائے اور محنت کی جنگ، جمہوریت اور طبقاتی آمریت کی جنگ، انصاف اور ظلم کی جنگ، افلاس اور فراوانی کی جنگ، علم اور جہل کی جنگ پر خوش نما اصطلاحوں کے جو پردے پڑے تھے اٹھ جائیں گے اور حقیقت اپنے اصلی خدوخال میں سامنے آجائے گی۔ اب کوئی شخص اسلام کے مقدس نام کو اپنے طبقاتی اور ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کرنے کی جرأت نہ کرسکے گا اور اگر کرے گا تو اس کا وہی حشر ہوگا جو اس انتخاب میں اسلام پسندوں کا ہوا۔

انتخاب میں تقریباً دو درجن سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے شرکت کی تھی۔ ان کے منشوروں میں ملک کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو حل کرنے پر بڑا زور دیا گیا تھا اور عوام سے بڑے بڑے خوش آئند وعدے بھی کیے گئے تھے لیکن انتخاب کے نتائج نے ظاہر کر دیا کہ ملک کی فقط دو جماعتیں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی قوم کی مزاج داں اور عوام کے جذبات، احساسات اور

خواہشات کی نبض شناس ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کا نصب العین سوشلزم ہے۔ اس کے برعکس وہ جماعتیں جو اسلامی نظام کی مدعی بن کر انتخاب لڑنے چلی تھیں عام لوگوں کے مزاج اور تیور پہچاننے میں بالکل ناکام رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ادھر ہم نے اسلامی نعرہ لگایا اُدھر لوگ ہمارے گلے میں ہار پہنانے دوڑ پڑیں گے۔ ان حضرات نے عوام کے سیاسی شعور کا اندازہ لگانے میں وہی غلطی کی جو اس سے پیشتر ایوب خاں نے کی تھی۔ بائیں بازو کی اس شاندار کامیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ عوام کو بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے سچے دوست اور بہی خواہ کون ہیں اور ان کو کن لوگوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے بیشتر رفقا تو تحریکِ پاکستان کے زمانے ہی سے سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ان کی سیاسی جماعت پرانی اور تجربہ کار جماعت ہے لیکن مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کی سیاسی عمر تو ابھی بہت کم ہے۔ پیپلز پارٹی کی باقاعدہ تنظیم کو ابھی مشکل سے دو سال ہوئے ہیں۔ اس مختصر مدت میں اس جماعت کو عوام میں بالخصوص سندھ اور پنجاب میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس جماعت نے بڑے نامساعد حالات میں انتخابات میں شرکت کی تھی۔ پارٹی کے اکثر و بیشتر کارکن جواں سال اور ناتجربہ کار تھے اور جو تجربہ کار تھے وہ قید میں تھے۔ میر علی احمد تالپور، مولانا کوثر نیازی، معراج محمد، مختار رانا غرضیکہ بھٹو صاحب کے کئی اہم رفیق اسیری کے باعث سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے محروم تھے لیکن پیپلز پارٹی ہمت نہیں ہاری کیونکہ عوام اس کے ساتھ تھے۔ اس نے تشدد کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔ اس کے ہر دلعزیز قائد نے اپنے طوفانی دوروں اور ان تھک محنت سے لوگوں کے حوصلے بڑھائے چنانچہ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ عوام کو سوشلزم سے متعارف کرنے اور اسلام پسندوں کو شکست دینے کا سہرا اگر کسی ایک فرد کے سر ہے تو وہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی ذات ہے۔ بھٹو صاحب کہا کرتے تھے کہ پاکستان کے پرانے لیڈر موئن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ ان کا قول سچ نکلا لیکن افسوس ہے کہ یہ آثار اس لائق بھی نہیں کہ ان سے سیاسی عجائب خانے سجائے جائیں۔ ان کا مقام تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ہی ہیں۔

اس کامیابی کے بعد پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اب یہ جماعتیں صوبائی جماعتیں نہیں اور اب شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ایک خطے کے نہیں بلکہ پوری قوم کے رہنما ہیں۔ اب ان کو اپنے قول اور فعل سے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اس منصب کے

اہل اور عوامی مفاد کے امین ہیں۔ عوام کے مسائل اور مفاد ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ سندھ میں ہوں یا بنگال، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں لہٰذا عوام کے ان رہنماؤں کو اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ مفاد تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے آپس میں ٹکراتے ہیں اسی لیے یہ حضرات کبھی صوبائی تعصبات کو ہوا دیتے ہیں اور کبھی لسانی، نسلی اور مذہبی اختلافات کو اُبھارتے ہیں۔ قومی رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ ان رجحانات کی مذمت کریں اور عوامی اتحاد اور دوستی کے عناصر کو تقویت دیں۔

یہ فتح پیپلز پارٹی کے لیے بہت بڑا امتحان ہے۔ اس فتح سے یہ حقیقت تو روشن ہوگئی ہے کہ مغربی پاکستان کی غالب اکثریت صوبائی عصبیت، مذہبی جنون، فرقہ پرستی اور قوم اور برادری کے تفرقوں سے محفوظ ہے لیکن سیاسی اقتدار کی راہ بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ اس راہ میں بعض بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ قدم قدم پر آزمائشوں کے ہیبت ناک ہفت خواں ملتے ہیں اور مکر و فریب کے سنہرے روپہلے جال بچھے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیپلز پارٹی کو بہت سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ اسے اپنی تنظیم کو ان موقع پرستوں اور ابن الوقتوں سے بچانا ہوگا جو ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ ان صاحبِ ثروت طبقوں اور افراد کی پیش کش کو رد کرنا ہوگا جو مخلص لوگوں کے ضمیر کو خریدنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اس جاہ پرست اور خوشامدی افسر شاہی کا زور توڑنا ہوگا جو اپنے سے بڑوں کے جوتے چاٹ کر اپنی قوت بڑھاتی ہے اور اپنے سے چھوٹوں کو ٹھوکر مار کر رعب قائم کرتی ہے۔

ہماری دِلی آرزو ہے کہ بائیں بازو کی سب جماعتیں ایک دل اور ایک زبان ہو کر ایک ساتھ آگے بڑھیں اور اپنے نصب العین کی تکمیل کے تاریخی فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔ پاکستان کے کروڑوں مظلوم اور مصیبت زدہ باشندوں کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی محبت، اپنا خلوص اور اپنی قوت اپنے محبوب رہنماؤں کی نذر کر چکے ہیں اور اس نذرانہ عقیدت پر خوش ہیں۔ عوام کی ان خوشیوں میں ہم ان کے شریک ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ خوشیاں پاکستان کے لیے ایک روشن اور تابناک مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔

۱۴۔۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء

دشمن کو حقیر نہ سمجھو

ملک میں جمہوریت کا عمل دخل ہنوز شروع نہیں ہوا ہے لیکن اہلِ ثروت طبقہ ابھی سے عوامی قوتوں کو ناکام اور بدنام کرنے کے منصوبے بنانے لگا ہے۔ خوف و ہراس کی ایک مصنوعی فضا پیدا کی جارہی ہے، سرمایہ کاری روک دی گئی ہے، کمپنیوں کے حصے بازارِ حصص میں پھینک دیے گئے ہیں مگر ان کا کوئی خریدار نہیں، چیزوں کے دام بڑھائے جا رہے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ اس معاشی بحران کی ساری ذمہ داری جمہوری طاقتوں پر ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این۔ آئی۔ ٹی) جیسے سرکاری ادارے بھی سرمایہ داروں کی اس سازش میں شریک ہیں۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان اداروں کے طرزِ عمل کے باعث بازارِ حصص کو ایک ہفتے میں دس کروڑ کا گھاٹا ہوا ہے۔ یہ مصنوعی بحران اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سیاسی جمہوریت، معاشی جمہوریت کے بغیر ایک ذہنی عیاشی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

کہتے ہیں کہ لنکا کے راجہ راون کے ایک ہزار ہاتھ تھے اور جب اس کا ایک ہاتھ زخمی ہوجاتا تھا تو وہ دوسرے ہاتھ سے لڑنے لگتا تھا۔ اسی طرح اربابِ ثروت کے بھی ہزار ہاتھ ہوتے ہیں۔ وہ آسانی سے ہار نہیں مانتے اور نہ اپنے سیاسی اور معاشی اقتدار سے ہنسی خوشی دست بردار ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عوام نے حالیہ انتخابات میں ان کو شکستِ فاش دی ہے مگر دولت وہ نشہ نہیں جس کو انتخابات کی ترشیاں اُتار سکیں۔ یوں بھی اس طبقے کی طاقت کا انحصار قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں سرمایہ پسند عناصر کی تعداد پر اتنا نہیں ہے جتنا دولت آفرینی کے ذرائع کی

اجارہ داری پر ہے۔ یہ طبقہ بینکوں اور بیمہ کمپنیوں، فیکٹریوں اور کارخانوں پر قابض ہے۔ درآمد اور برآمد کا سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں ہے۔ حصص کا بازار انھیں لوگوں کے اشارے پر تیز اور مندا ہوتا ہے۔ منڈیوں کے بھاؤ ان کی مرضی سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اشیا کی قیمتیں بھی وہی گھٹاتے بڑھاتے ہیں اور طلب و رسد کا تعین بھی وہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کے سرمایہ داروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔ غرضیکہ طلسمی پرند کے مانند ہمارے معاشی نظام کی جان اسی دولت مند طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہے ہماری معاشی زندگی کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ ہمیں دشمن کی اس بے پناہ طاقت سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

دولت مندوں کی اس معاشی طاقت کی چھاپ ہمیں ملکی قوانین اور نظم و نسق کے اداروں پر بھی ملتی ہے۔ بہ ظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ملکی قوانین سب سے یکساں سلوک کرتے ہیں اور انتظامیہ بالکل غیر جانبدار ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کے زمانے سے اب تک جتنے قوانین وضع ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا مقصد سماج کے موجودہ رشتوں کو برقرار رکھنا اور ذاتی ملکیت کے اداروں کو محفوظ کرنا تھا۔ لطف یہ ہے کہ جس افسر شاہی کے سپرد ان قوانین کا نفاذ ہے اس کی حکمتِ عملی اور طریقہ کار کی بنیاد بھی انھیں اصولوں پر رکھی گئی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت اور آمریت کی ٹکر ہو یا سرمایہ و محنت کا تصادم، شہری حقوق کے لیے جدوجہد کی جائے یا اُجرتوں پر اضافے کا مطالبہ ہو قانون اور انتظامیہ دونوں ہی عوامی تقاضوں کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں۔ کبھی امن برقرار کرنے کے بہانے دفعہ ۱۴۴ لگائی جاتی ہے، کبھی لازمی صنعت کی آڑ لے کر ہڑتالوں کو خلافِ قانون قرار دیا جاتا ہے، کبھی تحفظِ پاکستان کی خاطر لوگوں کو بلا مقدمہ چلائے اور عدالت میں پیش کیے گرفتار کر لیا جاتا ہے البتہ ایسا کوئی قانون موجود نہیں جس کے تحت ضرورت کی چیزوں کے نرخ بڑھانے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ ایسا کوئی قانون موجود نہیں جس کے تحت دوا علاج کی سہولتیں فراہم نہ کرنے پر مقدمہ چلے یا قوم کو جاہل رکھنے والوں سے باز پُرس کی جاسکے یا جس کے تحت بھوکے، بے گھر، ننگے اور بے روزگار عدالت کی زنجیریں ہلا سکیں۔

غرضیکہ ہماری معاشی اور سماجی زندگی فی الحال ایک مثلث کے اندر مقید ہے۔ اس مثلث کا ایک زاویہ سرمایہ دار طبقے کے مفاد کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسرا قانون اور تیسرا افسر شاہی کی علامت ہے۔ یہ تینوں زاویے ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و

مددگار بھی۔ اس مثلث کی طاقت کو توڑے بغیر عوام کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا اور نہ جمہوریت کا نوزائیدہ پودا پھل پھول لاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس مثلث کی طاقت کو توڑا کیسے جائے۔ مستقل اور پائیدار صورت تو یہی ہے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی آئین وضع کرتے وقت اپنے منشوروں کے اشتراکی اصولوں پر پوری دیانت داری سے عمل کریں کیونکہ عوام نے ان جماعتوں کو قومی اسمبلی میں اسی یقین پر بھیجا ہے کہ وہ ملک کی سماجی اور معاشی زندگی کو سوشلسٹ نظریے کے مطابق ترتیب دیں گے لیکن آئین تیار کرنے میں چار چھ مہینے صرف ہوں گے اور پھر آئین کے نفاذ اور جمہوری حکومت کے قیام میں بھی تھوڑا وقت ضرور لگے گا۔ اس اثنا میں کیا جمہوریت پسند عوام ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور سرمایہ داروں کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ ملک کے معاشی نظام کو تہس نہس کرنے کی سازشیں کرتے رہیں یا لوگوں پر مستقبل کے بارے میں خوف و ہراس پھیلاتے رہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا ملک ایک بڑے ہی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ایسے وقت میں جمہوریت پسندوں کی ذرا سی غفلت، کوتاہی اور سہل انگاری قوم کے حق میں بڑی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ دشمن اپنی صفوں کو از سرِ نو درست کر رہا ہے۔ اس نے ہار نہیں مانی ہے بلکہ اب نئے حربے استعمال کرنے کی فکر میں ہے لہٰذا بائیں بازو کی تمام جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ نئے خطروں پر سنجیدگی سے غور کریں، دشمن کو حقیر نہ جانیں بلکہ عوام کو نئی جدوجہد کے لیے منظم کریں۔ سرمایہ داری نظام کے خلاف جدوجہد سیاسی جمہوریت کی جدوجہد کا اگلا قدم اور آگے بڑھنے کا منطقی عمل ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنا تاریخی فریضہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ عوام نے دشمن کو سیاسی میدان میں پچھاڑا ہے عوام ہی اسے معاشی میدان میں بھی زک دیں گے بشرطیکہ بائیں بازو کی جماعتیں متحد ہوکر ان کی رہنمائی کریں۔

۲۱۔۲۷ دسمبر ۱۹۷۰ء

صراطِ مستقیم

آزادی کے بعد ہمیں اپنی حکومتوں اور اربابِ اقتدار کی سیاسی اور معاشی بداعمالیوں سے جو شکایتیں رہی ہیں وہ تو ہیں ہی، جبر و تشدد، منصب و زر کی ہوس، خود پرستی، خویش پروری، عوام دشمنی وغیرہ وغیرہ لیکن ہمارے باشعور طبقے کو سب سے زیادہ گلہ اُن مظالم کا ہے جو عوام کے جان وتن کے علاوہ ان کے دل و دماغ پر ڈھائے گئے ہیں۔ قومی یکجہتی کے نام پر، ملکی سالمیت کے نام پر، تحفظِ دین کے نام پر، کبھی زیرِ دست علاقوں سے اپنی تاریخ و تہذیب سے دست برداری کا مطالبہ کیا گیا، کبھی لاتعداد محبانِ وطن، دشمنِ وطن ٹھہرے، کبھی ان گنت براورانِ ملت کافر و مرتد۔ طرح طرح کے جتن کیے گئے، بھانت بھانت کے ڈھونگ رچائے گئے تاکہ عوام کے ذہن پر کسی ملکی، قومی، سیاسی، معاشی مسئلے کے بارے میں فکر و تدبر کا کوئی دروازہ کھلنے نہ پائے اور وہ آقاؤں سے اپنے دکھ درد کا دارو طلب کرنے کے بجائے ان کے اشاروں پر ناچتے رہیں۔ ان کاوشوں کا مقصد کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، مقصد محض یہ تھا کہ موجودہ معاشی اور سیاسی نظام پر آنچ نہ آئے اور اہلِ ثروت طبقوں کی بالادستی میں فرق نہ آنے پائے۔

حالیہ انتخابات میں ملکی عوام نے ان پرانے اربابِ اقتدار اور اربابِ سیاست سے اپنی بیزاری اور برگشتگی کا اعلان تو کر دیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گزشتہ تیئس برس میں عوام کے دل و دماغ میں تعصب، کوتاہ نظری، جذباتیت، شخص پرستی اور بےشعور تقلید کا جو زہر گھولا گیا ہے اس کے اثرات بھی ایک روز و شب میں زائل ہو گئے ہیں، اس زہر کا تریاق تو جبھی فراہم ہو گا

جب کوئی نئی سیاسی قیادت عوامی ذہن کی تربیت نئے سرے سے اپنے سر لے، ان کے لیے بنیادی عوامی مسائل کی اہمیت مرتب کرے اور اسی اہمیت کے مطابق ان کے لیے کوئی صحیح طریقِ فکر اور موثر طریقِ عمل متعین کرے، یہ صحیح طریقِ فکر اور موثر طریقِ عمل کیا ہے؟

صحیح طریقِ فکر یہ ہے کہ جو بھی مسئلہ درپیش ہو، انتخابات ہوں یا آئین سازی، قومی حقوق کا مسئلہ ہو یا زبان اور ذریعہ تعلیم کا قضیہ، کوئی بین الاقوامی میچ ہو یا کسی دور دراز ملک میں کسی فحش اور لغو کتاب کی اشاعت، اسے دو طرح سے دیکھنا چاہیے، اوّل یہ کہ ہمارے عوام اور محروم طبقوں کے روزمرہ دکھ درد، ان کے بنیادی مطالبات اور ان کی فوری ضروریات سے اس کا کس صورت میں اور کس حد تک تعلق ہے اور اس مسئلے کے بارے میں ایک یا دوسرا طریقِ عمل اختیار کرنے سے عوام کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کہاں تک امداد ملتی ہے۔

موثر طریقِ عمل یہ ہے کہ عوامی جدوجہد کی منزلِ مقصود یعنی عوامی راج کے راستے میں جو بھی قدم قدم پر کٹھن منزلیں اور مشکل مقامات آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی صحیح پہچان اور ہر ایک تک پہنچنے کا کوئی جادہ متعین ہو جس سے اِدھر اُدھر خود بھٹکنا یا دوسروں کو بھٹکانا گناہ ٹھہرے۔

ہمیں احساس ہے کہ ہمارے ملک کے موجودہ حالات اور موجودہ جذباتی فضا میں یہ کچھ آسان کام نہیں، اس کے لیے ہوا کے رُخ پر چلنے کے بجائے کبھی کبھی مخالف سمت میں بھی گامزن ہونا پڑتا ہے، کم سمجھی پر مبنی عوام جذبات کو بھڑکانے کے بجائے اس آگ پر حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی کے چھینٹے بھی دینے پڑتے ہیں اور عوام کو اُکسانے کے بجائے انہیں سمجھانے بجھانے پر کوشش صرف کرنی پڑتی ہے۔ قیادت کے معنی عوام کی تقلید کے نہیں رہنمائی کے ہیں اور قیادت کا فرض عوام کو ہدایت بہم پہنچانا ہے، ان کی جہالت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنا نہیں ہے۔

عوامی تحریکوں کے بل پر ہمارے ہاں جو نئی قیادت اُبھری ہے اس میں شاید ابھی اتنی خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکی کہ وہ ہر معاملے کو اس نظر سے دیکھ سکے لیکن اسے یہ احساس تو یقیناً ہوگا یا ہونا چاہیے کہ اب اُسے انتخابات کا مرحلہ درپیش نہیں ہے بلکہ وہ ذمہ داریاں درپیش ہیں جو انتخابات کے نتیجے میں عوام نے اسے تفویض کی ہیں۔ ان ذمے داریوں کا تعلق قومی اسمبلی کے اندر آئین سازی سے بھی ہے اور قومی اسمبلی کے باہر عوام کو روٹی، کپڑے اور مکان کی فراہمی سے بھی۔ ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فکر و نظر کی یک سوئی اور جہد و عمل کی راست قدمی کا تقاضا ہے کہ فروعی اور لاطائل قضیوں میں خود اُلجھنے اور دوسروں کو اُلجھانے سے احتراز کیا

جائے۔ وہ مقبولیت جو کسی ہنگامی ہیجان میں عوام کے کاندھوں پر سوار ہوکر حاصل کی جائے ہنگامی اورآنی جانی چیز ہے۔ مستقل اور پائیدار قیادت وہی ثابت ہوگی جو عوام کے صحیح مفادات کی تکمیل اوران کی بنیادی مشکلات کے تدارک کے لیے فکر وعمل کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رہے۔

یکم۔۷فروری ۱۹۷۱ء

عبرت ناک سانحہ

کراچی ایرپورٹ پر پولینڈ کے نائب وزیرِ خارجہ اور تین پاکستانی شہریوں کی اچانک ہلاکت ایک ایسا سانحہ ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہوائی اڈّے پر ہوائی جہاز کی خرابی سے موت واقع ہوسکتی ہے یا کسی شخص کو گولی یا بم سے قتل کیا جاسکتا ہے لیکن آج تک یہ کبھی نہیں سنا کہ لوگ کھلے میدان میں کھڑے ایک دوست ملک کے سربراہ کا خیر مقدم کررہے ہوں اور ایک وین دن دہاڑے ان میں گھس جائے اور بے گناہوں کو ہلاک اور زخمی کردے۔ اس حادثے کی وجہ سے پاکستان کی بین الاقوامی شہرت خاک میں مل گئی ہے اور ہر پاکستانی کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا ہے۔ صدرِ مملکت نے حادثے کی تحقیقات سپریم کورٹ کے ایک جج کے سپرد کردی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کے پیچھے جو حقائق پوشیدہ ہیں وہ تفتیش کے دوران میں منظرِ عام پر آجائیں گے اور مجرموں کو عبرت ناک سزا ملے گی۔

اس سانحے کی جو تفصیلات اب (۳ نومبر) تک اخباروں میں شائع ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک انتظامی اور دوسرا سیاسی۔ جہاں تک انتظامی امور کا تعلق ہے کراچی کے اربابِ اختیار نے جس حسنِ انتظام کا مظاہرہ کیا ہے اس کا ثبوت تو یہ ہے کہ پولیس کے دو اعلیٰ افسروں کو جو حفاظتی تدابیر کے ذمّہ دار تھے اپنے فرائض سے کوتاہی کے جرم میں معطل کردیا گیا۔ وین کا بلا روک ٹوک مجمع میں گھس آنا، جہاں پولینڈ کے صدر اور گورنر سندھ

کے علاوہ دوسری ممتاز شخصیتیں بھی کھڑی ہوئی تھیں خود ظاہر کرتا ہے کہ منتظمین نے ہوائی جہاز کے گرد حفاظتی دستوں کا کوئی حصار نہیں بنایا اور نہ اس وقت کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں جب پولینڈ کے صدر اور خیر سگالی وفد کے دوسرے ارکان میزبانوں سے گفتگو کر رہے تھے۔

انتظامیہ یہ کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہوسکتی کہ جن افسروں نے اپنے فرائضِ منصبی میں کوتاہی کی تھی ان کو سزا دی جاچکی ہے یا دی جائے گی کیونکہ مسئلہ فقط چند افراد کی غفلت کا نہیں ہے بلکہ افسر شاہی کے عام رویے اور رجحان کا ہے جو ہر ملک کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ مثلاً ہم کو وہ احتیاطی تدابیر بھی یاد ہیں جو امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی کراچی میں تشریف آوری پر اختیار کی گئی تھیں۔ اس وقت بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں کو آئزن ہاور کے دورے سے پہلے گرفتار کرلیا گیا تھا کہ مبادا ان کی موجودگی مسٹر آئزن ہاور کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ اسی طرح سالِ گزشتہ جب مسٹر نکسن لاہور میں تشریف لائے تو سیکورٹی کا نہایت مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ ہماری انتظامیہ میں فرض شناسی کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے البتہ بعض اوقات مستعدی اور کارکردگی کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور بعض اوقات ذمہ داریوں کے احساس پر غفلت اور کوتاہی کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ ہلاک ہونے والوں کی بدقسمتی ہے کہ منتظمین نے صدر پولینڈ کی تشریف آوری کو وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

لیکن اس سانحے کا سیاسی پہلو انتظامی پہلو سے بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔ یہ فیصلہ تو تحقیقاتی عدالت کرے گی کہ ڈرائیور فیروز کا ہلاکت خیز فعل ایک شخصِ واحد کا ذاتی فعل تھا یا اس کی تہ میں کوئی سازش چل رہی تھی البتہ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ یہ سانحہ اس مذہبی جنون اور تشدد پسندی کا قدرتی نتیجہ ہے جس کا مظاہرہ کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ علماء کرام سوشلزم کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ مسجد کے خطبوں، وعظوں اور سیاسی جلسوں میں سوشلزم کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اخباروں میں سوشلزم کے خلاف ایسے بیانات اور مضامین شائع کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والوں کے مذہبی جذبات برانگیختہ ہوں اور اب تو ٹی۔ وی اور ریڈیو سے بھی سوشلزم پر الحاد اور بے دینی کے الزام لگائے جا رہے ہیں۔ موجودہ انتخابات کو اسلام اور کفر کی جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سوشلسٹوں کے خلاف جہاد کو اسلامی فریضہ قرار دیا جاتا ہے۔ سوشلسٹوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ ہم

تمہاری زبانیں گدی سے کھینچ لیں گے اور پاکستان کو انڈونیشیا بنا دیں گے۔ سوشلسٹوں پر حملے کیے جاتے ہیں اور ان کے مکانوں پر نشان لگائے جاتے ہیں تاکہ وقت آنے پر حساب چکانے میں سہولت ہو غرضیکہ ملک میں نفرت، ناروا داری اور مذہبی تعصب کا ایک ایسا جارحانہ ماحول پیدا ہوگیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سوشلسٹ کو قتل کر دے تو جائے افسوس تو ہے جائے حیرت نہیں ہے۔ چنانچہ فیروز خود اس بات کا معترف ہے کہ اس نے کسی اضطراری کیفیت کے تحت یا غفلت میں لوگوں کو نہیں کچلا بلکہ وہ پولینڈ کے سوشلسٹ صدر کو قتل کرنا چاہتا تھا کہ اسلام کی اس کے نزدیک سب سے بڑی خدمت یہی تھی۔

قومی پریس کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز۔ پی۔ آئی۔ اے کی ''اسلام پسند'' یونین کا بڑا سرگرم کارکن تھا اور جماعتِ اسلامی سے اس کی وابستگی بھی اب پوشیدہ نہیں ہے۔ اس یونین نے گزشتہ ایک سال سے کراچی ایئرپورٹ پر تشدد کی فضا قائم کر رکھی ہے اور سوشلسٹوں کو مارنا پیٹنا یونین کے کارکنوں کا شعار بن گیا ہے۔ کسی سوشلسٹ کو قتل کر کے غازی یا شہید کا مرتبہ حاصل کرنا اس طرزِ فکر و عمل کا اگلا قدم ہوسکتا ہے۔

بعض ''اسلام پسند'' حلقے فرما رہے ہیں کہ اس سانحے کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہیے بلکہ اسے ایک دیوانے کا ذاتی فعل تصور کرنا چاہیے۔ یہ بڑی عجیب منطق ہے۔ آپ اسلام ایسے مقدس مذہب کو اپنے سیاسی اغراض کے لیے استعمال کریں، اسلام کا نام لے کر سیدھے سادے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل کریں، اسلام کے نام پر سوشلسٹوں کو قابلِ گردن زدنی قرار دیں اور جب کوئی سادہ لوح آپ کی تقریروں اور تحریروں سے متاثر ہو کر کسی سوشلسٹ کو سچ مچ قتل کر دے تو آپ اس قتل کو قاتل کا ذاتی فعل کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ بچوں کو بھرے ہوئے پستول سے کھیلنے کی اجازت دی جائے اور پھر یہ توقع کی جائے کہ کوئی زخمی نہیں ہوگا۔

اسلام امن کا سب سے بڑا داعی ہے اور پیغمبرِ اسلامؐ کا لقب رحمت اللعالمین ہے۔ اسلام نے کسی جماعت یا فرد کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ سیاسی عقیدے کی بنا پر کسی کو قتل کر دے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں اسلام کو الحمدللہ کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر ہے تو ان خود غرض عناصر سے جو ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ پس وقت آ گیا کہ تشدد پسند عناصر سے پاکستان کے امن، پاکستانی عوام کی جان و مال کی سلامتی اور پاکستان کے بین الاقوامی وقار کو جو خطرہ درپیش ہے اس کا مناسب سدِباب کیا جائے۔ اربابِ

اختیار نے اگر اس بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس نہ کیا اور مناسب قدم نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ کہیں کراچی ایر پورٹ کے سے سانحے روزمرہ کا معمول نہ بن جائیں۔ پاکستان کے محبِ وطن شہریوں کا فرض بھی ہے کہ وہ ملک وقوم کے حقیقی دشمنوں کو پہچان لیں اور تشدد پسند مذہبی دیوانوں کی باتوں میں نہ آئیں ورنہ ان کا وہی حشر ہوگا جو ہٹلر کے نازیوں کے ہاتھوں جرمن قوم کا ہوا۔(۳ نومبر ۱۹۷۰ء)

۹۔۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء

دولت آسمان سے نہیں برستی

صدرِ مملکت نے کیا خوب فرمایا کہ دولت آسمان سے نہیں برستی بلکہ جب تک سخت محنت نہ کی جائے زمین سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کا یہ ارشاد بہت بروقت تھا کیونکہ اپنی کوٹھیوں پر ہٰذا من فضلِ ربی کے کتبے آویزاں کرنے والے سرمایہ دار اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے اسلام فروش مُلا، گزشتہ ۲۳ سال سے یہی تلقین کر رہے ہیں کہ دولت عطیۂ خداوندی ہے۔ وہ لوگوں کی محنت مشقت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے دولت مند بناتا ہے اور جسے چاہتا ہے مفلس رکھتا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے لاڑکانہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہر شخص کو خواہ وہ کھیتوں میں کام کرتا ہو یا فیکٹری میں پیداوار بڑھانے کے لیے ان تھک محنت کرنی چاہیے۔ پیداوار بڑھے گی تو برآمدی تجارت میں اضافہ ہوگا اور ملک زیادہ زرِمبادلہ کمائے گا اور لوگ زیادہ خوش حال ہوں گے۔

صدرِ پاکستان کے مشورے سر آنکھوں پر مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے سماجی نظام میں جو لوگ اپنا خون پسینہ کر کے دولت پیدا کرتے ہیں وہی اس دولت سے محروم رہتے ہیں۔ کوئی شخص ہمارے کاشتکاروں اور مزدوروں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ کام چور ہیں یا مفت کی روٹی کھانے کے عادی ہیں۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں کام پر جاتے ہیں اور شام کے جھٹپٹے میں گھروں کو لوٹتے ہیں۔ وہ کھیتوں، کارخانوں اور دفتروں میں دن رات ایک کر کے ملک کی پیداوار بڑھاتے ہیں،

برآمدی تجارت میں اضافہ کرتے ہیں، زرِمبادلہ کماتے ہیں لیکن اس محنت کا انہیں اجر یہ ملتا ہے کہ ان کی جھونپڑیوں میں نہ روشنی ہے نہ پانی جبکہ ہذا من فضلِ ربیّ والوں کے بنگلوں میں دن کو بھی بجلی جلتی ہے اور ان کے لان کی گھاس پانی کی فراوانی سے ہر وقت تر و تازہ رہتی ہے۔ اِن کو نہ سواری کی سہولتیں ملتی ہیں نہ طبی امداد نصیب ہے اور نہ ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ چھانٹی اور بے روزگاری کا خطرہ اس پر مستزاد ہے۔

سوشلسٹ ملکوں کا تو ذکر ہی فضول ہے کیونکہ وہاں دولت پیدا کرنے کے تمام بنیادی ذریعے (زمین، کانیں، کلیدی صنعتیں وغیرہ) محنت کشوں کی اجتماعی ملکیت ہیں، خود مغرب کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے سرمایہ داروں کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ جب تک مزدور اور کاشتکار ذہنی اور مادّی طور پر آسودہ نہ ہوں پیداوار نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، امریکہ، فرانس اور مغربی جرمنی جیسے سرمایہ دار ملکوں میں بھی محنت کشوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں ضرور حاصل ہیں لیکن ہمارے ملک کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ذہنیتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ محنت کشوں کو اُجرت یوں دیتے ہیں گویا خیرات بانٹ رہے ہوں مگر عوام نے حالیہ انتخابات میں ووٹ دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے تاریخی منصب اور معاشی حق سے آگاہ ہو گئے ہیں اور دولت کی پیداوار میں اپنا جائز حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ صدرِ مملکت عوام کی خوشحالی کے خلوص سے خواہش مند ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ فقط پیداوار بڑھانے سے خوشحالی نہیں آتی کیونکہ گزشتہ ۲۳ سال کا تجربہ شاہد ہے کہ ملک کی پیداوار تو بڑھی ہے لیکن عوام خوش حال ہونے کے بجائے اور بدحال ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیداوار میں اضافے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے موجودہ معاشرتی اور معاشی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ سرمایہ داری نظام کے اندر رہتے ہوئے پیداوار بڑھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داروں کے نفع کی مقدار اور شرح بڑھائی جائے۔ اس سے محنت کشوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

صدرِ مملکت نے اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مہنگائی کا اصل سبب بازار کے غیر یقینی حالات ہیں۔ یہاں کئی سوال قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا حالات واقعی غیر یقینی ہیں، دوئم یہ کہ یہ غیر یقینی حالات کس نے پیدا کیے ہیں اور تیسرے یہ کہ جن عناصر نے یہ غیر یقینی حالات پیدا کیے ہیں ان سے کوئی باز پُرس ہونی چاہیے

یا نہیں۔ ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ غیر یقینی حالات مصنوعی اور فرضی ہیں قدرتی نہیں ہیں۔ اگر غیر یقینی حالات سے مراد یہ ہے کہ ابھی تک آئین وضع نہیں ہوا ہے اور نہ کوئی نمائندہ حکومت قائم ہوئی ہے تو عرض ہے کہ ملک میں تو گزشتہ دو سال بلکہ بارہ سال سے نہ کوئی جمہوری آئین رائج ہے اور نہ نمائندہ حکومت قائم ہے پھر انتخابات کے فوراً بعد کون سی مصیبت آ گئی کہ اشیائے صرف کی قیمتیں اچانک چڑھ گئیں۔ گزشتہ دو ماہ میں نہ تو فیکٹریوں اور کارخانوں کی پیداوار گھٹی ہے اور نہ کوئی ارضی یا سماوی آفت آئی ہے جس کی وجہ سے اناج، سبزیوں اور مویشیوں کی پیداوار کم ہو گئی ہو۔ پھر ان چیزوں کے دام کیوں بڑھ رہے ہیں۔ کیا سرمایہ داروں اور آڑھتیوں کی مانند یہ چیزیں بھی سوشلزم کے خوف سے ہراساں ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے موسمِ سرما میں جن دنوں ایوب خاں کے خلاف جلوس، جلسوں اور ہڑتالوں کا زور تھا تو غیر یقینی حالات کا عذر قابلِ قبول ہوسکتا تھا لیکن آج کل تو ملک میں مارشل لا کی مستحکم حکومت قائم ہے۔ ایسی حالت میں مہنگائی کے لیے غیر یقینی حالت کی دلیل اُن لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتی جو حکومت سے درمانِ درد اور درستیِ احوال کی توقع رکھتے ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ قبل جب مہنگائی شروع ہوئی تو صوبائی حکومتوں نے نگراں کمیٹیاں مقرر کی تھیں تاکہ اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ افسوس ہے کہ ان نگراں کمیٹیوں کی فرض شناسی اور کارکردگی کی تفصیلات سے ہم آگاہ نہیں ہیں لیکن قیمتوں میں مسلسل اضافہ خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کمیٹیاں اپنے فرائضِ منصبی میں ناکام رہی ہیں اور اب تو اربابِ اختیار نے پٹرول کی قیمت بڑھا کر دوسروں کو بھی قیمتیں بڑھانے کا جواز مرحمت کر دیا ہے۔ غالب نے چارہ سازی اور غم گساری کے اس انداز کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غم خوارِ جانِ درد مند آیا!

۲۵۔۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء

دولتِ مشترکہ اور ہم

دولت مشترکہ کی سترھویں کانفرنس اِن دِنوں سنگاپور میں ہو رہی ہے۔ بھان متی کے اس شعبدے میں اکتیس ملکوں کے نمائندے شریک ہیں۔ اس کانفرنس کی روحِ رواں برطانوی حکومت ہے اور کانفرنس میں ہوتا وہی ہے جو فرنگی چاہتے ہیں لیکن اب کے میزبانی کی سعادت پہلی بار ایک ایسے ایشیائی ملک کو نصیب ہوئی ہے جس کی آبادی اور رقبہ کراچی سے بھی کم ہے البتہ وہاں برطانیہ کا بحری بیڑا موجود ہے۔

یوں کہنے کو تو کانفرنس میں ایشیا اور افریقہ کے نمائندوں کی غالب اکثریت ہوگی (۲۷) اور آبادی کے اعتبار سے بھی دولتِ مشترکہ کے ہر دس میں سے آٹھ باشندے انھیں دونوں براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان نو آزاد ملکوں کے گلے میں پونڈ اور ڈالر کا پھندا اتنا سخت لگا ہے کہ بے چاروں کی زبان سے جی ہاں، جی حضور کے سوا دوسرا لفظ نکلتا ہی نہیں۔ وہ اپنی اکثریت کیا خاک منوائیں گے۔ ان کے لیے یہی کیا کم اعزاز ہے کہ برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے سفید فام نمائندے انھیں اپنے برابر بٹھاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً امداد کے لقمے کھلاتے ہیں۔

اس کانفرنس میں بعض نہایت اہم مسائل زیرِ بحث آئیں گے۔ مثلاً مشرقِ قریب میں اسرائیلی جارحیت، خلیج فارس کی عرب ریاستوں کا مستقبل، جنوبی افریقہ کو برطانوی اسلحہ جات کی فراہمی اور بحرِ ہند کے جزیرے گارچیا میں اینگلو امریکی فوجی اڈّے کا قیام۔ البتہ برطانیہ کے

وزیراعظم اس نسلی امتیاز اور بدسلوکی پر غور نہیں کریں گے جو برطانیہ میں مقیم کالے باشندوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے کیونکہ یہ برطانیہ کا نجی مسئلہ ہے۔ وہ کشمیر کے نزاع پر بھی غور کرنے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ کشمیر ہندوستان اور پاکستان کا نجی مسئلہ ہے۔ اسی طرح ویت نام میں مقیم آسٹریلین افواج کا مسئلہ بھی زیر بحث نہیں آئے گا کیونکہ یہ آسٹریلیا کا نجی مسئلہ ہے۔

کنیڈا کے وزیراعظم مسٹر ترودو اور برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ہیتھ نے سنگاپور جاتے ہوئے اسلام آباد میں صدر یحییٰ خاں سے بھی ملاقات کی تھی۔ غالباً اس ملاقات کا مقصد پاکستان کو اپنا ہم خیال بنانا تھا۔ معلوم نہیں حکومتِ پاکستان نے مسٹر ہیتھ کی دلیلوں کو تسلیم کیا یا نہیں لیکن مسٹر ہیتھ کی پریس کانفرنس اور ٹیلی وژن انٹرویو سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ صدر یحییٰ خاں سے ملنے کے بعد بھی مسٹر ہیتھ کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مثلاً مسٹر ہیتھ جنوبی افریقہ کو اسلحہ جات فراہم کرنے پر مصر ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کا دفاع ضروری ہے کیونکہ بحرِ ہند میں روسی جہازوں کی آمدورفت بڑھ گئی ہے۔ حیرت ہے کہ روسی جہازوں سے فقط جنوبی افریقہ ہی کو خطرہ لاحق ہے حالانکہ سنگاپور سے دارالسلام تک درجنوں ملک بحرِ ہند کے ساحل پر واقع ہیں مگر کسی نے اب تک اس خطرے کا اظہار نہیں کیا۔ نہ ملائشیا نے، نہ سیلون نے نہ پاکستان نے نہ سعودی عرب نے اور نہ تنزانیہ نے۔ دراصل روسی خطرہ ایک ایسا عذر ہے جس سے ہر سامراجی حکومت اپنی مجرمانہ حرکتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلحہ جات جنوبی افریقہ کے ''دفاع'' کے لیے فراہم نہیں کیے جا رہے ہیں بلکہ ان سے جنوبی افریقہ، رہوڈیشیا اور دوسرے مغربی مقبوضات میں افریقی باشندوں کی جنگِ آزادی کو کچلنے کا کام لیا جائے گا۔ ان علاقوں میں غالب اکثریت افریقیوں کی ہے لیکن ان پر حکومت کرتے ہیں مٹھی بھر سفید فام سامراجی۔ افریقیوں کو نہ ووٹ کا حق ہے اور نہ انہیں نظم و نسق میں شریک کیا جاتا ہے مگر برطانوی حکومت کو جنوبی افریقہ کی فاشسٹ حکومت اتنی عزیز ہے کہ وہ دولتِ مشترکہ کے افریقی اور ایشیائی ملکوں کو ناراض کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی لیکن جنوبی افریقہ کی یہ پاسداری خالی از علت نہیں ہے۔ اس کا باعث دونوں ملکوں کے سامراجی مفاد ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی ہیرے کی کانوں اور دوسری معدنی صنعتوں میں برطانوی سرمایہ داروں نے کروڑوں روپے لگا رکھے ہیں۔ اس سرمائے سے اب تک وہ اربوں روپے منافع کما چکے ہیں اور ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ دولتِ خداداد افریقی باشندوں کے تصرف میں آئے۔ اس کے علاوہ برطانوی بینک، انشورنس

کمپنیاں، جہاز راں ادارے اور درآمد برآمد کرنے والے سوداگر جنوبی افریقہ کی معیشت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں انگریز خاندان ہر سال برطانیہ سے ہجرت کر کے جنوبی افریقہ میں آباد ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ان کو برطانیہ سے زیادہ مراعات اور سہولتیں ملتی ہیں۔ برطانیہ کے قدامت پرست حلقوں کی نظر میں جنوبی افریقہ ایک مثالی ریاست ہے جہاں سفید فام آقاؤں کو کالے باشندوں کی جان ومال اور عزت وآبرو پر پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ ہیتھ کی قدامت پرست حکومت اس جنت ارضی کی حمایت اور حفاظت کے لیے بہت بے چین ہے اور چاہتی ہے کہ پاکستان اگر اس کا ساتھ نہ دے سکے تو کم از کم خاموش رہے لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے چنانچہ قرائن کہتے ہیں کہ دولتِ مشترکہ میں شریک ہونے والے افریقی ممالک۔ زیمبیا، تنزانیہ اور یوگینڈا — جنوبی افریقہ کو اسلحہ جات کی فراہمی کو افریقہ کی آزادی کے لیے زبردست خطرہ سمجھتے ہیں اور اگر برطانیہ اپنی ضد پر قائم رہا تو غالباً یہ ملک دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

دوسرا نزاعی مسئلہ جزیرہ گارچیا میں اینگلو امریکی فوجی اڈے کا ہے۔ یہ جزیرہ سیلون کے جنوب میں واقع ہے۔ سیلون دولتِ مشترکہ کا رکن ہے اور مسٹر ہیتھ دولتِ مشترکہ کے بڑے ثنا خواں ہیں لیکن انہوں نے نہ سیلون سے مشورہ کیا اور نہ دولتِ مشترکہ کی کانفرنس کا انتظار ضروری سمجھا بلکہ کانفرنس سے فقط ایک ماہ قبل واشنگٹن جا کر امریکہ سے فوجی اڈے کی ساز باز کر لی۔

مسٹر ہیتھ نے اس فوجی اڈے کے لیے بھی روسی خطرے کا عذر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ بحرِ ہند میں روسی جہازوں کی آمد ورفت سے دولتِ مشترکہ کا تجارتی راستہ غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ مانا کہ ہمارے آقاؤں کو بحرِ ہند کی حفاظت کا بہت خیال ہے لیکن حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے قبل اگر انہوں نے بحرِ ہند کے ساحلی ملکوں سے پوچھ لیا ہوتا تو ہم کو ان کے سامراجی عزائم پر شک کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ افسوس اس کا ہے کہ بحرِ ہند کے ساحلی ملکوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اینگلو امریکی سامراج کو حکم دے سکیں کہ بحرِ ہند سے اپنے اڈے ہٹاؤ ورنہ ہم انہیں نیست و نابود کر دیں گے۔ البتہ سیلون کی وزیرِاعظم مسز بندرا نائیکے دولتِ مشترکہ کی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کرنے والی ہیں کہ بحرِ ہند کو ''خطۂ امن'' قرار دیا جائے یعنی بحرِ ہند میں نہ فوجی اڈے قائم ہوں، نہ ایٹم بم کے تجربے کیے جائیں اور نہ تجارتی آمد ورفت میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے۔

اگر برطانیہ خلوصِ دل سے یہی چاہتا ہے کہ بحرِ ہند کا تجارتی راستہ محفوظ رہے تو اسے سیلون

کی تجویز منظور کر لینی چاہیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ گارچیا کے فوجی اڈّے کا مقصد تجارتی راستے کا تحفظ نہیں ہے بلکہ وہاں جاسوسی کا مرکز قائم ہو رہا ہے۔

دراصل برطانیہ اب ایشیا میں امریکی سامراج کا دلال بن گیا ہے اور اس کا کام فقط یہی رہ گیا ہے کہ امریکہ کے احکام پورے کرتا رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی دولتِ مشترکہ بھی سیٹو، سینٹو اور نیٹو کی مانند ایک سامراجی ادارہ ہے۔ اس کا مقصد برطانوی سامراج کے سیاسی اور معاشی مفادات کو تقویت پہنچانا ہے لہٰذا برطانیہ، کنیڈا اور آسٹریلیا کے لیے تو یہ ادارہ بہت مفید ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں کے لیے نہایت مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند حلقوں نے ابتدا ہی سے دولتِ مشترکہ کی مخالفت کی ہے اور ان کا مطالبہ ہے کہ پاکستان دولتِ مشترکہ کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے اور اپنی سیاست اور معیشت کی بنیاد کو اینگلو امریکی سامراج کے بندھنوں سے آزاد کر لے کہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار اسی پر ہے۔

۱۸۔۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء

ایشیا میں جنگ کی آگ

اس وقت جبکہ ہماری نظریں ملک کے بعض اہم داخلی امور پر لگی ہوئی ہیں ایک اور خطرہ ہے جو گھر کے قریب دستک دے رہا ہے۔ یہ لاؤس میں امریکی سامراجی فوجوں کی جارحانہ پیش قدمی ہے۔ نیپام بموں کی بوچھاڑ اور ٹینکوں کی یورش میں آتش و آہن کا ایک خونیں سیلاب ہے جو پورے ہند چینی کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ سامراجیوں کی یہ مداخلت کس وقت پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے بلکہ دنیا کا امن تہہ و بالا ہو جائے۔

امریکہ کے جنگجو فرماں رواؤں نے انسان کے لہو سے زر و مال کی کشید کا سامان یوں تو پورے ایشیا اور شرقِ اوسط میں کر رکھا ہے لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں یہ عمل زیادہ وسیع پیمانے پر اور سامراجی فوجوں کی براہِ راست نگرانی میں ہو رہا ہے۔ نیک دل اور صلح جو ایشیائی عوام کی بستیاں جو امن و آشتی کا مسکن تھیں جنگ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ امریکی جنگ بازوں کے ایشیائی حلیف، جو ان کے سامراجی مفادات کے نگراں ہیں ہموطنوں کا گلا کاٹنے کے لیے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

امریکہ کے صدر نکسن نے چند روز قبل ایک پریس کانفرنس میں شمالی ویت نام کی حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ شمالی علاقے پر ''لامحدود پیمانے'' پر بمباری کی جائے گی۔ انہوں نے اس امکان کی بھی تائید کی کہ شمالی ویت نام پر جنوب کی فوجیں حملہ آور ہوں گی۔ اُدھر کمبوڈیا اور پھر لاؤس میں جارحیت کا سلسلہ پہلے ہی پوری شدت سے جاری ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

وہ کون سا بین الاقوامی قانون یا اقوامِ متحدہ کا وہ کون سا ضابطہ ہے جس کے تحت امریکہ کو یہ اختیار سپرد ہوا ہے کہ وہ ہزاروں میل دور ایشیا کی سرزمین پر اپنی فوجیں لے کر آدھمکے اور ''علاقائی تحفظ'' کی ذمے داری کے تحت پہلے ویت نام کو تخت وتاراج کرے پھر حریت پسندوں کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے کمبوڈیا میں فوجی مداخلت کرے اور اس علاقے کو تباہ و برباد کرنے کے بعد لاؤس پر حملہ کردے کیونکہ شاہراہ ہوچی منہہ کی ناکہ بندی حریت پسندوں کے محاصرے کے لیے بے حد ضروری ہے اور امریکہ یہ حق رکھتا ہے کہ ویت نام میں اپنے جارحانہ تصرف کی خاطر جہاں چاہے اور جب چاہے حملہ کردے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا کا وہ کون سا قانونی یا اخلاقی اصول ہے جس کے تحت امریکہ، خدائی فوجدار بن کر دنیا بھر میں اپنی فوجیں بھیجنے اور اسلحہ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان مجرمانہ اور مجنونانہ کارروائیوں کی تائید کسی بھی قانونی یا اخلاقی ضابطے سے نہیں ہوتی۔ ایشیا کی سرزمین میں یہ مہیب اور بے پایاں تباہ کن کارروائیاں، یہ لرزہ خیز بربادی اور خوں ریزی، جس کی مثال انسان کی متمدن تاریخ میں نہیں ملتی محض اس لیے ہے کہ امریکہ، ایشیا میں اپنے سامراجی مفادات سے دستبردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس کی سامراجی معیشت اور اس کے مردم خور سرمایہ داروں کی سیاست کا بنیادی تقاضا بھی یہ ہے کہ جنگ جاری رہے۔ جنگ ایشیا میں ہو، جنگ مشرقِ وسطیٰ میں ہو، جنگ افریقہ میں ہو۔ اسلحہ کی مانگ بڑھتی رہے، جمہد آزما اور نوآزاد اقوام خاک وخون میں تڑپتی رہیں اور ان کی دولت سامراج کی صنعتی اور تجارتی مصلحتوں کے کام آتی رہے۔

طرفہ ستم یہ ہے کہ امریکہ کے جنگ باز حکمراں اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی اصول و آداب کی پروا نہیں کرتے بلکہ اُن معاہدوں اور وعدوں کو بھی نہایت بے شرمی سے نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں خود ان کی حیثیت بالادست فریق کی ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء کے معاہدۂ جینوا میں لاؤس کی غیر جانبدار حیثیت خود امریکہ نے تسلیم کی تھی لیکن اس نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا کہ جب ویت نام میں آگ لگی ہو تو اس کی سرحدیں لپکتے ہوئے شعلوں سے محفوظ نہیں رہ سکتیں چنانچہ امریکی فوجوں نے لاؤس کی غیر جانبداری کا احترام ایک دن بھی نہیں کیا۔ جنوبی ویت نام کی فوجیں امریکی بمبار طیاروں کی آڑ لے کر لاؤس پر بظاہر آج حملہ آور ہوئی ہیں اور معاہدۂ جنیوا کی دھجیاں آج اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن یہ جارحانہ روش تو بہت پرانی ہے اور اس کی پردہ پوشی کو خود امریکہ کے اربابِ اقتدار نے بھی نہیں کی۔ ۱۹۶۹ء میں

امریکی حکام نے سینٹ کی امور خارجہ کمیٹی کے روبرو یہ اعتراف کیا تھا کہ ہند چینی میں امریکی فوجوں کی مداخلت کبھی بند نہیں ہوئی البتہ الزام ہر مرتبہ شمالی ویت نام پر ڈالا گیا۔ اسی طرح ہوچی منہہ شاہراہ اور نواح کے علاقوں پر امریکی فضائیہ کی بمباری کا سلسلہ پچھلے سات آٹھ برس سے جاری ہے۔ لاؤس کے حریت پسندوں اور عام شہریوں کو اس ارادے سے ہدف بنایا جاتا ہے کہ امریکہ جنگ کا دائرہ وسیع کرکے اس پورے علاقے کو اپنے تصرف میں لینا چاہتا ہے تاکہ ایشیا میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ سکے۔

کمبوڈیا کی طرح لاؤس میں بھی امریکی فوجوں کے حملے کا اصل مقصد وہاں کی نامقبول حکومتوں کو سہارا دے کر حریت پسندوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے انہیں تیار کرنا ہے۔ لاؤس کی حریت پسند تنظیم ''پتھیٹ لاؤ'' کے یقینی اثر سے امریکہ سخت خوف زدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمبوڈیا میں حملے کے وقت، جہاں اس نے ویت کانگ کی ''پناہ گاہیں'' ختم کرنے کا عذر تراشا تھا وہیں لاؤس میں حملے کے موقع پر اس نے ہوچی منہہ شاہراہ کی ناکہ بندی کا ''عذر'' پیش کیا ہے۔ یہی وہ جارحانہ طریقِ استدلال ہے جس کے تحت امریکہ شمالی ویت نام پر حملے کو بھی ''جائز'' قرار دیتا ہے، اس کے بعد ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریہ چین پر حملے اور ایک خوفناک عالمی جنگ کے درمیان کتنا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

امریکی صدر نکسن نے برسرِ حکومت آنے سے پہلے ۱۹۶۴ء میں، ویت نام کی جنگ کے سانحے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ یہ لڑائی ہار رہا ہے کیونکہ اس کی پالیسی دفاعی نوعیت کی ہے اور پہل قدمی کی اہلیت سے خالی ہے۔ اُس وقت انہوں نے کہا تھا کہ امریکہ کے سامنے چارۂ کار یہی رہ گیا ہے کہ یا تو جنگ جیت لے ورنہ آئندہ ایک وسیع تر جنگ کے لیے تیار رہے۔ صدر نکسن نے برسرِ حکومت آنے کے بعد اس دوسرے طریقِ کار کا انتخاب کیا ہے لیکن اس کا انجام بھی امریکہ کے لیے ناکامی، تباہی اور ذِلت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ایشیا اور افریقہ کی بیدار قوتیں اور دنیا بھر کے امن پسند عوام اب پہلے سے کہیں زیادہ متحد، منظم اور بااختیار ہو چکے ہیں۔ اب قوموں کی آزادی اور ملکوں کی سلامتی کے فیصلے، امریکی جنگ بازوں کی صوابدید کے تحت نہیں بلکہ حریت پسند عوام کی اپنی خواہشات کے مطابق فیصل ہوں گے۔

یکم۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء

اسلامی کانفرنس

مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ کی ۳ روزہ کانفرنس ختم ہوگئی۔ اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد ہنوز واضح نہیں ہوئے ہیں اور نہ پتہ چلا ہے کہ اس اجتماع کے پیچھے کون کون سی قوتیں کارفرما ہیں لیکن صدرِ پاکستان نے اپنی افتتاحی تقریر میں اُن اصولوں کی نشان دہی کر دی ہے جن کے تحت حکومتِ پاکستان اس کانفرنس میں شریک ہوئی ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے فرمایا کہ یہ کوئی مذہبی کانفرنس نہیں ہے اور نہ ہم عالمی سیاست میں کوئی نیا اسلامی بلاک بنانے کے خواہشمند ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ اور افریقی ملکوں کی آزادی اور مسلم ملکوں کے درمیان معاشی ترقی کے لیے باہمی اتحاد و تعاون کی تدبیریں اختیار کریں۔

یہ بڑے زرّیں اصول ہیں لیکن کانفرنس کے دوران میں جو تقریریں ہوئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندوبین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اُن دشواریوں اور رکاوٹوں پر غور نہیں کیا جو محکوم مسلم ملکوں کی آزادی اور آزاد مسلم ملکوں کی معاشی ترقی کی راہ میں دیوارِ چین بن کر حائل ہیں۔ مقررین نے مسلمانوں کے اتحاد پر تو بڑا زور دیا لیکن اُن سیاسی اور معاشی مسائل سے گریز کیا جن کو حل کیے بغیر اتحاد کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں کیا؟

پہلا اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مراکش ہو یا سعودی عرب، ملائیشیا ہو یا انڈونیشیا جتنے ملک اس کانفرنس میں شریک ہوئے وہ سب صنعتی اعتبار سے بہت پسماندہ ہیں۔ ان کی معیشت کا دامن مغربی سامراج بالخصوص امریکی سامراج سے بندھا ہوا ہے اور ان کے تیل کے چشموں، گیس

کے کنوؤں، ربڑ اور چائے کے باغوں، ٹن اور چاندی کی کانوں اور دوسری خام اشیا پر امریکی، برطانوی یا ڈچ سامراجیوں کا قبضہ ہے۔ اس دولت کے تحفظ کے لیے سامراجیوں نے جگہ جگہ اپنے فوجی، بحری اور ہوائی اڈے قائم کر رکھے ہیں اور بیشتر ملکوں کو فوجی معاہدوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ کوئی ملک نیٹو کا رکن ہے، کوئی سیٹو کا اور کوئی سینٹو کا۔ قرضوں اور فوجی اور غیر فوجی امداد کا بوجھ اس پر مستزاد ہے۔ ایسی صورت میں اس قبیل کے ملکوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ فلسطین اور دوسرے محکوم مسلم ملکوں کی آزادی کے لیے کسی عملی جدوجہد میں شرکت کی جرأت کرسکیں گے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ اسرائیل امریکی سامراج کا آوردہ اور پروردہ ہے۔ وہی اسرائیل کو سرمایہ اور سامانِ جنگ فراہم کرتا ہے اور وہی اس کا پُشت پناہ بنا ہوا ہے لہٰذا اسرائیل کی جارحانہ حکمتِ عملی کی مزاحمت وہی قوتیں کرسکتی ہیں جو خود امریکہ کی دست نگر نہ ہوں یا جو سامراج کو امن اور آزادی کا دشمن سمجھتی ہوں۔ یہ درست ہے کہ اسلامی کانفرنس میں اسرائیل کے خلاف دُھواں دھار تقریریں ہوئیں اور اعلامیے میں اسرائیل سے مفتوحہ علاقوں کو خالی کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا مگر اسرائیل کا قلعہ فقط خالی خولی تقریروں اور اعلامیوں سے تو فتح نہیں ہوسکتا۔ لطف یہ ہے کہ اسرائیل کی مذمت کرنے والوں میں اُن اسلامی ملکوں کے نمائندے بھی شامل تھے جنہوں نے اب تک اسرائیل سے اپنے تجارتی اور سفارتی تعلقات بھی منقطع نہیں کیے ہیں۔ اگر اسلامی کانفرنس خلوصِ دل سے اس بات کی آرزو مند ہے کہ فلسطین آزاد ہو اور کانفرنس کا صدر مقام بیت المقدس ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ فلسطینی فدائیوں کی مالی امداد کرے، انہیں اسلحہ اور سامانِ جنگ فراہم کرے اور اردن کے شاہ حسین کو (جن کا نمائندہ کانفرنس میں شامل تھا) امریکہ اور اسرائیل سے خفیہ ساز باز کرکے فدائین کی قوت کو کچلنے سے منع کرے کیونکہ فلسطین اگر آزاد ہوگا تو فلسطینی مجاہدوں کی قربانیوں سے۔ جکارتہ اور کوالالمپور کی فوجیں فلسطینیوں کو آزاد کرانے نہیں آئیں گی۔

عالمِ اسلام کا دوسرا مسئلہ سماجی اور سیاسی ہے۔ اس سطح پر دیکھا جائے تو اسلامی دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف وہ ممالک ہیں جنہوں نے سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ مثلاً مصر، سوڈان، تنزانیہ، لیبیا، الجزائر، شام، البانیہ اور جنوبی یمن وغیرہ۔ ان ملکوں نے سامراجی قوتوں کو ملک بدر کر دیا ہے اور سامراج کے مقامی ستونوں (یعنی سرمایہ داروں، نوابوں اور جاگیرداروں) کو مسمار کر دیا ہے۔ ان ملکوں میں عوامی حکومتیں قائم ہیں اور وہ عام مسلمانوں کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف وہ ملک ہیں جن میں سرمایہ داری

اور جاگیرداری نظام اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ جاری وساری ہے۔ بیشتر مقامات پر بدترین قسم کی مطلق العنان بادشاہتیں قائم ہیں اور ملک کی تمام دولت اور طاقت پر شیخوں، شہزادوں اور تنکوؤں کا تسلط ہے اور جہاں مغربی طرز کی نام نہاد جمہوریتیں ہیں وہاں بھی اونچے طبقے ہی راج کرتے ہیں اور عام مسلمانوں کو زندگی کی معمولی سہولتیں بھی نصیب نہیں۔ اسلامی کانفرنس میں بدقسمتی سے غالب اکثریت اُنھیں ملکوں کی تھی جن میں مسلم عوام سیاسی اور معاشی اقتدار سے محروم ہیں۔ پس اسلامی کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کو اگر مسلمانوں کا درد ہے اور وہ واقعی ان کی معاشی خوشحالی کے خواہاں ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کے مسلمانوں کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور تنکوؤں سے نجات دلوانے کی کوشش کریں۔ چراغ پہلے اپنے گھر میں جلائیے ورنہ لوگ کہیں گے کہ

تو درونِ درچہ کر دی کہ برونِ خانہ آئی

مسلم ملکوں کا اتحاد بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اتحاد کا مقصد بھی نیک ہو۔ اگر اس اتحاد کا مقصد اسلامی دنیا کے رجعت پرست عناصر کو مجتمع اور منظم کرنا ہے، اگر اس اتحاد کا مقصد اینگلو امریکی سامراج کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینا ہے تو پھر ہم اس اتحاد کو عامتہ المسلمین کے لیے شگونِ بد تصور کریں گے کیونکہ حالیہ انتخابات کے تجربے شاہد ہیں کہ پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اسلام پسندی ہی کی آڑ لے کر مسلم عوام کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اسلامی کانفرنس کے سیکریٹری جنرل تنکو عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی تقریر میں جس ذہنیت کا اظہار کیا اس سے یہی شبہہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان کے پیشِ نظر مسلم عوام کا نہیں بلکہ رجعت پرست عناصر کا اتحاد ہے جو مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں اور زبان سے اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ اتفاق سے تنکو صاحب نے بھی پاکستانی اسلام پسندوں کی مانند انڈونیشیا ہی کی مثال دی اور فرمایا کہ

> ''ملکوں کی پالیسیوں اور نقطہ ہائے نظر میں اختلاف ہوا کرے لیکن کسی اور سیاسی نظریے کے مقابلے میں اسلام سب سے زیادہ موثر سیاسی قوت ہے اور یہ تمام تعصبات اور جماعتی اختلافات سے بالا ہے۔ ایک مثال سے میری بات واضح ہوجائے گی۔ جب پرانے (انڈونیشی) نظام نے ملائیشیا کو تباہ کرنے کی دھمکی دی اور میرے ملک کے خلاف کھلم کھلا جارحیت شروع کر دی تو یہ اصحابِ دین ہی تھے جنہوں

نے نفرت کی پالیسی کو شفقت میں بدل دیا۔ اسلام پر ہمارا ایمان ہی انڈونیشیا اور ملایشیا کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ بنا۔"

تنکو صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ وہ صدر سوکارنو ہی کا انڈونیشیا تھا جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی ہر ممکن طریقے پر مدد کی تھی اور وزیرِ خارجہ بھٹو سے کہا تھا کہ جتنا سامانِ جنگ درکار ہو شوق سے لے جاؤ اور وہ تنکو عبدالرحمٰن ہی کی "اسلامی" حکومت تھی جس نے پاکستان کی مخالفت اور ہندوستان کی حمایت کی تھی چنانچہ پاکستان کو ملایشیا سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے پڑے تھے۔ ایسی صورت میں پاکستان کے عوام "دین کے دشمن" سوکارنو کو اپنا دوست سمجھیں گے یا "اسلام پسند" سوہارتو، آدم ملک اور تنکو عبدالرحمٰن کو؟

ہمیں اسلامی کانفرنس کے مستقبل کے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے اور نہ غلط فہمی۔ اگر تنکو عبدالرحمٰن نے اس ادارے کو سامراجی سازشوں کا مرکز یا اسلامی دنیا کے رجعت پرست عناصر کی آخری پناہ گاہ بنایا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو سیٹو، سینٹو اور بغداد پیکٹ کا ہوا۔ البتہ اگر اس ادارے نے اپنے طرزِ عمل کو واقعی مسلم عوام کی فلاح و بہبود اور جمہوری آزادی کی جدوجہد سے ہم آہنگ کیا تو اسلامی کانفرنس کا یہ تاریخی کارنامہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

۴-۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء

چوتھا حصہ...... نیا پاکستان

(ماہنامہ "پاکستانی ادب" کے اداریے)
(نومبر ۱۹۷۴ء......اکتوبر ۱۹۷۷ء)

صفحہ نمبر ۳۱۴ سے ۳۶۲ تک

حرفِ آغاز

پاکستانی ادب کا پہلا شمارہ حاضر ہے۔ اس کے مندرجات اپنا جواز بھی ہیں اور ہمارے آدرش کا اظہار بھی مگر زمانے کی پرانی رسم یہی ہے کہ ہر جریدہ پہلی اشاعت میں اپنے اغراض و مقاصد کھل کر بیان کرے تاکہ ادیبوں اور پڑھنے والوں دونوں کو پرچے کا کردار متعین کرنے میں سہولت ہو۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ وہی جو پاکستان کا ہر محبِ وطن چاہتا ہے یعنی ایسا ادب جو زندگی کا ترجمان اور نقاد ہو۔ البتہ زندگی وہ بھی ہے جس کے شجرِ حیات میں حسن کے پھول کھلتے ہیں اور وہ بھی جو آکاس بیل کی طرح میوہ دار درختوں سے ان کا رس چوس لیتی ہے۔ ایک تخلیق کی مظہر ہے اور دوسری استحصال کی علامت۔ ان دونوں میں انتخاب کرنا چنداں دشوار نہیں۔

ہمارے ملک میں بہت دِنوں سے ایسے ادب کی بھرمار ہے جس کا مقصد لوگوں کو تھپک تھپک کر سلانا اور الف لیلوی محلوں کے رنگین خواب دکھانا ہے۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے تاکہ لوگ اپنے ماحول اور معاشرے بلکہ اپنی ذات کی اصل حقیقت سے بھی بے پروا ہو کر ماضی کے توہمات میں پھنسے رہیں، ان میں چھان پھٹک کا مادّہ پیدا نہ ہو اور نہ ان کے جمالیاتی ذوق کی سطح اونچی ہو حالانکہ سچا ادب وہی ہے جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کرے — سلائے نہیں — بلکہ تڑپائے — یہی وہ ادب ہے جو تخیل کے پروں پر اُڑتا اور زندگی کے مسائل کو فن کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ اسی کی بدولت ہم کو انسانوں کے پیچ در پیچ سماجی

رشتوں اور ان رشتوں سے پیدا ہونے والی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی ادب سے انسان کی شخصیت جاگتی ہے اور اس میں جینے کا حوصلہ اور زندگی کو حسین و خوش گوار بنانے کا ولولہ تیز ہوتا ہے۔

ہم ادب کو تفریح کا سامان یا بے کاری کا مشغلہ نہیں سمجھتے بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ادب ایک نہایت مفید تخلیقی عمل، ایک نہایت مقدس سماجی فریضہ ہے۔ ادب اپنے معاشرے کے کرب و اضطراب، خوشیوں اور غموں کی زندہ یاد داشت ہوتا ہے۔ ادب نہ ہو تو زندگی بانجھ ہو جائے۔ ہمارے ادیب کا قلم ایک حربہ ہے جس کی مدد سے وہ جھوٹ، تاریکی اور موت کی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ ہمیں اُن ادیبوں سے سروکار نہیں ہے جن کو اپنی ذات پر کائنات کا گمان ہے یا جو اپنی بغل کا پسینہ سونگھنے میں مگن ہیں البتہ پاکستانی ادب اُن تمام روشن خیال ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں کی تخلیقات کا خیر مقدم کرے گا جن کی تحریروں سے پیار کی خوشبو آتی ہو۔ اس زمین سے پیار کی خوشبو، اس زمین پر بسنے والوں سے پیار کی خوشبو۔ اور نفرت؟ اُن طاقتوں سے جو زندگی سے اس کا حسن، اس کی سچائی، اس کا رچاؤ سب کچھ چھین لینے پر تلی ہوئی ہیں۔

یوں تو تاریخ کا کوئی دور نظریاتی جنگ سے خالی نہیں رہا ہے اور نہ ادیبوں نے کسی عہد میں اس جنگ سے منہ موڑا ہے مگر آج جب کہ نظامِ کہنہ واقعی دم توڑ رہا ہے ہمارے ملک میں بھی نظریاتی جنگ نے بڑی شدت اختیار کرلی ہے۔ یہ جنگ ادب کے میدان میں بھی لڑی جارہی ہے بے شمار مورچوں پر۔ کوئی مورچہ ادب برائے ادب کا ہے، کوئی ابہام پرستی اور سریت کا، کوئی لایعنی اور بے مقصد ادب کا، کوئی مابعد الطبیعیاتی ادب کا اور کوئی ادب برائے زندگی کا۔ اس نظریاتی جنگ میں ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر شریک ہے کیونکہ ادیب مانے یا نہ مانے اپنی تحریروں میں زندگی کے کسی نہ کسی نظریے اور اقدار کے کسی نہ کسی نظام کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ پاکستانی ادب بھی اس نظریاتی جنگ میں غیر جانب دار نہیں ہے البتہ اس کی وابستگی عوام سے ہے۔

پاکستانی ادب کی زبان ہر چند کہ اردو ہے لیکن اس کاغذی پیرہن پر اردو کے علاوہ سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور دوسری زبانوں کی ادبی تخلیقات کے نقوش بھی جگمگائیں گے کیونکہ زبانیں خواہ پاکستانی ہوں یا بدیسی، عام انسانوں ہی کے وجود کا اقرار اور اُنھیں کے شعورِ زیست کا آئینہ ہوتی ہیں لہٰذا ہمیں دنیا کی جس زبان کے ادب سے بھی زندگی کی حرارت ملے گی، دنیا کے جس گوشے سے بھی ادراک و آگہی کی روشنی آئے گی ہم اس کو قبول کرلیں گے۔ اردو زبان کی بقا اسی

میں ہے کہ اس کی رگوں میں ہر دم تازہ خون دوڑتا رہے۔

اقلیم سخن میں ایسی کوئی وزارت نہیں ہے جو کسی زبان یا ملک کے ادب کو ''ناپسندیدہ شخصیت'' قرار دے۔ چنانچہ ہم جب پاکستانی ادب کی بات کرتے ہیں تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہوتے کہ ہم پاکستان کے گرد کوئی ثقافتی دیوار کھینچنا چاہتے ہیں یا بقیہ دنیا سے اپنا ناطہ توڑنے کی تلقین کرتے ہیں بلکہ ہمارا مقصد فقط اُن کروڑوں انسانوں سے ایکتا اور اپنائیت کا اعلان کرنا ہے جو ہمارا دن رات کا تجربہ ہیں، جن سے ہم براہِ راست فیض پاتے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ پاکستانی ادب بھی عالمی ادب ہی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ ہماری نظر میں غیر ملکی ادب بھی اتنا ہی محترم ہے جتنا لاہور، سکھر کراچی، پشاور اور کوئٹہ کا ادب۔

جہاں تک لسانی اختلافات کا تعلق ہے ہمارا ایمان ہے کہ ہر زبان کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ کسی ایک زبان کو دوسری زبان پر فوقیت نہیں دی جاسکتی لہٰذا جن افراد کا خیال ہے کہ اردو زبان ملک کی دوسری زبانوں کو پچھاڑ کر زندہ رہ سکتی ہے وہ اردو زبان ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ پاکستان کے بھی دشمن ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اردو کی آڑ میں ہمیشہ اقتدار کی پرستش کی ہے اور انہیں کے کرتوتوں کے کارن اردو پر یہ بے جا تہمت لگائی جاتی ہے کہ وہ استحصال پسندوں کی زبان ہے۔ البتہ ہم اُن لوگوں کے ساتھی بھی نہیں جو اردو کو دیس نکالا دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان مفاہمت کی زبان اردو ہی ہے۔ اس کا خاندان بھی وہی ہے جو یہاں کی دوسری زبانوں کا ہے۔ وہ دُور افتادہ بستیوں میں، ہوٹلوں، چائے خانوں میں، ریل گاڑیوں اور بسوں میں، کالجوں اور اسکولوں میں، کارخانوں اور دفتروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ایک عوامی کردار ہے۔ پس اردو زبان کو زک پہنچانا اپنی تہذیبی شخصیت کو مسخ کرنا ہے۔ ہم پاکستان کی سب زبانوں کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور ان کے ادب کو اپنا ادب خیال کرتے ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ اس چمن میں سب کو پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع نصیب ہوں۔

نومبر ۱۹۷۴ء

جرأتِ انکار

اب کے ۱۱ نومبر کو علامہ اقبال کا یومِ ولادت پاکستان میں بڑے پیمانے پر منایا گیا۔ چلیے ۲۷ برس کے بعد ہم کو یہ فیصلہ کرنے کی توفیق تو ہوئی کہ مفکرِ پاکستان کس تاریخ کو اور کس سن میں پیدا ہوئے تھے۔ البتہ علامہ اقبال کے یومِ ولادت کے موقع پر جو تقریریں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری تقریبوں میں ہوئیں ان کو سن کر بڑی حیرت ہوئی اور بار بار یہی خیال آیا کہ کیا جن بزرگ کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ وہی عظیم شاعر ہیں جن کی فکر کی گہرائی اور تخیل کی بلندی کا اعتراف ساری دنیا کرتی ہے۔

بعض شخصیتوں کو ان کے شہر کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، بعض شخصیتیں اپنے ملک سے منسوب ہو جاتی ہیں لیکن بعض شخصیتیں اتنی آفاقی ہوتی ہیں کہ ان کو کسی مقام، ملک، زبان، مذہب، نسل یا قوم کے حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال بھی ایسے ہی مردِ آفاقی تھے لیکن کچھ عرصے سے بعض حلقے اقبال کے شاہین کو ''تتلی کے جال'' میں گرفتار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان سوا بالیشتوں میں اقبال تک پہنچنے کی سکت اور صلاحیت نہیں ہے لہٰذا وہ اقبال کو ان کے اونچے مقام سے گھسیٹ کر اپنی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نام نہاد ارادت مندوں کی ان حرکتوں پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارا یہ فخر بالکل درست ہے کہ اقبال اُس سرزمین پر پیدا ہوئے جسے اب پاکستان کہتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اقبال نے بڑی وضاحت سے پاکستان کا تصور مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش

کیا تھا لیکن اقبال کے فکر وفن کا افق اس سے کہیں وسیع تھا۔ انہوں نے کائنات کا، انسان کا، اس کے منصب اور تاریخی کردار کا، معاشرے کا اور پھر اس معاشرے کے روشن مستقبل کا جو حسین نقشہ اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہ ہر مذہب وملت اور ہر ملک وقوم کے لوگوں کو فکر وعمل کی یکساں دعوت دیتا ہے۔ اقبال ہمارا ہی شاعر نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کا شاعر ہے۔ ایسے ہی جیسے ہومر، دانتے، فردوسی، سعدی، گوئٹے، شیکسپیئر اور غالب ساری دنیا کے شاعر ہیں۔ ان کو چھوٹے چھوٹے کوزوں میں بند کرنا ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو مجروح کرنا ہے۔

اقبال نے اردو شاعری کی ہیئت اور معنی میں جو انقلاب برپا کیا اس کا جائزہ چند صفحوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ انہوں نے ہمارے ذہنی شعور کو بیدار کرنے کا جو فریضہ ادا کیا ہے اس کے احسان سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ وہ ہمارا پہلا مفکر شاعر ہے جس نے تخلیقِ کائنات کے جامد تصور کی جگہ ارتقائے کائنات کا تصور پیش کیا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

ارتقا کا یہ فلسفہ نیا نہیں ہے۔ آپ کو اقبال سے پہلے کی اردو اور فارسی شاعری میں بھی اس کی مثالیں مل جائیں گی لیکن روایتی یا وجدانی انداز میں دنیا کو ''عالم تغیر'' کہہ دینا اور بات ہے اور اپنے پورے نظامِ فکر واحساس کا مدار فلسفۂ تغیر پر رکھنا دوسری بات ہے۔ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی فلسفۂ تغیر کی تفسیر ہے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس تغیر کی نوعیت بھی بیان کر دی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تغیر متضاد قوتوں کے آپس میں ٹکرانے سے ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اسی فلسفے کا منطقی نتیجہ عروجِ آدم اور عظمتِ آدم کا تصور ہے۔ یہی اقبال کے فکر وفن کا محور ہے۔ اقبال ہمارا پہلا شاعر ہے جس نے ہمیں انسان کے جوہرِ ذاتی کی طرف متوجہ کیا اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ اور اُبھرنے کے لیے بے چین ہیں ان کی نشان دہی کی۔ انسان نے تسخیرِ

کائنات کے جو کرشمے دکھائے ہیں ان کا ذکر اقبال بڑے حوصلے سے کرتے ہیں اور بڑی جرأت اور بے باکی سے اس کے کارناموں کا موازنہ خالقِ عالم کی تخلیقات سے کرتے ہیں (تو شب آفریدی چراغ آفریدم)۔

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی ہمسری بھلا فرشتے اور ملائکہ کیا کریں گے؟ لیکن شرط یہی ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہچانے کہ یہی خودی اس کی خدائی کی اصل ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ یہ خودی نہ ہو تو انسان، انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ جانور بن جاتا ہے اور یہ خودی بلند ہو تو ستاروں سے آگے جہاں بھی اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال اطاعتِ بندگی اور غلامی کے اسی لیے سخت دشمن ہیں کہ غلامی میں انسان کی خودی یعنی جو ہرِ ذاتی سلب ہو جاتی ہے۔ خودی کی موت دراصل انسان کی موت ہے۔

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انھیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام

آج ہمارے معاشرے کے مزاج میں اطاعت اور بندگی رچ بس گئی ہے۔ یہ اُس احساس کی موت ہے جو انسان کو اس کی اہمیت اور بڑائی پر ناز کرنا سکھاتی ہے۔ موجودہ نظام میں انسان کو اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کے لیے قدم قدم پر سمجھوتے کرنے پڑ رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے اس میں ''جرأتِ انکار'' نہیں پیدا ہوتی اور ''جرأتِ انکار'' کے فقدان نے اسے وہ سب کچھ اپنانے پر آمادہ کیا ہے جس سے وہ مسلسل نیچے گرتا جا رہا ہے۔ اقبال کے کلام میں ہمیں جا بجا ''جرأتِ انکار'' کا اظہار ملتا ہے۔

اقبال اپنے معاشرے سے اسی وجہ سے بے زار ہیں کہ اس معاشرے میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کو اپنی خودی کو پہچاننے اور اپنی فکری صلاحیتوں کو اُبھارنے اور چمکانے کا موقع نہیں ملتا اور ان کا ایمان ہے کہ جب تک جاگیری اور سرمایہ داری نظام اور ملوکیت اور شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں ہوگا انسان بندۂ مجبور بنا رہے گا۔ اس کی خودی کے جوہر اُسی وقت چمکیں گے جب سلطانیِ جمہور کا نظام قائم ہوگا۔

لیکن افسوس ہے کہ اربابِ اختیار اور ان کے ہم نوا دانش وروں نے اقبال کی سوچ کے انقلابی پہلوؤں کو ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو گزشتہ ۲۷ برس سے اقبال کا کلام ریڈیو سے دن رات نشر کیا جاتا ہے۔ علمائے کرام جنھوں نے اقبال کی زندگی میں ان پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے ان کا کلام جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں، قوالی کی محفلوں میں انھیں کے اشعار گونجتے رہتے ہیں، تجارت پیشہ اخبار یوم اقبال کے موقع پر خاص ایڈیشن نکالتے ہیں لیکن یہ تمام لوگ اقبال کے کلام کے اُن حصوں سے کترا کر نکل جاتے ہیں جن میں اقبال عام آدمی اور معاشرے کی انقلابی ضرورتوں کی بات کرتے ہیں۔

ثقافتی دیوارِ چین کھینچ کر ہم اپنے فکر و فن کا دائرہ مسلسل تنگ کر رہے ہیں۔ اس ذہنیت کی ہمیں بڑی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اگر اس رجحان کو نہ بدلا گیا تو ہماری تخلیقی صلاحیتیں اور فکر کے چشمے خشک ہو جائیں گے اور ہم مینڈک کی طرح کنوئیں کے دائرے کو ہی دنیا سمجھتے رہیں گے۔ اقبال کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹا کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے وہ بھی اسی ذہنیت کا ایک پہلو ہے اور اگر ہم اقبال کو یوں ہی چھوٹا کرتے چلے گئے اور اقبال کی شخصیت یوں ہی سکڑتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب اقبال مردِ آفاقی کے بجائے فقط سیالکوٹ کے شاعر رہ جائیں گے۔

دسمبر ۱۹۷۴ء

ادھورا فیصلہ

نہ جانے کون سی نیک یا نحس ساعت تھی جب ہمارے آئین سازوں نے ترنگ میں آ کر ۱۹۵۶ء کے آئین میں اردو اور بنگالی کو ''ریاستی'' زبانوں کا درجہ دیا تھا۔ بنگالی زبان سے تو آدھا ملک گنوا کر چھٹکارا مل گیا لیکن اردو گلے کی ہڈی بن گئی ہے جو نہ نگلی جائے نہ اُگلی جائے بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں تو اس کا رتبہ اور بڑھا دیا گیا ہے۔ اردو اب خیر سے ہماری ''قومی'' زبان ہے۔

مگر ۱۹۵۶ء کے آئین کی دفعہ ۲۱۴ میں جہاں اردو اور بنگالی کو ریاستی زبانیں قرار دیا گیا تھا وہیں یہ شق بھی لگا دی گئی تھی کہ بیس سال تک انگریزی تمام سرکاری مقاصد کے لیے بدستور استعمال ہوتی رہے گی اور اس مدت کے گزر جانے کے بعد بھی پارلیمنٹ کو یہ اختیار تھا کہ انگریزی کا استعمال بدستور جاری رکھنے کے لیے قانون وضع کرے اور یہ بھی کہ دس سال کے بعد صدرِ مملکت ایک کمیشن مقرر کریں گے جو انگریزی کو ہٹانے کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کرے گا۔

کچھ اسی قسم کے دعوے فیلڈ مارشل ایوب خان کے آئین میں بھی موجود تھے لیکن تقریباً بیس سال گزر گئے نہ کوئی کمیشن بیٹھا اور نہ انگریزی کا دور دورہ ختم ہوا۔ سرکاری دفتروں میں، سرکاری تقریبوں میں، سرکاری خط و کتابت میں ہر جگہ انگریزی ہی چلتی رہی۔ جس کو انگریزی نہیں آتی اس کا کسی اعلیٰ عہدے تک پہنچنا آج بھی محال ہے۔ مقابلے کے امتحان انگریزی میں ہی

ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ ۱۹۷۳ء کے جمہوری آئین کی دفعہ ۲۵ کی رُو سے ’’پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ پندرہ سال کے اندر یہ زبان سرکاری اور دوسرے مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگے‘‘ لیکن یہاں بھی یہ شق لگا دی گئی ہے کہ جب تک اردو زبان اپنی جگہ نہ لے لے اس وقت تک انگریزی سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کی جا سکے گی۔ نئے آئین کو نافذ ہوئے بھی ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے مگر اس اثنا میں اربابِ اختیار نے انگریزی کو ہٹانے کی اگر کوئی تدبیر اختیار کی ہے یا کوئی منصوبہ بنایا ہے تو کم از کم ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھلجھڑیاں سی ہیں جنہیں موقع موقع سے چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کو تالیاں پیٹنے کا موقعہ فراہم کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ جب سردار عبدالرب نشتر مغربی پاکستان کے گورنر تھے تو انہوں نے اردو سے اپنی محبت اور لگاؤ کی بنا پر بجٹ اردو میں پیش کیا تھا جس پر ملک بھر میں بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ اخباروں نے اداریے لکھے تھے اور ہفتوں سیاسی لیڈروں اور انجمنوں کے تعریفی بیانات چھپتے رہے تھے مگر ایک فرد کا کارنامہ سرکاری اور دفتری سطح پر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ سردار نشتر کے اس اقدام کو سراہنے کے باوجود سرکاری نوٹ، اعلانات اور رسمی تقریروں کی زبان انگریزی ہی رہی۔ قومی اسمبلی میں آئین پاس ہوتا ہے تو وہ بھی انگریزی میں، صوبائی اسمبلیوں کی کارروائیاں بھی انگریزی زبان میں ہی انجام پاتی ہیں۔

البتہ پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے یہ فیصلہ کیا کہ اردو زبان کو بھی بحث اور مقدمات کی کارروائی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت مناسب اقدام ہے۔ اس کی وجہ سے مقدموں کے فریقین کو بہت سہولت ہوگی۔ اس اعلان کے فوراً بعد جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب نے ایک مقدمے کا فیصلہ اردو میں سنایا۔ یہ ایک بہت حوصلہ افزا رجحان ہے۔ چیف جسٹس نے یہ تجویز پیش کر کے دوسرے سرکاری اداروں کو بھی راہ دکھائی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے دفاتر اور سرکاری شعبے انگریزی کی جگہ اردو کو کب دیتے ہیں۔

جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے ہمیں اس کی افادیت سے کوئی انکار نہیں مگر ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ آخر عدالتی کارروائی یا کوئی بھی دوسری کارروائی جب اردو میں ہو سکتی ہے تو علاقائی زبانوں میں کیوں نہیں ہو سکتی؟——

دیہاتوں اور چھوٹی بستیوں میں رہنے والے بیشتر لوگ اردو نہیں جانتے۔ ان کے لیے کسی عدالتی کارروائی میں جو اردو میں کی جائے حصہ لینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا انگریزی میں۔ اس لیے جب عوام کی سہولت کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے تو پھر مکمل طور پر اس کی افادیت کو بروئے کار لانا چاہیے اور اس سلسلے میں تمام چھوٹی بڑی عدالتوں میں اردو کے ساتھ علاقائی زبانوں میں بحث کرنے اور فیصلے لکھنے کی اجازت بھی ہونی چاہیے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ علاقائی زبانوں کی آڑ لے کر اردو کی ترویج کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جائے اور انگریزی ہم پر بدستور مسلط رہے۔

جنوری ۱۹۷۵ء

بیمار ذہنیت

کسی زبان کے حسّی تجربات یا ادبی تخلیقات کو دوسری زبان میں اس خوش اسلوبی سے منتقل کرنا کہ مصنّف کا مافی الضمیر پوری طرح واضح ہوجائے اور حسنِ بیان میں بھی فرق نہ آئے بہت مشکل کام ہے۔ کامیاب مترجم وہی ہے جس کو دونوں زبانوں پر پورا عبور حاصل ہو، جو مصنّف کی تحریر کی اصل روح سے، اس کے معنی و مفہوم سے، اس کے رموز و علامات سے بخوبی واقف ہو اور جو دونوں زبانوں کی لسانی باریکیوں کو سمجھتا ہو۔

ادبی مضامین یا کہانیوں کے ترجمے میں جو دشواریاں ہوتی ہیں ان پر تو کسی نہ کسی طرح قابو پالیا جاتا ہے البتہ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا واقعی لوہے کے چنے چبانا ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کو ادب سے محبت ہے، جو چاہتے ہیں کہ ان کی زبان کا خزانہ نئے نئے خیالات، نئے نئے حسّی تجربات، نئی نئی تشبیہوں، استعاروں اور بندشوں سے مالا مال ہو وہ دوسری زبانوں کی شاعری کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی حتی الامکان پوری کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کو لیجیے اس میں آپ کو ہومر، دانتے، گوئٹے، رومی، حافظ، عمر خیام، فردوسی، پشکن، امیر خسرو، کبیر، شاہ عبداللطیف، خوش حال خاں خٹک، بابا فریدؒ، غالب، اقبال غرض کہ دنیا کی بیش تر زبانوں کے شاعروں کے ترجمے مل جائیں گے۔ البتہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ ترجمے سو فیصد اصل کے مطابق ہیں۔ بیشک ان ترجموں پر اعتراض بھی ہوئے ہیں، ان کی خامیوں کی نشان دہی بھی ہوتی رہی ہے لیکن ہم نے آج تک کسی انگریزی داں کے منھ سے یہ نہیں سنا کہ ان شاہکاروں کا

ترجمہ انگریزی زبان میں سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

مگر بعض کرم فرما ہم سے اس بات پر خفا ہیں کہ پاکستانی ادب میں جناب نجم حسین سید کی پنجابی تحریروں کے جو ترجمے شائع ہوئے ہیں وہ بہت ناقص ہیں۔ ممکن ہے یہ اعتراض درست ہو۔ ہر چند کہ جن لوگوں نے اردو میں ترجمے کیے خلوص و محبت سے کیے اور دونوں زبانوں سے بخوبی واقف ہونے کی بنا پر کیے لیکن ایک صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اردو زبان جناب نجم حسین سید کے حسی تجربوں اور لسانی باریکیوں کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی اس لیے کہ پنجابی شاعری کی انقلابی روح اردو میں (جو اقتدار کی زبان ہے) منتقل نہیں کی جا سکتی۔ مراسلہ نگار نے شاید اسی وجہ سے اپنا مکتوب اردو جیسی انقلاب دشمن زبان کے بجائے انگریزی میں لکھا ہے کہ وہ پاکستان میں نہ اقتدار کی زبان ہے اور نہ انقلاب دشمن ہے۔ ہم مکتوب نگار کا اصل خط اور اس کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ قارئین کی سہولت کے لیے کسی اور صفحے پر شائع کر رہے ہیں۔ (دیکھیے عنایت کی نظر)۔

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ ہمارے ادیب اپنی جڑوں کا سراغ لگانے، اپنی اصل کو پہچاننے اور اپنی ذات کا تجربہ کرنے کی کوشش اپنی مادری زبان کے حوالے سے کر رہے ہیں لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم دوسروں کی زبان کو خواہ وہ کتنی ہی پسماندہ اور مفلس کیوں نہ ہو یہ کہہ کر مطعون کریں کہ تمہاری زبان تو اقتدار کی زبان ہے، تمہاری زبان تو انقلاب دشمن زبان ہے۔ کسی زبان پر اس قسم کا اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو علمِ لسانیات کی ابجد سے بھی آگاہ نہ ہو۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اقتدار پرست یا اقتدار کا دشمن ہونا، انقلابی یا انقلاب دشمن ہونا انسانوں کی طبقاتی خصوصیت ہے۔ چنانچہ انسانوں کی یہ دونوں قسمیں آپ کو پنجابی اور اردو بولنے والوں میں بھی ملیں گی اور سندھی، پشتو اور بلوچی بولنے والوں میں بھی اس لیے کہ ان سب کا معاشرہ طبقاتی معاشرہ ہے لیکن زبان تو خواہ وہ اردو ہو یا پنجابی، سندھی ہو یا پشتو، انگریزی ہو یا جاپانی نہ اقتدار پرست ہوتی ہے نہ اقتدار کی دشمن، نہ انقلابی ہوتی ہے نہ انقلاب کی مخالف اس لیے کہ وہ کسی طبقے کی ملکیت نہیں ہوتی۔ انسان چاہے تو اس میں اقتدار کے حق میں بھی اظہارِ خیال کر سکتا ہے اور اقتدار کی رد میں بھی۔ انقلاب کے گیت بھی گا سکتا ہے اور انقلاب کو برا بھلا بھی کہہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں آپ کو ترقی پسند اور رجعت پرست دونوں انداز کی تحریریں ملیں گی۔

برطانوی سامراج اس خطے پر سَو سال تک مسلط رہا۔ اس نے انگریزی زبان کو یہاں کی سرکاری زبان بنایا۔ محبانِ وطن نے انگریزوں کے اس طرزِ عمل کی برابر مخالفت کی لیکن کسی نے انگریزی زبان پر یہ تہمت نہیں دھری کہ وہ انقلاب دشمن زبان ہے یا اقتدار پرست زبان ہے اس لیے کہ انگریزی زبان کلائیو، کرزن اور چرچل ہی کی زبان نہ تھی بلکہ سی۔ ایف اینڈریوز، برنارڈ شا، برٹرنڈرسل اور بے شمار اُن انگریزوں کی زبان بھی تھی جو ہندوستان کی آزادی کے خواہاں تھے۔

اردو کو تو ملک میں وہ مرتبہ بھی کبھی نصیب نہ ہوا جو انگریزی زبان کو ملا اور اب بھی حاصل ہے۔ وہ تو کبھی سرکاری زبان ہی نہیں رہی۔ وہ مغلوں کے دور میں پلی بڑھی لیکن مغلوں نے اسے کبھی سرکاری زبان کا درجہ نہ دیا بلکہ یہ شرف آخر وقت تک فارسی ہی کو ملتا رہا۔ اردو کو اگر فروغ ہوا، اردو اگر ملک کے بیشتر خطوں میں مفاہمت کی زبان بنی تو اس وجہ سے نہیں کہ مغلوں نے یا انگریزوں نے اس کی سرپرستی کی یا لوگوں پر اس کو زبردستی ٹھونسا بلکہ اس وجہ سے کہ اردو زبان لوگوں کی لسانی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔ آج بھی پاکستان اور ہندوستان کے ایک صوبے کے لوگ اگر دوسرے صوبے کے لوگوں سے اردو میں بات چیت یا خط و کتابت کرتے ہیں تو کسی نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور تو نہیں کیا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ مطالبہ تو ہوتا نہیں کہ غیر ملکی زبان کو ہٹا کر اس کی جگہ پنجابی یا سندھی یا پشتو یا بلوچی یا اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنایا جائے جیسا کہ ترکی، ایران، عرب ممالک اور یورپ وغیرہ میں ہے نزلہ اردو پر گرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اردو زبان کی روایت یا اس کا مزاج انقلاب دشمن ہے۔ تو جیسا پہلے عرض کیا گیا انقلابی اور انقلاب دشمن روایت ہمارے ملک کی ہر زبان میں موجود ہے اس لیے کہ یہاں کی ہر زبان کے بولنے اور لکھنے والے انقلاب پسند بھی رہے ہیں اور انقلاب کے دشمن بھی۔ اس اعتبار سے اردو کا کردار دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔ پھر بھی ہم پوچھتے ہیں کہ غدرِ دہلی کے زمانے میں وہ کس زبان کے اخبار تھے جنھوں نے بڑی دلیری سے انگریزوں کو للکارا، وہ کس زبان کے شاعر، ادیب اور ایڈیٹر تھے جن کو توپ دم کیا گیا، پھانسی دی گئی یا کالے پانی بھیجا گیا، جنگِ بلقان سے تحریکِ پاکستان تک مسلمانوں کی ساری جدوجہد کس زبان میں ہوتی تھی، ان کی نظمیں اور مقالے اور اداریے کس زبان میں لکھے جاتے تھے، مولانا شبلی، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے درجنوں اہلِ قلم کس زبان میں لکھتے تھے اور اپنے لکھے کی سزا پاتے تھے، اقبال کا انقلاب آفریں کلام کس زبان میں ہے اور ترقی

پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ادیبوں کی اکثریت کس زبان میں لکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی انقلابی روایت بڑی درخشاں ہے۔ چنانچہ اردو کی انقلابی تحریروں کو اگر یکجا کیا جائے تو کئی دفتر تیار ہو جائیں گے اور ان کا پلہ دوسری زبانوں سے ہلکا نہ رہے گا۔

آخر میں ہم اپنے کرم فرماؤں سے بصد ادب عرض کریں گے کہ اقتدار کی کوتاہیوں کا الزام کسی زبان خواہ وہ انگریزی ہو یا اردو کے سر تھوپنا مناسب نہیں ہے۔ زبان تو فقط آلۂ کار ہوتی ہے، ذریعہ ہوتی ہے جس طرح دیا سلائی کہ اس سے گھر روشن بھی کیا جاسکتا ہے اور جلایا بھی جاسکتا ہے۔ اپنی تہذیبی جڑوں کو اپنی زبان کے حوالے سے ضرور تلاش کیجیے، اس احساسِ بیگانگی کو بھی ضرور دور کیجیے جو سامراجی اقتدار کا ورثہ ہے لیکن دوسری زبانوں اور ان کے ادب سے نفرت کرنا بیمار ذہنیت کی علامت ہے بلکہ ہم تو کہیں گے کہ جو شخص دوسروں کی زبان اور ادب کا احترام نہیں کرتا اس کو اپنی زبان اور ادب سے بھی سچی محبت نہیں ہوسکتی۔ آیئے ہم سب مل کر ایک دوسرے کی زبانوں کو علم و ادب کے خزینوں سے بھرنے کی کوشش کریں اس لیے کہ پاکستان کی سب زبانیں ابھی بہت تہی مایہ ہیں۔ ابھی تو ہم اس لائق بھی نہیں ہوئے ہیں کہ سائنسی اور حکیمانہ ادب میں مغرب کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کی ہمسری کرسکیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بدظن ہو جانا اہلِ علم کو زیب نہیں دیتا اور قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح شرعی موشگافیوں سے کچھ حاصل بھی نہ ہوگا۔

فروری ۱۹۷۵ء

پروفیسر شاکر علی

شاکر علی انتقال کر گئے۔ لاہور سُونا ہوگیا اور ملک ایک عظیم فن کار، ایک بے حد پیارے انسان سے محروم ہوگیا۔ شاکر لاہور سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انہوں نے لاہور ہی کو اپنا وطن بنایا تھا اور وہیں کی مٹی نے آخر کار ان کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں سلالیا۔ شاکر نے مصوری کی تعلیم بمبئی، لندن، پیرس اور پراگ میں پائی تھی مگر ان کا فن پاکستان ہی میں چمکا۔ اس میں انفرادیت اور اظہارِ ذات کا حسن یہیں نمایاں ہوا۔ وہ پاکستان میں تجریدی آرٹ کے امام تھے۔ اُنہیں نے یہاں کے فن کاروں کو تجریدی آرٹ کی طرف مائل کیا۔ نئی نسل کے مصور تو ان کی عزت رشیوں کی طرح کرتے تھے۔ ان کی بعض خصلتیں تھیں بھی درویشوں اور قلندروں کی سی۔ ان کی شخصیت میں ایسی بلا کی مقناطیسی کشش تھی کہ طلبا تو طلبا، بے شمار ادیب، دانش ور اور مصور ان کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ ان کی اچانک وفات نے سب کو رُلا دیا۔

مصور کی حیثیت سے شاکر علی دنیا بھر میں مشہور تھے لیکن ان کو جتنی خوشی تصویریں بنا کر ہوتی تھی اتنی ہی خوشی دوسروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرتا دیکھ کر ہوتی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں وہ جس وقت میو اسکول آف آرٹس میں لیکچرار مقرر ہوئے تو اس تاریخی درسگاہ کی حالت بہت خستہ تھی۔ دقیانوسی اساتذہ جن کو فنونِ لطیفہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور طلبا وہ جن کو کہیں اور داخلہ نہ ملتا تھا۔ شاکر کی وجہ سے اسکول کا ماحول آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ وہ دن بھر کمرے میں بیٹھے تصویریں بناتے یا لڑکوں سے گھل مِل کر باتیں کرتے رہتے تھے مگر انہوں نے نہ تو کبھی اپنی اعلیٰ لیاقت اور فن کا

ڈھنڈورا پیٹا اور نہ استادی کا رعب ڈالا۔ شاکر ہی کی اَن تھک کوششوں سے میو اسکول میں ایک سے ایک لائق استاد شامل ہوئے اور بلآخر میو اسکول نیشنل کالج آف آرٹس میں تبدیل ہو گیا۔ وہ قریب قریب ۱۵ برس تک پہلے میو اسکول کے اور پھر نیشنل کالج کے پرنسپل رہے لیکن طلباء اور اساتذہ دونوں سے ان کا برتاؤ سدا دوستانہ رہا۔ انہیں کی بدولت یہ درسگاہ ملک کا سب سے زیادہ با وقار فنّی ادارہ بن گئی۔ وہ خود تو ایک ادارہ تھے ہی لیکن وہ اپنے پیچھے ایک ایسا تعلیمی ادارہ چھوڑ گئے ہیں جو ان کی خدمات کو کبھی بُھلا نہیں سکتا۔

شاکر میں بناوٹ اور دکھاوا نام کو نہ تھا۔ ان کو نہ تو اپنے فن کی عظمت کا گھمنڈ تھا اور نہ وہ خود پسند آرٹسٹوں کی طرح اپنے بارے میں کبھی گفتگو کرتے تھے۔ انکسار اور کسر نفسی ان کی فطرت تھی۔ کہنی مار کر آگے بڑھنا یا شہرت کے پیچھے بھاگنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے اور جو نرمی، دھیما پن اور سادگی ان کے مزاج میں تھی وہی ان کی تصویروں میں بھی جھلکتی ہے۔

شاکر سرتاپا محبت تھے۔ کسی کی دل آزاری کرنا ان کو آتا ہی نہ تھا۔ ان کے فکر و احساس کا سارا نظام پیار اور محبت ہی کے گرد رقص کرتا تھا۔ یہ محبت ان کی زندگی بھی تھی اور ان کا فن بھی۔ حسین چیزوں سے محبت، مشرقی تہذیب کی اچھی روایتوں سے محبت، پھولوں اور پرندوں سے محبت، ان کی جمالیاتی حِس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ ان کی تصویروں میں گوتم بدھ اور حضرت مسیح، ماں اور بچہ، برہنہ عورت کا جسم، انڈے سیتی چڑیاں اور رنگ برنگے پھول سب محبت اور تخلیق ہی کی مختلف علامتیں ہیں۔

شاکر فنّی صداقت کی تلاش و جستجو سے کبھی نہیں تھکے اور نہ ان کے فن پر کبھی جمود یا کہنگی طاری ہوئی بلکہ وہ مرتے دم تک نئے نئے تجربے کرتے رہے اور اپنے حسّی تجربوں کو بڑے خلوص بڑی سچائی سے رنگ اور لکیروں کے پیکر میں ڈھالتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مارچ ۱۹۷۵ء

شکریہ

پاکستانی ادب کے اجرا کو چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ ہمارے قارئین اور اربابِ قلم نے اس پیش کش کی پذیرائی جس گرم جوشی سے کی ہے اس کے لیے ہم ان کے بہت ممنون ہیں۔ ہم نے یہ رسالہ بہت ڈرتے ڈرتے نکالا تھا کیونکہ ہر طرف سے یہی سننے میں آتا تھا کہ یہ ڈائجسٹوں کا زمانہ ہے اور لوگ لذّتِ کام و دہن کے بہت خوگر ہو گئے ہیں لیکن معلوم ہوا کہ ملک میں نہ ترقی پسند ادب کے پڑھنے والوں کی کمی ہے اور نہ ترقی پسند ادب تخلیق کرنے والوں کی۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستانی ادب کی اشاعت چھ مہینے میں دُگنی نہ ہو جاتی اور نہ ہمیں روزانہ قارئین اور قلم کاروں کی تحریریں وصول ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطا قارئین کی نہیں بلکہ ادبی رسالوں کے منتظمین کی ہے جو پرچوں کی تقسیم اور فروخت کا تو مناسب انتظام کر نہیں پاتے اور رونا روتے ہیں پڑھنے والوں کی بدذوقی کا۔ مثلاً ابھی نہ جانے کتنی بستیاں ہوں گی جن میں لوگ پاکستانی ادب کے نام سے بھی واقف نہیں اور نہ پاکستانی ادب نے ان سے رابطہ قائم کرنے کی اب تک کوشش کی ہے۔ پھر قصور ہمارا ہے یا ان بستیوں کے باشندوں کا؟

ہماری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ پاکستانی ادب کا معیار اونچا ہو۔ اس کوشش میں ہمارے قلمی معاونین نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر پاکستانی ادب چھ مہینے کیا ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انہیں کی تحریروں سے پرچے کا معیار قائم ہے اور ترقی کرے گا۔ ہمارے قارئین کی طرف سے جو خطوط ہمیں ملتے ہیں وہ بھی بہت مفید ہوتے ہیں۔ ان خطوں سے

ہمیں اپنے پڑھنے والوں کے مذاق اور مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہماری خدمات کو سراہنے میں بالکل بخل نہیں کرتے اور نہ ہماری خامیوں کی نشان دہی کرنے میں مروّت یا تکلف سے کام لیتے ہیں۔ سقراط کہتا تھا کہ میں یونانیوں کے لیے بڑمکھی ہوں۔ ہمارے قارئین بھی ہمارے لیے بڑمکھی ہیں جو ہم کو اپنی تنقیدوں سے جھنجھوڑتے اور چونکاتے رہتے ہیں۔ بعض احباب نے ہم سے پوچھا ہے کہ پاکستانی ادب کن لوگوں کے لیے شائع ہوتا ہے اور اس کو کن لوگوں کا مفاد عزیز ہے۔ جواباً عرض ہے کہ پاکستانی ادب پاکستان کے عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے شائع ہوتا ہے۔ ان میں اکثریت ظاہر ہے کہ درمیانہ طبقے یا نچلے درمیانہ طبقے کی ہے۔ اس واسطے کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی تک خواندگی کی شرح بہت کم ہے اور مزدوروں اور کسانوں کو نہ تو تعلیم کے مناسب مواقع حاصل ہیں اور نہ ان کی آمدنی اتنی ہے کہ وہ ادبی رسالے خرید سکیں۔ ان کو دن رات روٹی، کپڑا اور مکان کی فکر ستاتی رہتی ہے۔ ادبی پرچوں کے لیے ان کے پاس فرصت ہے نہ استطاعت۔ اس کے باوجود ہماری برابر کوشش یہی رہی ہے کہ پاکستانی ادب انہیں محنت کشوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرے اور پاکستانی ادب میں جو کچھ شائع ہو وہ انہیں کے حقوق اور مفاد، مصائب و آلام اور جہد وکسب کی آواز ہو۔

اپریل ۱۹۷۵ء

نوائے وقت کی نظرِ عنایت

روزنامہ نوائے وقت کچھ عرصے سے صوبائی منافرت پھیلانے اور مختلف علاقوں کے باشندوں کو ایک دوسرے سے بدظن کرنے میں بے حد مصروف ہے۔ ایک یونٹ کی تنسیخ اور صوبوں کی بحالی کے بعد علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے فروغ کی جو تھوڑی بہت سرکاری یا غیر سرکاری کوششیں ہوئی ہیں نوائے وقت ان کو انتہائی شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ سرگرمیاں پاکستان کی سالمیت کے خلاف کسی بہت بڑی سازش کے تحت شروع کی گئی ہیں اور اگر ان کو جبراً بند نہ کیا گیا تو پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ حد تو یہ ہے کہ نوائے وقت کے نزدیک علاقائی ادب، ثقافت اور زبان کی باتوں سے اسلامی تعلیمات کی نفی بھی ہوتی ہے۔ سچ ہے کہ عینک کا رنگ سیاہ ہو تو انسان کو ہر شے سیاہ ہی نظر آتی ہے۔

نوائے وقت سندھ پر خاص طور سے مہربان ہے۔ وہ اپنے اداریوں، خبرناموں اور مضمونوں کے ذریعے ہمیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ جو لوگ ''جئے سندھ'' کا نعرہ لگاتے ہیں یا سندھی تہذیب، ادب اور زبان سے محبت کا اعلان کرتے ہیں وہ ہندوستان کے ایجنٹ، لہٰذا غدّار ہیں۔ دیکھیں غدّاری کی یہ سند نوائے وقت کے دربار سے پنجاب کے ادیبوں اور دانش وروں کو کب عطا ہوتی ہے اس لیے کہ یہ طبقہ بھی ان دنوں اپنی اصل پہچاننے، اپنی جڑیں تلاش کرنے اور اپنی ثقافت اور زبان کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

تقریباً تین مہینے گزرے حکومتِ سندھ اور حکومتِ پاکستان کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے اہتمام

سے کراچی میں ''سندھ صدیوں سے'' کے عنوان سے ایک سیمینار ہوا تھا اور ایک نمائش بھی ترتیب دی گئی تھی۔ اس سیمینار میں یورپ، امریکہ اور ایشیا کے متعدد عالموں اور ماہرینِ آثار نے شرکت کی تھی اور وادیِ سندھ کی شہرۂ آفاق تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پڑھے تھے۔ واضح رہے کہ جس پانچ ہزار برس پرانی تہذیب کو وادیِ سندھ کی قدیم تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ موجودہ صوبہ سندھ تک محدود نہ تھی بلکہ قریب قریب پورے پاکستان پر محیط تھی۔ (اس تہذیب کا مشہور مرکز ہڑپہ پنجاب میں ہے) مگر نوائے وقت کو اس سیمینار میں بھی اسلام دشمن اور پاکستان دشمن سندھیوں کی خطرناک سازش نظر آئی۔ اس نے سیمینار کو ''ایک ثقافتی حملہ'' سے تعبیر کیا اور اسلام پسند پاکستانی محبانِ وطن کو دشمنوں کے حملے سے بچانے کے لیے چھ کالم کا ایک خبرنامہ اپنے ''وقائع نگار خصوصی'' کے قلم سے شائع کیا (۱۴ مارچ ۱۹۷۵ء) ''وقائع نگار خصوصی'' نے اپنے مقالے میں وادیِ سندھ کی قدیم تہذیب کے متعلق ایسے ایسے معلومات افزا انکشافات کیے ہیں کہ سرجان مارشل آنجہانی کی روح بھی اپنی لاعلمی پر شرم سے پانی پانی ہوگئی ہوگی۔ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر دانی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر ایف اے خان اور پاکستان کے دیگر علمائے آثار نے یہ بصیرت افروز مضمون پڑھا یا نہیں۔ اگر نہیں پڑھا تو ضرور پڑھیں بلکہ اس کا ترجمہ وادیِ سندھ کی قدیم تہذیب سے دلچسپی رکھنے والے غیر ملکی دانشوروں کو بھی بھجوائیں تاکہ ان جاہلوں کو بھی اس تہذیب کی اصل حقیقت معلوم ہوجائے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ ''موہن جوڈرو سے ایسے آثار بھی ملے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ زن وشو کے تعلقات کو گلیوں اور بازاروں میں رواج دیتے تھے۔ کیا ایسے ماحول میں ماں، بہن اور بیٹی کا تقدس باقی رہتا ہوگا۔'' ہم فی الحال اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ انسانی تاریخ کے ابتدائی عہدوں میں عورت مرد کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی یا ماں بہن اور بیٹی کے تقدس کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا البتہ ''وقائع نگار خصوصی'' سے ہم یہ ضرور دریافت کریں گے کہ جن ''آثار'' کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ کب دریافت ہوئے اور اس وقت کہاں ہیں۔ اگر نوائے وقت کے دفتر میں محفوظ ہیں تو ان کی تفصیلات معہ فوٹو اخبار میں ضرور شائع کردیں مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے موہن جوڈرو کی مہروں پر برہنہ عورتوں کے رقص کا منظر دیکھ لیا ہو اور اس کو ''زن وشو'' کے آبرو باختہ تعلقات سے منسوب کرتے ہوں۔ ان مہروں کا حوالہ نہ دیجیے گا ورنہ آپ کی بڑی جگ ہنسائی ہوگی کیونکہ ان مناظر کا تعلق افزائشِ نسل و فصل کی مذہبی رسموں سے تھا جو دنیا کی بیشتر پرانی قوموں میں رائج تھیں۔ زن وشو کے تعلقات سے نہ تھا۔

اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد وقائع نگار صاحب سیمینار کے منتظمین پر خوب خوب برسے ہیں کہ وہ سندھ کی ثقافت و تہذیب کا رشتہ موہن جوڈرو سے جوڑ کر ''کیا غضب ڈھا رہے ہیں۔'' دراصل نوائے وقت نے سیمینار سے پہلے ہی سیمینار کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ۲۷ فروری کے اخبار میں لکھا تھا کہ ''تعجب ہے کہ سندھی تہذیب کے اس عالمی مظاہرے کو کیوں اذنِ تماشا دیا جا رہا ہے۔'' اور پھر یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا تھا کہ ''سندھ پر بین الاقوامی سیمینار کو حکومت کی جو اعانت حاصل ہے تو وہ تحریکِ پاکستان کی عین مخالفت کی مترادف ہے'' البتہ یہ نہیں بتایا تھا کہ جز کی تعریف سے کل کی تنقیص منطق کے کس اصول سے ثابت ہوتی ہے۔ اگر اس احمقانہ منطق کو مان لیا جائے تو پاکستان کے کسی خطے سے محبت کرنا خواہ وہ پنجاب ہو یا سرحد، ملتان ہو یا لاہور، پشاور ہو یا بہاول پور ''تحریکِ پاکستان'' کی عین مخالفت ہوگی۔ مگر جز اور کل کی محبت ایک دوسرے کی ضد تو نہیں۔ کیا کوئی شخص اپنے گاؤں، شہر یا صوبے سے محبت کے ساتھ پورے ملک سے محبت نہیں کر سکتا۔ کیا انسان کا دل اتنا تنگ ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ محبتوں کی گنجائش ہی نہیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنے والدین سے، اپنے بال بچوں سے، اپنے دوستوں سے، اپنی زبان ادب اور تہذیب سے، اپنے آدرش اور عقائد سے بیک وقت محبت کرتے ہیں۔ البتہ ان محبتوں کی نوعتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ ماں بیٹے کی محبت تو مثالی محبت کہلاتی ہے مگر کیا کوئی ماں اپنے بیٹے سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی کہ تم بس مجھ سے محبت کرو اپنے بھائی بہنوں یا بیوی بچوں سے محبت نہ کرو ورنہ میں تم کو اپنا دشمن سمجھوں گی۔

اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ نوائے وقت اور اس کے ابن الوقت کالم نویسوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ ۱۹۴۷ء سے پیشتر کی تاریخ کا تذکرہ قانوناً ممنوع قرار دے ورنہ عین ممکن ہے کہ سر پھرے سندھی کل کو اکبر بادشاہ پر بھی فخر کرنے لگیں کہ وہ بھی سندھ میں ہی پیدا ہوا تھا یا زندہ دلانِ پنجاب گندھارا کی شہرۂ آفاق غیر اسلامی تہذیب سے اپنا ناتہ جوڑ کر کوئی بین الاقوامی سیمینار منعقد کر دیں اور ''تحریکِ پاکستان'' پھر خطرے میں پڑ جائے۔

نوائے وقت نے اِنھیں اشتعال انگیز بہتان طرازیوں پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ سندھ کے موجودہ ادیبوں اور ان کی تصنیفات کو بھی برابر ملامت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ وہ ان کے اقتباسات کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے جن سے یہ ثابت ہو کہ سندھی ادیب وطن کے

دشمن ہیں اور ہندوستان سے سازباز کر رہے ہیں۔ اس مقدس فریضے میں جماعتِ اسلامی نوائے وقت سے پورا پورا تعاون کر رہی ہے چنانچہ چند ہفتے گزرے جب جماعتِ اسلامی کے ایک بزرگ نے لاہور میں پریس کانفرنس کی اور یہ مطالبہ کیا کہ سندھ میں جو غیر اسلامی اور پاکستان دشمن تحریریں شائع ہو رہی ہیں ان پر پابندی لگائی جائے تو نوائے وقت نے اس پریس کانفرنس کی رپورٹ بہت نمایاں طور پر چھاپی اور اسی انداز کا ایک خبرنامہ بھی سندھ سے اپنے نامہ نگار خصوصی کے حوالے سے شائع کیا۔ اس خبرنامے میں جہاں سندھی ادیبوں کی ''غدّاری'' کی مثالیں دی گئی تھیں وہاں بمبئی کے ایک سندھی شرنارتھی کے ناول کی قسط وار اشاعت کو بھی سندھیوں کی پاکستان دشمن سازش کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا تھا حالانکہ خود نوائے وقت میں شائع ہونے والے اقتباسات بتاتے ہیں کہ مصنف نے اُن سندھیوں کی داستانِ غم بیان کی تھی جو ہندوستان میں بس گئے ہیں۔ غدّار شناسی کا یہی عالم رہا تو پاکستان کے اردو رسالوں کی بھی خیر نہیں جو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے افسانے بڑے شوق سے شائع کرتے رہتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ملک میں اب بھی ایسے عناصر موجود ہیں جو پاکستان کی حالیہ تاریخ سے کوئی سبق سیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ تحریر کا جواب تحریر سے نہیں دے سکتے لہٰذا حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں سندھی مطبوعات کو ممنوع قرار دیا جائے اور فلاں فلاں سندھی ادیبوں کی زبان بند کی جائے اور جب یہ پابندیاں لگ جاتی ہیں تو بغلیں بجاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب نوائے وقت یا اس کے ہوا خواہ اسی قسم کے امتناعی قوانین کی زد میں آتے ہیں تو پھر انصاف اور شہری آزادی کی دہائی دی جاتی ہے اور مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم پر مروّجہ قوانین کے تحت کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے لیکن نوائے وقت اور اس کے ہوا خواہ دوسروں کو یہ جمہوری حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کہیں کہ صاحب اگر آپ سندھی مطبوعات کو وطن دشمن خیال کرتے ہیں تو ان پر قانونِ بغاوت پاکستان یا پریس ایکٹ کے تحت عدالت میں مقدمہ چلائیے تاکہ مجرموں کو قرار واقعی سزا ملے۔

نوائے وقت کے نزدیک ''اپنی دھرتی کی زبان، دھرتی کی ثقافت اور دھرتی کی تہذیب سے پیار کرنا غیر اسلامی فعل ہے'' اور ''سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان تہذیب و ثقافت کی باتیں کرنا اسلام دشمنی ہے'' اس لیے کہ ''اسلام خون، برادری، زمین، جغرافیے وغیرہ ایسے رشتوں سے بلند بالا ہے'' (۲۹ مارچ ۷۵ء کا اداریہ) اسلام کے اس بین الاقوامی کردار سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن

کیا اسلام لوگوں کو اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنی زمین سے پیار کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ اگر ممانعت کرتا ہے تو پاکستان بھی ''دھرتی'' ہی ہے۔ زمین ہی پر آباد ہے۔ پھر کیا پاکستان سے محبت کرنا بھی غیر اسلامی ہوگا۔ یہ عجیب و غریب منطق ہے کہ پاکستانی وطنیت، پاکستانی قومیت، پاکستانی ثقافت کی باتیں کرنا تو عین اسلام ہے مگر سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان ثقافت کی باتیں کرنا اسلام دشمنی ہے اور یہ جو ان دنوں عرب وطنیت کا اتنا غلغلہ ہے اور ایران اور ترکی کے لوگ اپنی دھرتی، اپنی زبان، اپنی تہذیب پر اتنا فخر کرتے ہیں تو کیا وہ بھی اسلام کی دشمنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی زبان، زمین، ثقافت سے پیار کرنے کو برا نہیں سمجھتا البتہ اپنے کو دوسروں سے اعلیٰ اور افضل سمجھنے کو، دوسروں کی زبان، زمین اور ثقافت کی تحقیر کرنے کو ضرور برا سمجھتا ہے۔

بات دراصل گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے کہ کیا پاکستانی ثقافت کی اساس نظریاتی ہے یا ارضی؟ نوائے وقت کا موقف یہ ہے کہ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر بنا تھا (حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ دعویٰ درست نہیں کیونکہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کے قومی حق خود اختیاری کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ دیکھیے مسلم لیگ کا ۱۹۴۰ء کا لاہور رزولیوشن) لہٰذا پاکستانی تہذیب کی تشکیل بھی اسلامی نظریات کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس علاقائی تہذیبوں کے علم برداروں کا موقف یہ ہے کہ نظریہ خواہ وہ اسلامی ہو یا مسیحی اور یہودی بہرحال ارضی ہوتا ہے۔ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں ہی کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا مقصد بھی انسانوں کی معاشرتی، اخلاقی اور روحانی زندگی کی اصلاح تھا نہ کہ عرش نشینوں کی اصلاح یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب، ہر نظریے کا محور انسان کی ذات اور اس کے مسائلِ زیست ہی ہوتے ہیں۔ زمین اور زمین پر بسنے والے انسانوں سے الگ کسی مذہب، کسی نظریے کا وجود ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا جب ہم اپنی دھرتی کی باتیں کرتے ہیں تو وہ بھی دھرتی پر آباد انسانوں ہی کے حوالے سے کیونکہ انسان نہ ہو تو اس دھرتی کی قدر و قیمت ٹھیکرے جتنی بھی نہ رہ جائے۔ اس دھرتی کی ساری رونق انسانوں ہی کے دم سے ہے۔ وہی اپنی جدوجہد، اپنے تجربے، اپنے شعور کی بدولت دھرتی کو ایک بامعنی اور بامقصد حقیقت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دھرتی سے محبت اس لیے بھی کرتے ہیں کہ اس میں ہمارے اجداد کے خون پسینے کی توانائی شامل ہے۔ اس سے ہماری ان گنت روایتیں اور یادیں وابستہ ہیں۔ ہمارے گیت، قصے، کہانیاں اور تاریخ کے شیریں و تلخ واقعات

اسی دھرتی کی کوکھ سے نکلے ہیں۔ ہمارے رہن سہن اور رسم و رواج کا دامن بھی اس دھرتی ہی سے بندھا ہوا ہے۔ اگر یہ دھرتی ہم سے چھن جائے تو ہم اپنی ذات، اپنی اصل، اپنی شخصیت سب سے محروم ہو جائیں۔ یہ دھرتی ہمارا وجود بھی ہے اور ہماری زندگی کی ضمانت بھی، ہمارا مولد بھی ہے اور مقدر بھی۔

ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں سے نوائے وقت کو جو دلی پرخاش ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور شاید ہی کوئی معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی گناہ ایسا ہو جس کی تہمت اس اخبار نے ترقی پسند ادیبوں پر نہ لگائی ہو۔ حالانکہ ان کا قصور فقط اتنا ہے کہ وہ زہرِ ہلاہل کو قند نہیں کہتے خواہ وہ زہر دیسی ہو یا بدیسی۔ وہ عام انسانوں کے جذبات و احساسات کی، ان کے دکھ درد کی ترجمانی کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچ اور مہاجر عوام کے مسائل ایک ہیں اور ان کا حل بھی ایک ہی ہے۔ وہ نہ مشرق سے بیزار ہیں اور نہ مغرب سے حذر کرتے ہیں بلکہ ہر شب کو سحر کرنے میں بساط بھر کوشاں رہتے ہیں۔ ظلمتِ شب کے سفیروں کو ترقی پسند ادیبوں کی یہ سرگرمیاں کبھی پسند نہیں آئیں اور نہ آئیں گی۔ نوائے وقت کی نظر میں پاکستانی ادب کا جرم بھی یہی ہے چنانچہ وہ گزشتہ چھ مہینے میں کئی بار پاکستانی ادب پر عنایت کر چکا ہے۔ البتہ اب کے اس نے سندھی زبان کی مطبوعات کے ساتھ پاکستانی ادب کو بھی لپیٹ لیا ہے اور اس پر سندھو دیش کی حمایت اور اسلام کی مخالفت کا الزام لگایا ہے۔

اس سلسلے میں جناب مرغوب صدیقی نے جو نوائے وقت کے مستقل کالم نویس ہیں ۱۳ اور ۱۴ مئی کی اشاعت میں ''سندھو دیش کی سازش'' کے تحت دو طویل مضمون سپردِ قلم کیے ہیں۔ وہ ۱۳ مئی کی قسط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''روس نواز حضرات کا ایک اخبار (جس کے ایڈیٹر ایک معروف کمیونسٹ مسٹر سبطِ حسن ہیں) ''پاکستانی ادب'' کراچی سے شائع ہو رہا ہے۔ اگرچہ اخبار اردو میں نکلتا ہے لیکن یہ ''سندھو دیش'' و ''سندھی ازم'' و ''چار قومیتوں'' و ''چار ثقافتوں'' وغیرہ کے پرچار میں پیش پیش ہے اور اسے مرکزی وزارتِ تعلیم کے ثقافتی مشیر جناب فیض کی بھی سرپرستی حاصل ہے۔ جناب فیض احمد فیض اور سبطِ حسن کے اس کردار پر آگے چل کر مفصل روشنی ڈالی جائے گی کہ وہ کس طرح صوبائیت اور چار قومیتوں کا زہر پھیلانے، ملک کی سالمیت کے سلسلے میں مایوسی کی فضا پیدا کرنے اور ایسے نظریات کی

ترویج میں مصروف ہیں جو بنیادی طور پر پاکستان کے قیام اور اس کے استحکام کے تقاضوں کے خلاف ہیں لیکن یہاں صرف اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ محبِ وطن حلقے اس استعجاب میں مبتلا ہیں کہ سندھ کی حکومت نے اس ہفتہ وار اخبار کو (ان حضرات کے قومیتوں کے متعلق خیالات سے واقفیت رکھنے کے باوجود) کس طرح ڈیکلریشن عطا فرمایا اور اس ہفتہ وار کی نہایت قابلِ اعتراض اور پاکستان کے اساسی مفادات کے خلاف تحریروں کے باعث اس کا محاسبہ کیوں نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر اس کو سرکاری اشتہارات سے بھی نوازا گیا ہے۔ کیا حکومت کے اندر کچھ عناصر (یعنی اسلام آباد اور کراچی میں) درپردہ ''سندھو دیش'' کی تحریک میں ملوث تو نہیں ہیں جو وہ ایسے اخبار کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ اخبار پنجاب، سندھ، سرحد، کراچی میں بھی تقسیم ہوتا ہے اور ان تینوں صوبوں میں محاسبہ کرنے والی سرکاری ایجنسیاں کیا کر رہی ہیں۔''

ہم نے یہ طویل اقتباس اس لیے نقل کیا ہے کہ قارئین کو نوائے وقت کے سچ جھوٹ کا خود ہی اندازہ ہو جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر مرغوب صدیقی کم از کم ۱۳ مئی تک پاکستانی ادب سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ پڑھنا تو الگ رہا انہوں نے پاکستانی ادب کی شکل تک نہ دیکھی تھی ورنہ وہ پاکستانی ادب کو بار بار ''ہفتہ وار'' اخبار نہ لکھتے۔ دوسرا جھوٹ یہ بولا ہے کہ فیض صاحب پاکستانی ادب کے سرپرست ہیں حالانکہ پاکستانی ادب کے سرپرست اس کے سبھی پڑھنے والے اور قلمی معاونین ہیں۔ فیض صاحب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ تیسرا جھوٹ یہ ہے کہ پاکستانی ادب ''روس نواز حضرات'' کا ہے۔ اگر کسی روسی کہانی کا ترجمہ شائع کرنے یا ٹالسٹائی، چیخوف اور گورکی کا ذکر کرنے سے کوئی رسالہ ''روس نواز'' کہلا سکتا ہے تو ہمیں روس نواز ہونے کا اعتراف ہے بالکل اسی طرح جیسے ہم ''جرمن نواز'' ہیں کیونکہ ہم نے گوئٹے اور ایک آدھ دوسرے جرمنوں کی تحریریں بھی شائع کی ہیں لیکن مرغوب صاحب کا اشارہ غالباً سوویت یونین کی سیاست کی طرف ہے۔ سو اس کے بارے میں عرض ہے کہ راقم الحروف سوشلزم میں پورا پورا یقین رکھتا ہے اور سوشلزم کو بنی نوعِ انسان کی نجات اور تحصیلِ ذات کا واحد ذریعہ خیال کرتا ہے اسی بنا پر وہ سوشلسٹ نظام کے جو تجربے سوویت یونین اور دوسرے ملکوں میں ہو رہے ہیں ان کی قدر کرتا ہے اور پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان دوستانہ تعلقات کو جنوبی ایشیا کے امن اور آزادی کے لیے نیک شگون سمجھتا ہے۔ مگر یہ میری ذاتی رائیں ہیں۔ ''پاکستانی ادب'' ایک غیر سیاسی ادبی

رسالہ ہے اور اس قسم کی سیاسی بحثیں اس کے دائرے سے خارج ہیں اور مرغوب صاحب کا چوتھا جھوٹ یہ ہے کہ یہ "اخبار" سندھودیش، سندھوازم، چار قومیتوں، چار ثقافتوں وغیرہ کے پرچار میں پیش پیش ہے۔ ہم اس کھلی حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ پاکستان میں چار نہیں بلکہ پانچ ثقافتیں پھل پھول رہی ہیں (اور پنجابی زبان اور ادب، سندھی زبان اور ادب، پشتو زبان اور ادب، بلوچی زبان اور ادب اور اردو زبان و ادب اور ان کی موجودگی میں کوئی صحیح الدماغ شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا) البتہ جہاں تک سندھودیش، سندھوازم اور چار قومیتوں کے پرچار کا تعلق ہے مرغوب صدیقی صاحب اپنے بے بنیاد الزام کی تائید میں پاکستانی ادب سے ایک شہادت بھی پیش نہ کرسکے۔

پہلی قسط کے خاتمے پر مرغوب صدیقی صاحب نے حکومت سے پُر زور اپیل کی ہے کہ وہ "اس ہفتہ وار اخبار" کا محاسبہ کرے۔ ان کو بڑی حیرت ہے کہ جمہوریۂ پاکستان میں پاکستانی ادب کو نوائے وقت اور مرغوب صدیقی صاحب کی اجازت کے بغیر ڈکلریشن کس نے دیا اور کیوں دیا اس لیے کہ ان کے خیال میں تحریر کی آزادی پاکستان کے ہر شہری کا بنیادی حق نہیں ہے بلکہ فقط اُس شہری کا حق ہے جس کو سَیاں چاہے۔ حکومت سے محاسبہ کا مطالبہ کرکے مرغوب صدیقی صاحب نے اپنا کیس اور بھی کمزور کرلیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے نہ اپنی دلیلوں پر اور نہ پاکستان کے محبِ وطن باشندوں کی سُوجھ بوجھ پر۔ مرغوب صاحب آپ کے ہاتھ میں قلم ہے، آپ آزاد ہیں اور آپ کو پاکستان کے ایک "کثیرالاشاعت" روزنامے کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں ۲۷ صفحوں کے ایک گمنام ماہنامے کی کیا حیثیت ہے۔ آپ پاکستانی ادب کے خلاف دل کھول کر لکھیے اور روز لکھیے۔ اگر آپ کی باتوں میں وزن ہوگا، اگر آپ کے الزامات درست اور معقول ہوں گے تو لوگ خود ہی پاکستانی ادب کو پڑھنا ترک کردیں گے اور وہ اپنی موت آپ ہی مرجائے گا۔ مگر آپ کے دل میں تو چور ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ آپ کے الزامات میں ذرّہ برابر صداقت نہیں ہے اور آپ تحریر کا جواب تحریر سے اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی اہلیت نہیں رکھتے اس لیے حکومتوں سے فریاد کرتے ہیں۔ کیا آپ نے تاریخ بالکل نہیں پڑھی۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ غلط فلسفے کا جواب صحیح فلسفہ ہوتا ہے اور غلط عقیدے کا جواب صحیح عقیدہ اور غلط نظریے کا جواب صحیح نظریہ اور غلط تحریک کا جواب صحیح تحریک اور غلط تحریر کا جواب صحیح تحریر نہ کہ طاقت کا استعمال کیونکہ خیالات کی لہر طاقت سے کبھی نہ

رُکی ہے نہ رُکے گی۔

مرغوب صدیقی صاحب کے مضمون کی دوسری قسط پڑھ کر ہمیں بہت ہنسی آئی اس لیے کہ ہمارے کانوں نے وہ گفتگو سنی جو ایڈیٹر نوائے وقت اور مرغوب صدیقی صاحب کے درمیان پہلی قسط کی اشاعت کے بعد ہوئی تھی۔

ایڈیٹر۔ مرغوب صاحب! آپ نے آج ہمیں بہت شرمندہ کیا۔

مرغوب صدیقی: کیوں جناب کیا ہوا۔

ایڈیٹر۔ آپ نے یہ کیا لکھ دیا کہ پاکستانی ادب ہفتہ وار اخبار ہے۔ بھائی وہ تو ماہنامہ ہے۔ پڑھنے والے کیا کہتے ہوں گے۔

مرغوب صدیقی: مجھے بڑا افسوس ہے لیکن آپ نے بتا دیا ہوتا۔ آپ نے حکم دیا کہ پاکستانی ادب کے خلاف کچھ لکھو۔ میں نے لکھ دیا۔ مجھے کیا معلوم پاکستانی ادب کیا بلا ہوتی ہے۔"

ایڈیٹر: اچھا چھوڑیے اس قصے کو۔ یہ رہے پاکستانی ادب کے کچھ تراشے۔ ان کی مدد سے دوسری قسط پوری کر دیجیے۔ ہاں یہ لکھنا نہ بھولیے گا کہ پاکستانی ادب ماہنامہ رسالہ ہے۔ ہفتہ وار اخبار نہیں ہے۔

مرغوب صدیقی: آپ اطمینان رکھیں۔ میں اس غلطی کی پوری تلافی کر دوں گا۔

مرغوب صدیقی صاحب تلافی تو کیا کرتے۔ اُلٹے ان کی لیاقت کا رہا سہا بھرم بھی کھل گیا۔ پہلی قسط میں انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ بعض سرکاری حلقے پاکستانی ادب کی سرپرستی کرتے ہیں۔ وہ یہ لکھنا بھول گئے تھے کہ "کوئی نہ کوئی خفیہ ہاتھ اس کی معاونت میں مصروف ہے۔" دوسری قسط میں انہوں نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔ مرغوب صاحب بے چارے اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی رسالہ خفیہ ہاتھ کی مدد کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ انہوں نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ چونکہ "پاکستان کے غیور لوگ پاکستانی ادب کی سرپرستی نہیں کرتے لہٰذا اسے لوگوں کے گھروں کے پتوں پر بھیجا جاتا ہے۔" پاکستانی ادب تو خیر راندۂ درگاہ ہے البتہ دوسرے ادبی رسالوں کو بھی چاہیے کہ آئندہ اپنا پرچہ سالانہ خریداروں اور قلمی معاونین کو ان کے گھر کے پتے پر نہ بھیجیں بلکہ مرغوب صدیقی صاحب کے توسط سے اِرسال کیا کریں۔

مرغوب صدیقی صاحب کا دعویٰ ہے کہ "پاکستانی ادب نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے، سندھوازم (جو سندھودیش کی بنیاد ہے) کے حق میں فضا ہموار کرنے، اسلام کا

مضحکہ اڑانے اور پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف زہر اُگلنے کی ذمے داری اٹھا رکھی ہے۔" (نوائے وقت ۱۴ مئی ۷۵ء) یہ بڑے سنگین الزامات ہیں مگر ثبوت میں مضمون نگار نے پاکستانی ادب سے جو شہادتیں چنی ہیں ان کی مثال وہی ہے کہ کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا۔ مرغوب صدیقی صاحب کو پاکستانی ادب کے ۴۵۰ صفحات میں لے دے کر دو نظمیں قابلِ اعتراض نظر آئیں۔ ایک جناب فیض احمد فیض کی نظم "بہار آئی" اور دوسری جناب حمایت علی شاعر کی نظم "موہن جوداڑو کا دوسرا آدمی۔" اور ایک افسانہ "سراب" جس کے مصنف جناب امر جلیل ہیں۔ البتہ انہوں نے چلتے چلتے شیخ ایاز صاحب اور قمر شہباز صاحب پر بھی کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کی ہے۔ فیض صاحب اور حمایت علی شاعر صاحب کے اشعار کی جو تشریح مرغوب صدیقی صاحب نے کی ہے اس کی داد نہ دینا ستم ہوگا۔ یوں تو مولانا روم، غالب اور اقبال کے کلام کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن بدقسمتی سے ان بزرگوں کو مرغوب صدیقی صاحب کا سا صاحبِ نظر نقاد کبھی نصیب نہ ہوا۔ فیض صاحب اور حمایت علی شاعر صاحب بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کے دور میں مرغوب صاحب پیدا ہوگئے۔ البتہ ان شاعروں کے کلام اور مرغوب صاحب کی تشریح میں اگر کوئی مناسبت نہیں ہے تو یہ قصور شاعروں کا ہے نہ کہ نقاد کا۔ رہ گئی امر جلیل صاحب کی کہانی سو اس کے بارے میں ہمیں فقط یہ کہنا ہے کہ مرغوب صاحب خدارا مصنف کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور اس نے ہماری منافقتوں پر جو طنز کیا ہے اس پر غور فرمائیے۔

آخر میں ہم نوائے وقت سے مؤدبانہ درخواست کریں گے کہ اگر آپ کو ملک کی سالمیت اور یک جہتی واقعی عزیز ہے تو مختلف صوبوں کے درمیان عداوت اور بدگمانی پھیلانے سے باز آجائیے کیونکہ یہ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ اس کا انجام عموماً بہت برا ہوتا ہے۔ پھر یہ کھیل آپ کب تک کھیلیں گے۔ کب تک اپنے ہر مخالف کو غدار اور وطن دشمن کہتے رہیں گے۔ مسلم لیگ کو بھی پاکستان کے ہر گوشے میں غدار اور غیر ملکی ایجنٹ نظر آتے تھے۔ اس کا حشر آپ نے دیکھ لیا۔ مشرقی پاکستان کے ہر رہنما کو بشمول مولوی فضل الحق مرحوم (جنہوں نے پاکستان رزولیوشن پیش کیا تھا) ہم نے غدار کے لقب سے نوازا اس کا انجام بھی آپ کے سامنے ہے۔ اب تو امریکہ میں میکارتھی کے چیلے چانٹوں کو بھی مخالفین کو غدار اور "غیر امریکی" کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ خدارا نوشتۂ دیوار کو غور سے پڑھیے ورنہ آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو نفرت کے بیج بونے والوں کا ہوتا ہے۔

جون ۱۹۷۵ء

”غلطی ہائے مضامین“

جناب ن۔م۔راشد کا شمار لفظ و معنی دونوں اعتبار سے جدید اردو شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اب تک ان کے تین مجموعے 'ماورا'، 'ایران میں اجنبی' اور 'لا=انسان' شائع ہو چکے ہیں۔ مدت گزری لاہور میں ہم ان کے پڑوسی تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ او بہ صحرا و من در کوچہ بارسوا شدیم۔ انہوں نے اس اثنا میں نیویارک، تہران اور خدا جانے کس کس دیس میں ڈیرے ڈالے اور اب لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ راشد صاحب بڑے عالم و فاضل بزرگ ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی اور دوسری کئی زبانوں کے کلاسیکی اور جدید ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ شاید اسی باعث ان کے تخیل کا افق بہت وسیع ہے اور ان کے کلام میں تفکر کا عنصر بہت غالب ہے۔

پاکستانی ادب کے اجرا کے موقع پر ہم نے راشد صاحب سے نظموں کی درخواست کی تھی لیکن وہ خط ان کو نہیں ملا۔ کچھ عرصے بعد ''افکار'' کے ندیم نمبر میں ان کا ایک مکتوب شائع ہوا جس میں انہوں نے کمیونزم اور ترقی پسند ادب کے باہمی رشتے پر اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ ہم نے ایک خط میں راشد صاحب کے ارشادات سے اختلاف کیا تھا۔ راشد صاحب نے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ شاملِ اشاعت ہے۔ انہوں نے زیرِ بحث مکتوب میں چند بنیادی سوال اٹھائے ہیں:

۱۔ کمیونزم اور ترقی پسندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۲۔ اکثر یا بعض ترقی پسند مخلص نہیں ہیں اور نہ انہوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو کسی اصول یا مسلک کے طور پر اختیار کیا ہے۔

۳۔ سیاسی اقتدار بزور قائم ہونے سے انسان کے اِس اختیار کی نفی ہوتی ہے جو اسے انسان کی حیثیت سے ودیعت کیا گیا ہے۔

۴۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ادیب کو کسی خاص قسم کا ادب تخلیق کرنے کا حکم یا ہدایت دے۔

کمیونزم سے راشد صاحب کی مراد غالباً کارل مارکس کے اشتراکی فلسفے سے ہے۔ مگر اس فلسفے کی عمر تو سَوا سَو سال سے زیادہ نہیں جبکہ انسان ترقی پسندی کے جذبے اور شعور کی پرورش ہزاروں برس سے کر رہا ہے اس لیے راشد صاحب کا یہ فرمانا کہ کمیونزم اور ترقی پسندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ انسان نے جب آلات و اوزار بنائے، جب آگ کا استعمال دریافت کیا، کھیتی باڑی کی طرح ڈالی، بستیاں آباد کیں، جب زندگی کی اندھیری رات میں علم و آگہی کے چراغ جلائے تو یہ سب اس کی ترقی پسندی ہی کے کرشمے تھے۔ ان کا کمیونزم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے البتہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسی قوتیں بھی سرگرمِ عمل رہی ہیں، فنا آفرینی جن کا مسلک اور شب آفریدگی جن کا شعار تھا۔ چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی کی یہ ستیزہ کاری ازل سے تا امروز جاری ہے اور یہیں سے تعہد کا مسئلہ اٹھتا ہے یعنی موت کی شرانگیز اور زندگی کی خیر بخش قوتوں کی نبرد آزمائی میں ہم کس کا ساتھ دیں۔ ترقی پسندی کا تو بس ہر دور میں ایک ہی معیار رہا ہے اور وہ یہ کہ فرد اپنے ماحول، اپنے معاشرے اور اپنی ذات کو زیادہ حسین، بامعنی اور ''تخلیقی'' بنانے میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ آیا وہ ان قوتوں کا ساتھ دیتا ہے جو انسان کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی سعی میں مصروف ہیں یا ان قوتوں کا جو زندگی کو پیچھے لے جانے کے درپے ہیں۔

ترقی کا جو قانون معاشرتی زندگی پر لاگو ہوتا ہے ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ بھی اسی قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی کا جو خون معاشرتی زندگی کی جان ہے وہی ادب کی رگوں میں بھی دوڑتا رہتا ہے۔ وہ کون ترقی پسند ادیب ہوگا جو یہ احمقانہ دعویٰ کرے کہ کارل مارکس سے پیشتر کا سارا ادب غیر ترقی پسندانہ ہے کیونکہ ہر زمانے اور ہر زبان میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کا ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ کس میں اتنی جرأت ہے جو یہ کہے کہ ہومر، ورجل، دانتے، فردوسی، سعدی، شیکسپیئر، بیدل، غالب اور نظیر اکبرآبادی وغیرہ غیر ترقی پسند تھے اس لیے کہ انہوں نے سوشلزم کی مدح سرائی نہیں کی یا کمیونسٹ مینی فسٹو کو نظم نہیں کیا۔ البتہ جب

ازرا پاؤنڈ یا گیبریل ڈانزیو، فاشزم کی ثنا وصفت میں قصیدے لکھیں اور ہم سے یہ توقع کی جائے کہ ہم ان کے کلام کے معنی اور مفہوم پر نہ جائیں بلکہ ان کے پیرایۂ اظہار پر سر دھنیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی یہ کہے کہ ناگاساکی اور ہیروشیما کی خوں آشام تباہیوں پر دھیان نہ دو بلکہ ایٹم بم پھٹنے سے جو چھتری نما آتشیں غبار اٹھا تھا اس کے حسن کی داد دو۔ کنوٹ ہامزون ناروے کا نوبل انعام یافتہ ادیب تھا، اس کی تصنیف ''بھوک'' لوگوں کو بہت پسند تھی لیکن جب ناروے پر ہٹلر کا قبضہ ہوا اور کنوٹ ہامزون نازیوں سے مل گیا تو معلوم ہے اس کے ہم وطنوں نے اپنے محبوب فن کار سے نفرت کا اظہار کس طرح کیا۔ انہوں نے ''بھوک'' کے نسخے الماریوں سے نکال نکال کر مصنف کو واپس بھجوا دیے۔ ممکن ہے کسی کو ناروے والوں کی اس حرکت پر ہنسی آئے مگر ہم کنوٹ ہامزون کے سے ہزاروں انعام یافتہ ادیبوں کو ناروے والوں کے جذبۂ حریت اور غیرتِ انسانی پر نثار کرتے ہیں۔ احتجاج کی وہ ایک ساعت ان کی ترقی پسندی کا اعلان نامہ تھی اور آزادی کا وہ ایک لمحہ ''بھوک'' کی حیاتِ جاوداں سے لاکھ درجے قیمتی تھا۔

جہاں تک ترقی پسندوں کے خلوص یا اصول پرستی کا سوال ہے سو اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ راشد صاحب کی سوچ کا انداز خالص داخلی اور استقرائی ہے۔ انہوں نے غالباً بعض افراد کے طرزِ عمل سے یہ کلیہ وضع کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ راشد صاحب نے ترقی پسند ادب کی تحریک کے ساتھ ناانصافی کی ہے البتہ اس کا فیصلہ کہ راشد صاحب حق پر ہیں یا ہم، تاریخ کرے گی۔

جہاں تک سیاسی اقتدار کے بزور قائم کرنے یا ہونے کا سوال ہے تو ہماری دلی آرزو بھی یہی ہے کہ دنیا کے تمام معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل افہام و تفہیم اور امن و آشتی سے طے پائیں۔ نہ زور آزمائی کی جائے اور نہ خون خرابہ ہو مگر افسوس ہے کہ نہ ماضی نے ہماری ان خواہشوں کا احترام کیا اور نہ فی زمانہ (اقوامِ متحدہ کے منشور کے باوجود) ہماری خواہشوں پر عمل ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اقتدار ہر دور اور ہر ملک میں قوت ہی کے بل پر حاصل کیا گیا ہے۔ کبھی کوئی طبقہ، مخالف طبقے کی دلیلوں یا عرضداشتوں سے متاثر ہو کر اپنی حاکمیت سے دست بردار نہیں ہوا ہے۔ خود سرمایہ داری نظام کو یورپ میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے جاگیرداروں سے جو مسلح جدوجہد کرنی پڑی اس سے ہر شخص واقف ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں سرمایہ داری نظام کے حامیوں اور جاگیری نظام کے محافظوں کے درمیان

برسوں تک کشت وخون کا بازار گرم رہا۔ بادشاہ چارلس اوّل کا سر قلم ہوا تب کہیں جاکر سرمایہ دار طبقہ برسرِاقتدار آیا۔ یہی صورتِ حال امریکہ کی جنگِ آزادی اور انقلابِ فرانس کے دوران پیش آئی۔ اس کے مقابلے میں روس کا سوشلسٹ انقلاب بے حد پُرامن تھا۔ سینٹ پیٹرزبرگ (لینن گراڈ) کے مزدوروں نے جب بالشویک پارٹی کی رہنمائی میں زار کے قصرِ شاہی پر دھاوا کیا تو خوں کا ایک قطرہ بھی نہ بہا البتہ خون ریزی اس وقت شروع ہوئی جب زار کے مختلف فوجی جنرلوں نے روس کی سوشلسٹ حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی فوجی اور مالی مدد سے ملک گیر خانہ جنگی شروع کی۔ نازیوں کے جرمنی میں برسرِاقتدار آنے کے بعد سامراجی طاقتوں نے ''پُرامن انتقالِ اقتدار'' کی نقاب بھی اتار کر پھینک دی۔ چنانچہ اسپین میں جب ۱۹۳۵ء میں پہلی بار جمہوریت پسندوں کے متحدہ محاذ کو عام انتخابات میں پُرامن طریقے پر فتح ہوئی تو جنرل فرانکو نے ہٹلر اور مسولینی کے اشارے پر اسپین کی نئی جمہوریت کے خلاف بغاوت کر دی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سامراجی طاقتوں نے کئی جمہوری حکومتوں کا جو پُرامن اور آئینی ذرائع سے برسرِاقتدار آئی تھیں مسلح بغاوت کے ذریعے تختہ اُلٹ دیا اور ہزاروں لاکھوں بے گناہ قتل ہوئے۔ کانگو میں لومبا کا قتل، گنی میں ڈاکٹر این کروما کی اور انڈونیشیا میں ڈاکٹر سوئیکارنو کی حکومت کی برطرفی، چلی میں فوجی بغاوت اور ہزاروں انسانوں کا قتل، جنوبی چین میں ۲۷ سال کی طویل خانہ جنگی، ویتنام میں ۱۱ سالہ خوں ریز جنگ اور سی آئی اے کی نوازش ہائے پیہم کے حالیہ انکشافات اس تلخ حقیقت کا ثبوت ہیں کہ جاگیردار طبقہ ہو یا سرمایہ دار طبقہ ہنسی خوشی اپنے اختیارات کسی دوسرے طبقے کو نہ پہلے سونپنے کے لیے تیار تھا نہ آج ہے۔ تشدد برائے تشدد سوشلسٹوں کا کبھی مسلک نہیں رہا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مخالف قوتوں نے ہمیشہ ان پر تشدد کیا ہے۔ البتہ وہ اہنسا کے قائل نہیں ہیں اور جب ان پر حملہ ہوتا ہے تو پھر انہیں بھی زور کا جواب زور سے دینا پڑتا ہے۔

جہاں تک کسی ادیب کی شخصی آزادی کا تعلق ہے ہم راشد صاحب کے موقف کی صدقِ دل سے تائید کرتے ہیں بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ شخصی آزادی ہر بشر کا خواہ وہ ادیب ہو یا غیر ادیب پیدائشی حق ہے اس لیے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور طبعی میلانات کو مکمل آزادی کی فضا ہی میں فروغ مل سکتا ہے۔ بندگی میں اس کی زندگی واقعی جوئے کم آب ہو جاتی ہے۔ راشد صاحب نے ''لا = انسان'' کے دیباچے میں کیا خوب کہا ہے کہ ''غلامی فرد کی قیمت اور قامت

دونوں کو کم کر دیتی ہے۔ اس قسم کی زندگی میں عشق اور فکر دونوں کوتاہ اور کم مایہ ہو کر رہ جاتے ہیں'
لیکن ان کا یہ الزام کہ ترقی پسند حضرات شاعر کو موضوع کے انتخاب میں اپنے انفرادی حق سے
دست بردار ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں بے بنیاد ہے۔ آخر ہندوستان، پاکستان کے کس ترقی پسند
نے کس شاعر یا فن کار کو یہ ہدایت دی ہے کہ تم اس قسم کا ادب تخلیق کرو اور اس قسم کا ادب تخلیق
مت کرو۔ البتہ تخلیقی انسان عجیب وغریب مخلوق ہے کہ وہ احکام کی بجا آوری کے دوران میں بھی
عظیم فن پارے تخلیق کر لیتا ہے۔ آخر فردوسی نے شاہنامہ محمود غزنوی کی فرمائش ہی پر تو لکھا تھا
اور مائیکل انجیلو اور رفیل نے پاپائے روم کے حکم ہی سے کلیسائے روم کی دیواری تصویریں بنائی
تھیں اور شیکسپیئر نے بیش تر ڈرامے ناٹک گھر کے مالک کی ہدایت ہی پر پیٹ کی خاطر لکھے تھے اور
ابھی کل کی بات ہے کہ اردو شعرا (جن میں غالب، میر اور سودا بھی شامل ہیں) طرحی مصرعوں پر
فرمائشی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم حکم، ہدایت یا نصیحتوں کے حق میں
ہیں بلکہ ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ ہر فن کار کو اپنے ''رویا'' ہی کی بات ماننی چاہیے۔ ہر شخص جانتا
ہے کہ کسی نے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، فارغ بخاری، عصمت چغتائی، کرشن چندر یا دوسرے
ترقی پسند ادیبوں سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اس قسم کی کہانی یا نظم یا غزل لکھو بلکہ سب نے اپنے اپنے
فلسفۂ زیست اور جمالیاتی ذوق کے مطابق اپنے ''رویا'' کی پیروی کی۔

ہمیں کامل یقین ہے کہ راشد صاحب شخصی آزادی کی پاسبانی بدستور کرتے رہیں گے اور
وطن سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی ابنائے وطن کے جبر و اختیار کی جدوجہد کو نظر انداز نہ کریں گے
اس لیے کہ اظہارِ ذات اور تحصیلِ ذات پوری بنی نوع انسان کا مشترکہ حق بھی ہے اور مسئلہ بھی۔

اگست ۱۹۷۵ء

بخیلی یا رزّاقی

حکومتِ سندھ نے صوبے کے ۲۶ بیمار اور ضعیف ادیبوں میں ۵۲ ہزار روپے تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ خبر جب اخباروں میں شائع ہوئی تو پہلی نظر میں یہی گمان گزرا کہ یہ امداد ماہانہ ہوگی مگر خبر کو غور سے پڑھا تو پتہ چلا کہ خزانۂ عامرہ کی یہ فیاضی نہ ماہانہ ہے نہ سالانہ بلکہ یوں ہی علی الحساب ہے۔ یہ تو نہ معلوم ہوسکا کہ فی کس کتنی رقم منظور ہوئی ہے اور آیا مستحقین کو ملی بھی ہے یا ہنوز وعدۂ فردا ہے البتہ اگر اوسط نکالا جائے تو امداد کی رقم فی کس دو ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔

ادیبوں اور فن کاروں کی مالی اعانت کی ریت ایوب خاں کے عہد میں پڑی تھی۔ اُن دنوں مستحقین یا ان کے پس ماندگان کو رقمیں ماہانہ وظیفے کی شکل میں دی جاتی تھیں۔ اُس ماہانہ وظیفے سے ان کی تمام ضرورتیں تو شاید پوری نہ ہوتی ہوں لیکن، ذہنی سکون کے لیے یہی کیا کم تھا کہ ہر مہینے ایک بندھی رقم ان کو مل جاتی تھی۔

جب تک حکومتِ سندھ نے یہ عطیہ منظور نہیں کیا تھا تو یہ عذر ہوسکتا تھا کہ آخر ادیبوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے لیکن اب تو حکومت نے اصولی طور پر یہ بات مان لی ہے کہ ادیبوں کی کفالت حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ البتہ ہمیں افسوس ہے کہ رقم کا تعین کرنے میں ادیبوں کی ضروریات کا کماحقہٗ لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں دو ہزار روپے تو معمولی دوا علاج کے لیے بھی کافی نہیں ہوں گے۔

ہم حکومتِ سندھ سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور اعلان شدہ

رقم کے علاوہ بیمار اور بوڑھے ادیبوں کے لیے مستقل طور پر ماہانہ وظیفہ مقرر کر دے تا کہ وہ اہل قلم جنہوں نے تمام عمر علم و ادب کی خدمت کی ہے اور دولت جمع کرنے کے بجائے اپنا ذہنی اثاثہ دوسروں میں تقسیم کیا ہے سکون سے زندگی بسر کر سکیں اور بے یقینی کی پریشانیوں سے آزاد ہو کر بقیہ عمر بھی اپنے ادبی مشاغل میں گزار دیں۔

ستمبر ۱۹۷۵ء

سال کا لمحہ

لمحے کے قد و قامت کو ناپنا بہت مشکل کام ہے۔ ادب کے سفر میں سال بھر کی مدت ایک لمحہ ہی تو ہوتی ہے پھر کون بتا سکتا ہے کہ اس پل میں ہمارے ادب نے کتنی مسافت طے کی اور لفظ و معنی کی تخلیقی کاوش میں کون کون سے نئے رجحان ابھرے۔ یوں بھی گزرا ہوا سال کوئی تاریخ ساز دور نہ تھا جس کی وجہ سے ہمارے طرزِ فکر و احساس یا مذاقِ سخن میں انقلاب آ گیا ہوتا بلکہ ایک لحاظ سے یہ لمحہ اُس بڑی ساعت کا تسلسل ہی تھا جب جنرل ایوب خاں نے شب خون مارا تھا۔ کیسی بھیانک تھی وہ رات جس کی پھر کبھی صبح نہ ہوئی یہاں تک کہ فوجی آمریت نے جبر و تشدد اور خوف و دہشت کی جو ریت ڈالی وہ آہستہ آہستہ ہمارا مزاج بن گئی اور ہم نے زہریلے دھوئیں میں سانس لینے کا ہنر سیکھ لیا۔ چنانچہ اوروں کا تو ذکر ہی کیا اُن دنوں ہر اہلِ قلم لکھنے سے پہلے یہی سوچتا تھا کہ میری تحریر سے قاضیٔ شہر تو خفا نہیں ہوگا، میری نوکری تو نہیں جائے گی، روزگار کے دروازے تو مجھ پر بند نہیں ہوں گے، مجھے قید کی سختیاں تو نہیں برداشت کرنا ہوں گی حالانکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ آخر سارتر، کامیو اور ژاں انوئی وغیرہ نے نازیوں کے نرغے میں رہ کر ہی نبرد آزمائی کی تھی اور فرانسیسی قوم کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

لیکن ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوا۔ بے شک گنتی کے چند ادیبوں نے قلم کا پرچم اونچا رکھا اور دل کی بات زبان پر لانے سے نہیں ڈرے۔ اس جرم کی پاداش میں ان پر سختیاں ہوئیں اور زبان بندی کے تمام حربے ان کے خلاف استعمال کیے گئے مگر انہیں اندھیرے کو اجالا نہ کہنا تھا

نہ کہا البتہ ادب کے ماتھے پر کالک ملنے والے دریادل ادیب بہت سے پیدا ہوگئے جو ایوب خاں کے غاصبانہ اقدام کو ''اکتوبر انقلاب'' کہتے تھے اور اس کے گیت گاتے تھے۔ اس بے پروبالی کی زندگی میں آرام وانعام کے مزے تو بہت تھے مگر ان ادبی طوطوں کو یہ سودا بہت مہنگا پڑا۔ وہ پھر کبھی اُڑ نہ سکے۔

ادیبوں کا تیسرا گروہ وہ تھا جس میں نہ احتجاج کا یارا تھا اور نہ شہ کی مصاحبت کی صلاحیت۔ انہوں نے گردوپیش کی تمازتوں سے بچنے کے لیے ''خالص ادب'' کی چھتری تان لی اور اپنے خیال میں تمام ذمّے داریوں سے آزاد ہوگئے۔ اس طرزِ عمل کے جواز میں انہوں نے یہ منطق پیش کی کہ ادیب اپنی ذات کے سوا کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ وہ شعر، افسانے، ڈرامے فقط اپنی تسکین یا اظہارِ ذات کے لیے لکھتا ہے نہ کہ دوسروں کے لیے۔ وہ کسی مسلک یا مکتبۂ فکر کا پابند نہیں ہوتا بلکہ خودمختار ہوتا ہے۔ عدم وابستگی اور لاتعلقی ان کا مسلک بن گئی۔ اس فلسفۂ زیست کو اگر کسی سہارے یا سند کی ضرورت تھی تو وہ مغرب کے سامراج نواز نقادوں نے فراہم کر دی کہ عدم وابستگی کے موجد وہی تھے۔ انہیں نے یہ شوشہ چھوڑا تھا تاکہ ادیبوں کا رشتہ عام لوگوں سے کٹ جائے۔

ایوّبی دور میں ہم جبر و استبداد کے اژدہے سے نہ لڑے بلکہ ہم نے فرار کی راہ اختیار کرکے اپنی جان بچالی۔ اس عافیت کوشی نے خود پرستی کو جنم دیا اور خود پرستی نے عدم وابستگی کو اور اب ہم حیران ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہمارے بے شمار اہلِ قلم زندگی سے بےزار کیوں ہیں۔ وہ انسان اور اس کے درد و کرب کو اتنی حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں، ان میں تنہائی، لاچاری اور بے بسی کا احساس اتنا شدید کیوں ہے، ان کو چھ کروڑ کی اس بھری پری بستی میں اپنا کوئی ہم زبان اور رازداں کیوں نظر نہیں آتا، ان کی نظمیں اور غزلیں بےمقصد و معنی شخصیت کا ماتم کیوں کرتی ہیں، ان کی کہانیوں کے کردار مثبت ہونے کے بجائے منفی اور مجہول کیوں ہوتے ہیں، ان کو غمِ زمانہ کیوں نہیں ستاتا، ان کو زنجیروں کی جھنکار پر غصہ کیوں نہیں آتا اور گولیوں کی آواز سن کر ان کا خون کیوں نہیں کھولتا۔ مگر ہماری حیرانی بے سبب ہے کیونکہ ہم وہی کاٹیں گے جو ہم نے بویا تھا۔ کانٹوں کی نوک پر پھول کیسے کھلیں گے؟

احساسِ بیگانگی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ادیبوں کا تعلق درمیانہ طبقے سے ہے اور وہ شہروں میں رہتے ہیں جہاں اِن دِنوں ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے اور ہر شخص فقط اپنے لیے

زندہ ہے۔ صدیوں پرانے سماجی رابطے ٹوٹتے جا رہے ہیں، شخصیتیں ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں، ہوسِ زر نے انسانی رشتوں کو اشیا کے رشتوں میں ڈھال دیا ہے۔ ادیب اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو اس خود غرض اور بے درد دنیا میں نہ کوئی چارہ ساز دکھائی دیتا ہے نہ غم گسار لہٰذا وہ اپنے ان حسّی تجربوں کا اظہار اپنے فن میں کرتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ملک کے سبھی ادیب احساسِ بیگانگی میں مبتلا ہیں بلکہ ہمارا مقصد اُس رجحان کے اصل محرکات کی نشان دہی کرنا تھا جو ان دنوں بہت عام ہے لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرنے کی پرانی روایت ہنوز زندہ ہے بلکہ خیر و شر کی جنگ میں خیر کے پاسباں ادیبوں کی آواز روز بروز زیادہ طاقت پکڑتی جاتی ہے۔ وہ ادب کو حبِ بشر کا کلمہ حق، حسنِ انسانی کا نغمہ زیست اور صدق و کذب کی پہچان سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں ہم اپنے ایک سال کے نہایت مختصر تجربے سے کہہ رہے ہیں۔ ہمیں جو مضامین، کہانیاں، نظمیں، غزلیں موصول ہوتی ہیں ممکن ہے کہ ان میں فنّی اعتبار سے کچا پن ہو، زبان و بیان کی خامیاں ہوں اور وہ ادب کا اعلیٰ معیار پیش نہ کرتی ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک صحت مند رجحان کی ترجمانی ضرور کرتی ہیں۔ ان میں سماجی تنقید بھی ہے، انسان سے محبت کا جذبہ بھی، اس کی زندگی کی سطح کو بلند کرنے کی آرزو بھی، اس کے درد و غم کی تڑپ بھی، اُنس و یگانگت کا اظہار بھی اور اپنی ذات اور فن کے منصب پر پورا پورا اعتماد بھی۔ وہ نہ اکیلے پن اور بے بسی کا رونا روتے ہیں اور نہ زندگی سے بے زار ہیں۔ وہ زندگی کو الیہ نہیں بلکہ بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں اور ان کی دلی خواہش یہی ہے کہ اپنی تخلیقات سے زندگی کو زیادہ خوش گوار اور بامعنی بنائیں۔ پاکستانی ادب اس رجحان کا برابر خیر مقدم کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا البتہ ہمیں اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ ہم اپنے قلمی معاونین کی کوئی خدمت نہ کر سکے مگر کریں تو کیوں کر۔ جو مالی حالت ملک کے دوسرے سنجیدہ ادبی رسالوں کی ہے وہ ہماری ہے۔ خواندگی کا اوسط اتنا کم، تعلیم کا معیار اتنا پست اور عام پڑھنے والوں کی قوتِ خرید اتنی محدود ہے کہ چھ کروڑ کی آبادی میں چھ ہزار خریدار بھی مشکل سے میسر آتے ہیں۔ صاحبِ ثروت حضرات کو سنجیدہ ادب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر کبھی بھولے بسرے کچھ پڑھنے کا شوق اٹھتا بھی ہے تو جنسی تلذذ، بھوت پریت، جرائم اور جاسوسی کے ادب سے بازار اٹے پڑے ہیں۔ وہ اپنی پیاس اسی سے بجھالیتے ہیں۔ کتب خانے جو ترقی یافتہ ملکوں میں ادبی تخلیقات کے سب سے بڑے سرپرست ہوتے ہیں ہمارے ملک میں برائے نام ہیں اور

جو ہیں ان کی ادب نوازی کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے جہاں سفارش اور رشوت کا زور ہو وہاں ادب کی سرپرستی کا کیا سوال۔ فی زمانہ کوئی اخبار یا رسالہ اشتہاروں کے بغیر نہیں چل سکتا مگر ادبی رسالوں کو اشتہار جس دوڑ دھوپ کے بعد ملتے ہیں اس کا تجربہ ہر رسالے کے منتظم کو ہے۔ ان حالات میں کسی ادبی پرچے کو باقاعدگی سے ماہ بہ ماہ نکالنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہماری اب تک کوشش یہی رہی ہے کہ ''پاکستانی ادب'' ہر ماہ قارئین کی خدمت میں پہنچتا رہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم غالباً اس پابندی کو برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ جب تک حالات بہتر نہیں ہوجاتے ہم ''پاکستانی ادب'' دو مہینے میں ایک بار شائع کریں گے یعنی سال میں چھ شمارے۔ البتہ سالانہ چندے کی رقم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور پرچے کی ضخامت میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس شمارے سے ہم نے پرچے کا سائز بھی بدل دیا ہے تاکہ قارئین کو فائل رکھنے میں آسانی ہو۔

دسمبر ۱۹۷۵ء۔ جنوری ۱۹۷۶ء

نئ نسل نمبر

نئ نسل ایک عالم گیر مسئلہ ہے اور کسی نہ کسی شکل میں قریب قریب ہر ملک میں موجود ہے۔ ہمارے ملک کی نئ نسل بھی حالات سے مطمئن نہیں ہے۔ اس بے اطمینانی کا اظہار ادبی تخلیقات میں بھی ہوتا رہتا ہے اور طلبا کی سرگرمیوں میں بھی۔ اسی صورتِ ماجرا کے پیشِ نظر ہم نے ادیبوں اور نئ نسل کے نمائندوں سے گزارش کی تھی کہ وہ نئ نسل کے فکری رجحانات اور ادبی تخلیقات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور نئ پرانی نسل کے درمیان جو تفاوت اور قدروں کا اختلاف نظر آتا ہے اس سے بھی بحث کی جائے اس لیے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں نوجوانوں کی پریشانیوں اور دشواریوں کے بارے میں سنجیدگی سے بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ناصحوں نے وعظ و پند میں تو کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور نہ نوجوانوں کی بے راہ روی پر لعن طعن کرنے سے کبھی گریز کیا۔ البتہ چارہ سازی اور غم گساری کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔

ہمیں افسوس ہے کہ تین چار ماہ کی مسلسل کوشش کے باوجود ہم کوئی یادگار دستاویز نہیں پیش کر سکے۔ پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ ہمارے نوجوانوں اور ادیبوں نے نئ نسل کے مسائل کے قریب قریب سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ نئ نسل نمبر سے نئ نسل کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ البتہ اس نمبر کے مندرجات سے اگر قارئین کو نئ نسل کے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملی تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری کوشش کامیاب ہوگئی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے پڑھنے والے ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ فرمائیں گے۔

مئی۔ جون۔ جولائی۔ ۱۹۷۶ء

ابتدائیہ

امریکی ادب کا نمائندہ انتخاب پیش کرنا قریب قریب محال ہے کیونکہ گزشتہ دو سو سال کے عرصے میں وہاں لاکھوں ناول، نظمیں، ڈرامے، افسانے اور مضامین شائع ہوئے ہیں اور کوئی فرد یا ادارہ خواہ وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے ان تمام ادبی فن پاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ امریکہ کی جنگِ آزادی اتنا بڑا تاریخی کارنامہ ہے اور ۱۸ ویں صدی کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کے خلاف امریکی وطن پرستوں کی کامیاب جدوجہد کے اثرات اتنے دُور رس ثابت ہوئے ہیں کہ ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یوں بھی آج جبکہ امریکہ نے برطانیہ کی جگہ لے لی ہے اور سب سے قوی سامراجی طاقت بن گیا ہے، امریکی معاشرے کے ماضی اور حال کا مطالعہ ادب کے حوالے سے بہت ضروری ہے۔ امریکی ادب نمبر کا محرک یہی جذبہ تھا۔

ہماری خواہش تھی کہ امریکی ادب نمبر امریکی معاشرے کے بہ عہد ارتقاء کا مرقع ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کی تنگی اور لٹریچر کی کمیابی کی وجہ سے ہماری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ امریکی زندگی کے اہم پہلوؤں کی کم از کم ایک دھندلی تصویر قارئین کی خدمت میں پیش کردیں۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ کئی نہایت اہم ادبی تخلیقات تاخیر سے وصول ہونے کے باعث شامل نہیں کی جاسکیں۔ وہ آئندہ اشاعت میں ضرور شائع ہوں گی۔

نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء

"پاکستانی ادب" کانفرنس

پاکستانی ادب نے پچھلے دو سال میں اور کچھ نہ سہی تو حقیقتوں کو ترقی پسندانہ زاویے سے دیکھنے کی دعوت ضرور دی ہے۔ قلمی معاونین اور قارئین کا ایک مختصر سا حلقہ بھی بنا ہے جو ادب اور زندگی کی اُنھیں قدروں کو عزیز رکھتا ہے جن کی ترویج پاکستانی ادب کا مسلک ہے۔ یوں تو ہم کو اپنے کرم فرماؤں کے خطوں سے ان کے خیالات کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا رہتا ہے لیکن ادیبوں، خریداروں اور پاکستانی ادب کے کارکنوں کے مابین ابھی تک ذاتی رابطے کی بہت کم نوبت آئی ہے۔ حالانکہ ذاتی ملاقاتوں کے دوران میں کھل کر بحث ہوسکتی ہے، مسائل کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور ان کو حل کرنے کی تدبیروں پر غور کیا جاسکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہم نے ادب اور ثقافت کے تمام مسائل حل کر لیے ہیں یا ملک میں جو غیر ترقی پسندانہ رجحانات گردش کر رہے ہیں ان کے بارے میں ہمارے ذہن صاف ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود ترقی پسند ادب کی اِن دِنوں جو تعبیریں ہورہی ہیں ان کی وجہ سے ایک زندہ حقیقت دیوانے کا خواب بن گئی ہے اور عام قاری حیران و ششدر ہے کہ کس کو سچا مانے اور کس کی بات کو رد کرے۔

یہ غور طلب مسائل ہیں جن پر قلم کار اور قاری دونوں کو غور کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہماری یہ تجویز ہے کہ پہلے پاکستانی ادب کا ایک ترقی پسند ادب نمبر شائع کیا جائے تاکہ مسائل کی نوعیت کھل کر سامنے آجائے تب پاکستانی ادب کی ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں ادیبوں اور قاریوں دونوں کو اظہارِ خیال کا پورا پورا موقع ملے۔ بحث و مباحثہ کے بعد ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں

اور پاکستان ادب آئندہ کے لئے اپنی راہ متعین کرنے میں اپنے کرم فرماؤں کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوسکے۔ ہمیں یقین ہے کہ کانفرنس کی اس تجویز کو آپ پسند فرمائیں گے اور اپنی رائے سے ہمیں جلد مطلع کریں گے۔ کانفرنس کی مزید تفصیلات ترقی پسند ادب نمبر میں ملاحظہ فرمایئے۔

جنوری۔فروری ۱۹۷۷ء

جمہوریت، کا نذرانہ

جمہوریت فصلی بخار نہیں جو چوتھے پانچویں سال قوم پر طاری ہو اور ہفتے دو ہفتے کے بعد اُتر جائے۔ جمہوریت تو ایک مسلکِ حیات ہے، جمہور کا اقرارِ خود شناسی ہے، معاشرتی رابطہ واتحاد کی سعیِ پیہم ہے اور بشر کے انسانی حقوق کی سچائیوں کا اعلان ہے لیکن ہم ایشیا والوں کے طور طریقے نرالے ہیں۔ ہم زبان سے تو جمہور اور جمہوریت کی قسم کھاتے رہتے ہیں مگر ہماری روزمرّہ کی زندگی میں جمہوریت کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ ہم جمہوریت، کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو امرا کی حویلیوں میں بوڑھی بیواؤں کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی بڑی بی ایک گوشے میں چارپائی پر پڑی رہو اور جو کچھ رُوکھا سُوکھا مل جائے اس کو غنیمت جانو۔ البتہ جب الیکشن کے دن آتے ہیں تو ان محترمہ کو رنگ برنگے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور ڈھول، تاشوں اور لاؤڈ اسپیکروں کے جلو میں ان کا جلوس بڑے تزک واحتشام سے نکالا جاتا ہے اور ہر اُس بات پر سر پھٹول ہوتی ہے کہ ان بڑی بی کا حقیقی پرستار، سچا شیدائی کون ہے؟

مارچ کے الیکشن میں بھی یہی سب ہوا۔ اس ہنگامہ آرائی کو بیداریِ جمہور کہیے یا کرسیِ اقتدار کی جنگ، اس سے متاثر ملک کا ہر طبقہ، ہر گروہ ضرور ہوا حتیٰ کہ بے چارہ پاکستانی ادب بھی جو نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔ ہم نے پچھلی اشاعت میں اعلان کیا تھا کہ آئندہ شمارہ ترقی پسند ادب نمبر ہوگا اور اس کے بعد پاکستانی ادب کے قلمی معاونین اور قارئین کی ایک کانفرنس کی جائے مگر یہ سارے منصوبے الیکشن کی سرگرمیوں کے نذر ہو گئے اور اب حالات ایسی صورت اختیار

کر رہے جا رہے ہیں کہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ زندگی معمول پر کب آئے گی لہٰذا ہم اپنے تمام کرم فرماؤں سے معذرت خواہ ہیں کہ ہم ایفائے عہد نہ کر سکے مگر ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ترقی پسند ادب نمبر کی تیاریاں بدستور جاری ہیں اور جونہی حالات معمول پر آئے ہم یہ اہم دستاویز آپ کی خدمت میں بلا تاخیر پیش کریں گے۔

مارچ۔اپریل ۱۹۷۷ء

کرشن چندر کی وفات

کرشن چندر کا انتقال ہوگیا۔ وہی کرشن چندر جنہوں نے عمر بھر ادب کے ایوانوں کو دردمندی کے سدا بہار پھولوں سے مہکایا۔ مانا کہ جس شخص نے انسان سے محبت کی وہ کبھی نہیں مرتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کرشن چندر کی لازوال تحریروں نے ان کو امر بنا دیا ہے مگر زندگی بہر حال زندگی ہے اور موت کتنی ہی عظیم ہو زندگی کا بدل نہیں ہوسکتی۔ زمانہ اب دوسرا کرشن چندر نہیں پیدا کر سکے گا۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں لاہور میں ہوا اور جب تک جیسے ہیر رانجھا کے دیس کو یاد کر کے تڑپتے رہے۔ انہوں نے انشایئے، افسانے، ناول، رپورتاژ سبھی کچھ لکھا اور اس کثرت سے کہ چالیس برس میں ان کی تقریباً چالیس کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے باوجود ان کا قلم کبھی نہیں تھکا بلکہ حسّی تجربوں اور حق کے مشاہدوں کا ایک سیل رواں تھا جس کی رنگ برنگی لہریں سدا اونچی ہی اٹھتی گئیں۔ نہ حب بشر کی حرارت اتری نہ تخیل کی رومانی پرواز میں کوتاہی آئی اور نہ انداز بیان کی نغمگی کم ہوئی۔ کرشن کی سی گاتی گنگناتی نثر اب کون لکھے گا؟

کرشن چندر دکھی انسانیت کے افسانہ خواں تھے۔ وہ تمام عمر غم زمانہ کا زہر گھول گھول کر پیتے رہے مگر غم زدوں کو سوم رس پلاتے رہے۔ انہوں نے اپنے جذبہ وفن کا رشتہ ہمیشہ ان جفاکشوں سے جوڑا جو سب کے ان داتا ہیں۔ جن کے خون کی توانائی سے کھیت لہلہاتے ہیں اور سرسوں اور کپاس کے پھول کھلتے ہیں اور زندگی کی خوشبوئیں رقص کرتی ہیں اور مُردہ مشینوں میں

جان پڑتی ہے اور کوچہ و بازار جگمگاتے ہیں۔

کرشن چندر زندگی بھر حسن کی قدروں کو سینے سے لگائے رہے۔ وہ مناظرِ قدرت کے حسن کے بھی اتنے ہی گرویدہ تھے جتنے حسنِ ذات وصفات کے۔ ان کا فن اُس سماجی نظام کے خلاف صدائے احتجاج تھا جس کا دارومدار ہی حسن کی شخصیت اور شخصیت کے حسن کی پامالی پر ہے، جو انسان کی تخلیقی قوتوں کو حصولِ منفعت کا وسیلہ بناتا ہے اور بشر سے اس کی بشریت تک چھین لیتا ہے۔ بھلا جس معاشرے میں ہر شخص مویشیوں کی مانند دن رات پیٹ کی فکر میں مبتلا ہو اور جہالت، تعصب اور توہم کا گھپ اندھیرا چھایا ہو اور انسان کے وقارِ ذات کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہوں وہاں حسن کو فروغ کیسے مل سکتا ہے لیکن کرشن چندر انسانوں کے مستقبل سے مایوس اور دل شکستہ کبھی نہیں ہوئے۔ ان کی حقیقت پسند نظروں نے اُس حیات آفریں قوت کو پہچان لیا تھا جو حسن کی مظہر بھی ہے اور فروغِ حسن کی ضامن بھی۔ جو کبھی ماؤں کی مامتا اور معصوم بچوں کی مسکراہٹ بن جاتی ہے اور کبھی جوانوں کے جلال اور بوڑھوں کے عزم اور بیواؤں کی کراہ اور محنت کاروں کے شرابور بدن کے پسینے اور ادیبوں کے قلم کے روپ میں نمودار ہوتی ہے۔ کرشن چندر اسی قلم سے حسن کی مدح اور حسن فروشوں کے ظلم و استبداد کی مذمت لکھتے رہے۔

کرشن چندر صحیح معنی میں مردِ آفاقی تھے۔ ان کا فن افق تا افق پھیلا ہوا ہے۔ وہ انسان کو ایک اکائی سمجھتے تھے اور اس اکائی کو رنگ و نسل، مذہب اور وطن کے خانوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے بلکہ ان کی دلی آرزو تھی کہ انسان جہاں بھی رہے وہاں امن ہو، آزادی ہو، آسودگی اور انصاف ہو اور اُن قوتوں کا خاتمہ ہو جائے جو زندگی کے درپے ہیں۔

کرشن چندر اردو کے شاید واحد ادیب تھے جنہوں نے اپنی زندگی افسانہ نویسی کے سہارے بسر کی۔ ادب میں ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ وہ چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے اقتدار کی دہلیز پر کبھی سر نہیں جھکایا اور نہ سرکار دربار میں جا کر اپنے ضمیر کا سودا کیا۔ انہوں نے اپنی وفاداریوں پر بھی کبھی پردہ نہیں ڈالا بلکہ ہمیشہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ رہے اور اپنی تحریروں میں ادب کی ترقی پسند قدروں ہی کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ نئی نسل کے ادیب جو کرشن چندر سے محبت کرتے ہیں ان کی ادبی روایتوں میں نئی روح پھونکیں گے اور نیا رنگ بھریں گے۔

مارچ۔اپریل ۱۹۷۷ء

اپریل سے اکتوبر تک

بہت دنوں کے بعد "پاکستانی ادب" دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار روایتی قسم کی معذرتیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ مالی حالات اجازت نہیں دیتے، اشتہارات نہیں ملتے، لوگ تعاون نہیں کرتے، قاری نہیں ہیں، ادبی ذوق گھٹتا جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اپنی جگہ پر موجود ہیں مگر آج جب ہم پچھلے تین برسوں کے تمام تجربوں کو یک جا کرتے ہیں تو سب سے بڑا اور تکلیف دہ مسئلہ "تخلیقات" کا ہے۔ خوش قسمتی سے پاکستانی ادب کو بڑے باکمال اور اچھے لکھنے والے میسر آئے اور کئی نئے اور ہنرمند ادیب ان صفحات پر ابھرے۔ اس کے باوجود تحریروں کے سلسلے میں ہمیں پریشانی ہی رہی۔ غربت اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کا بیش قیمت ادبی خزانہ ناسازگار حالات کی پیداوار ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمدہ ادب پیدا کرنے کے لیے ادیب کو خدانخواستہ بھوکا مارا جائے۔ ہمارا سنگین مسئلہ اُس تحریک کا فقدان ہے جو بڑے ادیب پیدا کرتی ہے۔ صحافیوں اور ادیبوں نے کیا کیا بے ایمانیاں کی ہیں، سر ٹکا کر آرام سے پیر پھیلانے کے لیے کیسے جھوٹ بولے ہیں اور لوگوں کو کتنا دھوکا دیا ہے، وہ اب کسی سے چھپا نہیں ہے۔ اب نہ تو پاکستانی اخباروں پر کوئی بھروسہ کرتا ہے نہ رسالوں پر۔ ٹی وی، ریڈیو تو رہتے ہی چار دیواری میں ہیں۔ ادیب اور صحافی کی کوئی عزت رہی نہ اہمیت۔

دراصل اعلیٰ فنی اور ادبی قدروں کا منبع شاندار، بے لوث اور جمہوریت کے شایانِ شان سیاسی تحریکیں ہوتی ہیں۔ کسی معاشرے میں جہاں سیاسی سرگرمیوں، خیالات اور اظہار پر پابندی

ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ سیاسی آزادی کے فقدان سے ہمارا مطلب بائیں بازو کی مخلص سیاسی تحریک سے ہے کیونکہ رجعت پرست اور استحصالی قوتوں کو ہمیشہ ہی کھلی چھٹی ملی ہے۔ ذہنوں کو شکنجے میں کسنے کا عمل اتنی خوبصورتی سے نبھایا جاتا ہے کہ عام آدمی کو اپنے خلاف اس گھناؤنی سازش کا احساس ہی نہیں ہو پاتا اور ذہنی اپج گھٹتی ہی جاتی ہے۔ ترقی پسند قدریں سکڑتے سکڑتے قبر کا کتبہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جمہوری اور ترقی پسند سیاسی تحریکیں شعور میں پختگی پیدا کرتی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا، سوچنے سمجھنے کا جواز مہیا کرتی ہیں، رد اور قبول کی صلاحیت بخشتی ہیں۔ اخبار اور رسالے ان مقاصد کو پورا کرنے میں اہم اور فیصلہ کن رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں بھی سماجی بے انصافیوں پر کبھی کبھی عام آدمی کے ردِّعمل کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ آدمی کا وقار اب بھی قائم ہے اور یہ خواہش شدت اختیار کر لیتی ہے کہ کاش اسے لکھنے والوں کی محبت، ہمدردی اور اعتماد حاصل ہو۔

چند کہانیاں، کچھ نظمیں غزلیں، ادبی مضامین اور تبصرے ملا کر چھاپ دینا اب بہت ادھورا سا معلوم ہونے لگا ہے۔ آج جب کہ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں ایک ایسے پرچے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے جو ایمان داری سے اپنے پڑھنے والوں کو سوچنے سمجھنے کی ڈگر پر لگا سکے۔ جس میں تیز، تیکھی اور سچی باتیں دیکھنے اور لکھنے والے جمع ہو سکیں۔ ایسی باتیں جن کا تعلق روزمرہ کی سماجی، سیاسی اور فکری زندگی سے ہو، جو ایک ترقی پسند ذہنی رویہ بنا سکے، جس کی مدد سے اس کے قاری سیاسی تحریکوں کے رخ کو پہچان سکیں اور اس بات کا ادراک کر سکیں کہ حالات کا رُخ ان کی ذہنی، سیاسی اور سماجی بہتری کے لیے ہے کہ نہیں۔ اب ادبی پرچوں کو وقت کے دھارے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس بہت تیز ریلے میں اگر ہم اپنی ایک صف بنا کر سَر اُونچا رکھ سکیں تو یہ بھی غنیمت ہے۔ پاکستانی ادب کی موجودہ صورت سے ہم مطمئن نہیں ہیں۔ ہم اس میں زیادہ وسعت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے آئندہ آپ پاکستانی ادب میں تبدیلیاں پائیں۔ اس سلسلے میں ہم آپ کی رائے کو بہت اہمیت دیں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ پڑھنے والے کیا چاہتے ہیں نیز لکھنے والے کس قدر تعاون کریں گے اور ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے کن موضوعات پر لکھنا پسند کریں گے اور کون سی تبدیلیاں مستقبل میں بہتر اور خوشگوار ثابت ہوں گی۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء

سید سبط حسن کا شمار پاکستان کے ان معدودے چند دانشوروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ملک کی اُس عمومی ذہنی فضا کو جو فکری جمود، ضعیف الاعتقادی، رجعت پسندی اور غیر سائنسی رویوں سے عبارت رہی ہے، بدلنے اور اس کی جگہ عقلیت اور روشن خیالی کو عام کرنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔ سبط حسن تقلید کے بجائے تنقید، اور جمود کے بجائے ارتقاء اور اجتہاد کے علمبردار تھے۔ ان رویوں کو معاشرے میں فروغ دینے کے لئے انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو اپنے فکر انگیز مضامین و مباحث کے علاوہ اپنے سادہ مگر پراثر اندازِ تحریر کی بنا پر غیر معمولی مقبولیت کی حامل قرار پائیں۔ سبط حسن نے عقل و خرد کی جو برق فروزاں کی اُس کی لو آج بھی زندہ ہے اور ان کی صدائے ہوش ذہن و دل کی محرابوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔

سبط حسن نے مبسوط کتابوں کی تصنیف و تالیف کی طرف آنے سے پہلے ایک طویل عرصہ صحافت کے خارزار میں بھی آبلہ پائی کی۔ وہ صحافیوں کے اُس بے لوث گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک صحافت ایک سماجی مشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ سبط حسن کے نزدیک صحافت کا مقصد اپنے معاشرے کے عیوب کی پردہ داری نہیں بلکہ اُن کی اصلاح تھا۔ ان کی صحافت ذاتی منفعتوں کے حصول کا وسیلہ نہیں بلکہ معاشرتی نشوونما کا ذریعہ تھی۔ وہ اپنے ملک کے باشندوں کے سماجی شعور کو مہمیز کرنے کے لئے کمربستہ رہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو عامتہ الناس کی امانت سمجھا اور اس سے اخبار بیچنے اور بکوانے کی نفیری کا کام نہیں لیا۔ ان کی صحافت سلانے کی دوا نہیں، جگانے کی نوا تھی۔

سبط حسن قیامِ پاکستان سے قبل، اور اس کے بعد متعدد اخبارات و جرائد سے وابستہ رہے یا مستقل قلمکار کے طور پر ان میں لکھتے رہے۔ انہوں نے تقسیم سے قبل پیام، نیشنل ہیرالڈ، قومی جنگ، اور پیپلز وار میں کام کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، امروز، سول اینڈ ملٹری گزٹ، حریت، ڈان، مسلم، ویوپوائنٹ وغیرہ میں ان کی تحریریں جگہ پاتی رہیں۔ مگر سبط حسن کی صحافیانہ زندگی کا نقطۂ عروج ان کا لیل و نہار کی ادارت کا زمانہ ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک اور پھر ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۱ء تک اس رسالے کے ایڈیٹر رہے۔ پاکستان کے تہذیبی اور سیاسی مسائل: لیل و نہار اور ۱۹۷۳ء میں کراچی سے نکلنے والے ادبی پرچے پاکستانی ادب میں شامل ان کے اداریوں پر مشتمل ہے۔ معروضیت پسندی، عوام دوستی، جمہوریت اور اقتصادی انصاف کی پرزور وکالت، اور انسانی حقوق کی پاسداری ۔۔۔ یہ سب رویے ان اداریوں میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اداریے صحیح فکر کے مظہر تو ہیں ہی، ان کی ایک بڑی تاریخی اہمیت بھی ہے اور وہ یہ کہ ان اداریوں میں ان ادوار کی پاکستانی سیاست و معاشرت کی واضح تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے جن ادوار میں یہ اداریے لکھے گئے۔ پاکستانی سیاست و تاریخ، اور صحافت کے طالب علموں کے لئے یہ اداریے معلومات کا ایک بیش بہا مخزن ثابت ہوں گے۔ احمد سلیم صاحب نے ان اداریوں کو بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد